

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شفافہ تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

جنوری 2012



میموسکینڈل..... کیا رنگ لائے گا؟

بات چل نکلی ہے..... اب دیکھیں کہاں تک پہنچے؟

PDFBOOKSFREE.PK



القرآن

بسم الله الرحمن الرحيم

سورة المائدہ

اور کیسے منصف بناتے ہیں آپ کو حالانکہ ان کے پاس تورات ہے اس میں اللہ کا حکم ہے۔ پھر وہ منہ پھیرتے ہیں (اس سے) اس کے بعد بھی اور نہیں ہیں وہ ایماندار۔ بے شک اُناری ہم نے تورات اس میں ہدایت اور نور ہے۔ حکم دیتے رہے اس کے مطابق انبیاء جو (ہمارے) فرماں بردار تھے یہودیوں کو اور (اس کے مطابق حکم دیتے رہے) اللہ والے اور علماء اس واسطے کہ محافظ ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب کے اور وہ تھے اس پر گواہ۔ پس نہ ڈرا کرو لوگوں سے اور ڈرا کرو مجھ سے اور نہ بچا کرو میری آیتوں کو ٹھوڑی سی قیمت سے اور جو فیصلہ نہ کرے اس (کتاب) کے مطابق جسے نازل فرمایا اللہ نے تو وہی لوگ کافر ہیں اور ہم نے لکھ دیا تھا یہود کے لیے تورات میں (یہ حکم) کہ جان کے بدلے جان۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ ناک کے بدلے ناک۔ کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے لیے قصاص تو جو شخص معاف کر دے بدلہ تو معافی کفارہ بن جائے گی اس کے گناہوں کا اور جو فیصلہ نہ کرے اس (کتاب) کے مطابق جسے اُنارا اللہ نے تو وہی لوگ ظالم ہیں اور ہم نے پیچھے بھیجا ان کے نقش قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو تصدیق کرنے والا جو اس کے سامنے تھا یعنی تورات اور ہم نے دی اسے انجیل اس میں ہدایت اور نور تھا اور تصدیق کرنے والی تھی جو اس سے پہلے تھا یعنی تورات اور (یہ انجیل) ہدایت اور نصیحت تھی پرہیزگاروں کے لیے۔

(آیت 43 تا 46) (ترجمہ بحوالہ ضیاء القرآن)

الحديث

بسم الله الرحمن الرحيم

نماز میں کلام کا ممنوع ہونا ثابت ہے

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کو سلام کیا کرتے تھے حالانکہ آپ ﷺ نماز میں ہوتے تھے اور آپ ﷺ ہمیں جواب بھی دے دیا کرتے تھے۔ پھر جب ہم نجاشی (بادشاہ حبش) کے پاس سے لوٹ کر آئے تو ہم نے آپ ﷺ کو نماز میں سلام کیا، تو آپ ﷺ نے ہمیں جواب نہ دیا اور نماز مکمل کرنے کے بعد فرمایا کہ نماز میں اللہ کے ساتھ مشغولی ہوتی ہے اس لیے نماز میں اور کسی طرف مشغول نہ ہونا چاہیے۔

سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نماز میں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں پہلے کلام کیا کرتے تھے۔ ہم میں سے کوئی شخص اپنی ضرورت اپنے پاس والے سے کہہ دیا کرتا تھا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی (ترجمہ) ”اپنی نمازوں کی حفاظت کرو اور خاص کر درمیانی نماز کی اور اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔“ (سورہ بقرہ: 238) پس ہمیں نماز میں سکوت کا حکم دے دیا گیا۔

(بحوالہ: مختصر صحیح بخاری)

اس شمارے میں

2	القرآن	ضیاء القرآن	قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!
3	الحديث	ادارہ	نماز میں کلام کا ممنوع ہونا ثابت ہے
14	دستک	کامران امجد خان	صدر زرداری کی واپسی.....؟
37	دست شناسی اور ہمارے ہاتھ	زابد گوگی	ہمارے ہاتھوں کی لکیریں زندگی کے اتار چڑھاؤ کی آئینہ دار ہیں اور بہت سی پیش گوئیاں کرتی رہتی ہیں!
49	خود جلیں ویدہ اغیار کو پینا کرویں	فلندر حسین	ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں چٹنے کیلئے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی درکار ہوتی ہے!
65	کرپشن اور لوٹ مار ہمارا کلچر ٹھہرا	عارف محمود اہل	معاشرے میں بڑھتی ہوئی اخلاقی برائیوں کے حوالے سے خصوصی رپورٹ!
69	کھجلی	آصف فرخی	ایک شخص کی کھال سے ”رغم خوردہ“ انسانوں سے خاص دلچسپی تھی!
79	بدوعا سے بچو	پروفیسر محمد ظریف	عبرت انگیز واقعات، جب ظالموں نے خدا کے قہر کو آزمایا!
82	برادون	محمد الیاس	ایک لایہ کلام برادون کے سامنے اپنی پرستش سے ملنے چلا تھا!
91	ذات برادری	پروین ملک	ذات برادری کو مقدم رکھنے والوں کا ماترا..... ایک دن انکی عزت پر ضرب پڑی تھی!
94	انتظار	عرفان جاوید	باپ کی واپسی کے منتظر ایک بیٹے کا المیہ..... ایک رات نے اس کی تقدیر بدل دی!

جویریہ کامران

ہمسردیوں کے موسم میں ”مچھلی“ سے

161

سیارہ کچن کارز

لطف اندوز ہونے کیلئے نئی اور ذائقہ دار ڈشز
☆ پائن اپل پین کیک اور کوکلوٹ کافی کی آسان تراکیب
☆ چکن و ٹیگٹیل سوس اور چکن پرائڈا رول

17

بات چل نکلی ہے.....
اب دیکھیں کہاں تک پہنچے؟

سیارہ رپورٹ

میو کیٹل.....
کیا رنگ لائے گا؟

97	پانسہ اور گھسہ	نواز خان	جرم سزا پر مبنی خصوصی کہانی جس کیلئے آپ ہر شہادت سے انتظار کرتے ہیں!
135	کالا پانی	محمد عبداللہ عاطر	ایک طالب علم کا قصہ جسے حصول علم کیلئے ”کالے پانی“ کی سزا بھگتنا پڑی!
145	سوچ کے جزیرے	شش شروانی	غور کرنے والوں کیلئے فکر و عمل کی باتیں..... جن پر عمل سے معاشرہ بدل سکتا ہے!
151	نسخہ قتل	نوریہ ظہیر	لاٹچ اور ہوس میں گرفتار ایک جتنی کا قصہ..... جس نے مفاد کی خاطر شوق چچا کے قتل کا سفاک منصوبہ بنایا
165	چہرہ اور آپ کی صحت	فاطمہ تیمم	چہرے پر نظر آنیوالی علامات جنہیں نظر انداز کرنا خطرناک ہو سکتا ہے!
170	اپنا ہی لگا پردیس میں	اقبال تسم	دیباغیہ میں ”خاص مہمانوں“ سے ملاقات کا دلچسپ احوال!
175	بزم شاعری	ادارہ	بازوق قارئین کے کلام و انتخاب پر مبنی مقبول ترین سلسلہ!
181	مہذب طریقہ	محمد سلیم اختر	فرانس کے طبقہ اشرافیہ کے ایک معزز رکن کا قصہ..... مغرب سے درآمد شدہ شاہکار!
189	ڈاچی	ان۔ اشک	ایک محنت کش کسان جو بیٹی کی خواہش پوری کرنے چلا تھا!
197	بنت اسقف	برینڈن رسل	ایک بری جمال ہنس کش حیثیت کی داستان..... وہ ایک پادری کی بیٹی تھی اور اس نے شادی کیلئے ایک شخص منتخب کر لیا تھا!
209	زرناب	عاصمہ تمنا چودھری	ایک دو شیزہ کی کہانی..... جس کی زندگی ایک سوالیہ نشان تھی!

123

موت کا طواف

دو دوستوں کا ماجرا.....
موت خونی درندے کے روپ میں
ان کا طواف کر رہی تھی!
بشیر احمد بھٹی

129

نیکینا لوجی کی دنیا

☆ 3G: میلوں پار لوگوں سے ریل ٹائم کیونکی کیشن،
ہائی سپیڈ وائر لیس انٹرنیٹ اور موبائل ٹی وی جیسی
سہولیات اسی نیکینا لوجی کے باعث مل رہی ہیں!
☆ آئی فون 5 جلد منظر عام پر آنے والا ہے! فیضان خان

اظہار خیال

میمو گیت

میں خوابیں بھی تھیں۔ شجاعت، مہمان نوازی اور
ایقانے عہد ان میں موجود تھا۔ کیا یہ تینوں خاصیتیں
ہم میں موجود ہیں؟ اس روایتی بے حسی کو ختم کرنے
اور محبت و انصاف کو پروان چڑھانے کے لیے ہر
شخص کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے خواہ وہ کسی سطح پر
ہو اور اس کے لیے یہی کہوں گا۔

”آپ آگ بجھانے والوں میں سے نہیں، اس
چڑیا کی طرح کہ جب اللہ کے ایک بندے کو جلانے
کے لیے آگ جلائی گئی تو وہ اپنی چونچ سے پانی کا
ایک ایک قطرہ اس لیے لاتی کہ وہ آگ تو نہیں بجھا
سکتی تھی مگر اللہ کو یہ تو بتا سکتی تھی کہ میں جلانے والوں
میں سے نہیں، بجھانے والوں میں سے ہوں۔“
(رانا محمد شاہد، پورے والا)

عمران خان کے مشاہدات

محترم کامران امجد صاحب! نومبر کا شمار بہت
ہی خوبصورتیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ حصہ خطوط
میں ڈینگی چمچر کے بارے میں تبصرے پڑھ کر خیال
آیا کہ اب تو ڈینگی چمچر سردیوں میں لمبی نیند سو
جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام مقتدر
سیاستدان بھی اور متعلقہ عملہ بھی۔ حتیٰ کہ اگلے برس
جب لاروے سے دوبارہ ڈینگی چمچروں کی یلغار ہو
گی اور بہت سے لوگ مر جائیں گے تو نئے سرے
سے سب لوگ جاگ جائیں گے۔

عمران خان کے روحانی تجربات پر مشتمل
مضمون انہی کی کتاب کے اقتباسات پر مشتمل تھا
لیکن مضمون پڑھ کر خیال آیا کہ یہ ان کے تجربات
سے زیادہ دوسروں کے تجربات اور عمران خان کے
مشاہدات ہیں ورنہ خود ان کے بیان کے مطابق وہ تو

عظیم دانشور جناب اشفاق احمد کے سرورق اور
ان کی باتوں سے سجاد سبر کا شمار موصول ہوا۔ آج
کل تنازعہ خط میمو گیت کا بڑا چچا ہے۔ کامران
صاحب کے ادارے کا موضوع بھی یہی تھا۔ ممکن
ہے آنے والے حالات میں یہ تنازعہ خط حکومت کو
لے ڈوبے اور اگر واقعی یہ خط حقیقت پر مبنی تھا تو پھر
اس خط کے کرداروں پر غداری کا مقدمہ چلایا جانا
چاہیے۔ عارف محمود اہل نے افغانستان کے قومی
کھیل کے حوالے سے بیش قیمت معلومات فراہم
کیں۔ افغان تو ویسے بھی جنگجو قوم ہیں تو پھر ان کا
قومی کھیل بھی ایسا کیوں نہ ہوتا۔ قلندر حسین سید اچھا
انتخاب پیش کر رہے ہیں۔ انجم انصاری ”آؤ لڑیں“
مختصر مگر انتہائی دلچسپ تحریر تھی۔ انجم صاحب نے میاں
بیوی کی روایتی لڑائی کو بڑے مزاحیہ مگر حقیقت
پسندانہ انداز میں پیش کیا۔ ”راہِ داہر کی ماں“ میں
پروفیسر جلیل صاحب نے تاریخ کے گم نام گوشوں سے
پردہ اٹھایا۔ باقی لکھنے والوں نے بھی اچھے افسانے و
مضامین تحریر کئے۔ قتل و غارت، ڈاکے، بینک لوٹنے
کی وارداتیں، پسند کی شادی نہ ہونے پر خودکشی،
شوہر کے ہاتھوں بیوی اور بیوی کے ہاتھوں شوہر کا
قتل، ڈاکٹروں کی روایتی بے حسی اور غریب اور عام
لوگوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک ہمارے
معاشرتی زوال کی نشانیاں ہیں۔ معاشرتی بے حسی
اپنے عروج پر ہے۔ ایک تجزیہ نگار نے ٹی وی پر
یہاں تک کہہ دیا کہ آج ہم زمانہ جاہلیت سے بھی
گئے گزرے وقت میں زندہ ہیں۔ اس دور کے لوگوں

مریض ہوں۔ پچھلے دنوں بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا۔ عجب پریشانی کا عالم تھا۔ اب بستر پر ہوں۔

دنیا کی محفلوں سے اکٹا گیا ہوں یا رب
کیا شوق انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
میرے ایک دوست ممتاز عاصم صاحب تھے۔

بڑی جہاندیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے تو ایڈووکیٹ تھے لیکن ادب میں بھی ان کا نام تھا۔ گزشتہ ہفتہ وہ بھلے چنگے ملتان ایک مشاعرہ پڑھنے گئے۔ خیریت سے گھر آئے۔ رات کو ہارٹ ایک ہوا اور یوں وہ جانبر نہ ہو سکے۔

شاہ محمود قریشی صاحب نے گھونگی میں اپنے جلے میں آخر عمران خان صاحب کی تحریک میں اپنی شمولیت کا اعلان کر دیا جو کہ خوش آئند ہے۔ 2011ء کا سورج غروب ہونے سے پہلے ملک میں ایک خوشگوار تبدیلی کے آثار نمایاں ہوتے دکھائی دینے شروع ہو گئے۔

(قلندر حسین سید، احمد پور شرقیہ)

ایک عرصہ بعد

جناب کا مران خان صاحب! السلام علیکم۔
اللہ کریم آپ کو صحت و تندرستی دے (آمین)۔
ایک عرصہ کے بعد اظہار خیال کی محفل میں شامل ہوں اور یہ دیکھ کر بہت خوش ہوں کہ یہ محفل پہلے سے بھی زیادہ رونق افزاء ہو چکی ہے اور بہت سے نئے لوگ اس میں شامل ہیں۔

چوہوں کو یا ایسی ہی دوسری حشرات الارض کو مار دینا ہم لوگ اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں جبکہ اللہ کریم نے انہیں بھی زندگی دی ہے اور زندگی دینا اور لینا صرف اللہ کریم ہی کا کام ہے۔ ہم بھلا کون ہیں؟
بہر کیف میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ایک نہایت نازک موضوع پر قلم چلایا اور سو فیصدی سچے واقعات پر۔ یقیناً میرا لکھا پسند آئے گا اور قریبی اشاعت میں

مذہب کے بارے میں جانتے تک نہیں۔ بہر حال اب ایک نیم روحانی شخصیت شاہ محمود قریشی کے عمران خان کی پارٹی میں شمولیت کے چرچے ہیں تو عین ممکن ہے کہ اب عمران خان بھی پیر عمران شاہ بن جائیں کہ انہیں اور بہت سی تھکیاں بھی مل رہی ہیں۔

مہاتما گاندھی کی اہل نادر کے بارے میں جو تحریر شائع کی گئی ہے اس میں ان کی پیرس یا تر اغالباً غلطی سے 1980ء لکھی گئی ہے۔ اسے 1880ء ہونا چاہیے تھا۔ لیبیا اور کرنل قذافی والے مضمون میں یہ ضرور لکھنا چاہیے تھا کہ کرنل قذافی نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے لیے کس قدر مالی مدد کی تھی اور اپنے ملک میں عوام کو روزگار مہیا کرنے کی غرض سے انسانی ہاتھوں کی مدد سے ایک دریا بنانے کا منصوبہ بھی بنایا اور اسے مکمل بھی کیا تھا۔ مجھے خود وہ دریا دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کی شخصیت کے مثبت پہلو بھی یاد رکھنے چاہئیں۔

(نسیم سحر، راولپنڈی)

تبدیلی کے آثار

گرامی القدر جناب کا مران خاں صاحب!
السلام علیکم۔ سیارہ ڈائجسٹ دسمبر کا شمارہ ملا جو مطالعہ کی زینت بن کر میرے لیے باعث طمانیت ہے۔
خدا اسے یونہی ہنستا مسکراتا رکھے (آمین)

اس دفعہ بھی اس کے سارے سلسلے بھلے ہیں لیکن واقعہ کر بلا پر کوئی تحریر نہ تھی۔ مجھ سے بھی غفلت ہوئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سال ہجری کا آغاز شہادتِ عظمیٰ سے ہوتا ہے۔

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل
(اقبال)

میں اب تک اپنی زندگی کی ستر خزاں اکودہ
بہاریں دیکھ چکا ہوں۔ بلڈ پریشر اور ایگزینٹی کا

ایک غلطی

جناب کامران احمد خان صاحب! السلام علیکم۔
نومبر 2011 میں ”دستک“ پاک امریکہ
تعلقات فیصلہ کن موڈ پر دو صفحے پر مبنی مضمون میں
سیاسی حقائق سامنے آئے۔ عمران خان کے روحانی
تجربات بھی دلچسپ رہے۔ نواز خان کی تحریر
”دولت“ حسب دستور دلچسپ رہی۔ جسوت
عرف جسو، تپارو، پریتیم، مہیشوری، نندہ کے
کرداروں پر مبنی تحریر دیہاتی تصورات ذہن میں
چھوڑ گئی۔ جسوت لالابی گنا گناہا تھا۔ قتل جیسا
انجام ایسے کرداروں کا تو ہوتا ہی ہے۔ ایس امتیاز
احمد کی احتیاط جو کہ انگریزی کہانی کا ترجمہ تھی،
چونکا گئی۔ شوکت افضل کی کہانی کے آخری صفحات
دلچسپ رہے۔ آخر میں باقی آئندہ کا شدت سے
انتظار ہے۔ صفحہ نمبر 200 پر کہانی کے عنوان میں
ایک لفظ غلط چھپ گیا ہے۔ ”کلی کی جگہ“ لکھا
ہوا ہے۔ چند خوبصورت حقیقی کہانیاں لکھی ہیں۔ ہر
ماہ کی کس تاریخ تک آپ کو کہانی مل جانی چاہیے؟
جواب اظہار خیال کے صفحے پر ہی دے دیجئے تاکہ
کہانی جو میں ارسال کرنا چاہتا ہوں بروقت آپ کو
پہنچا سکوں (شکریہ)۔

(بشیر احمد بھٹی، بہاولپور)

☆ بشیر صاحب! آپ کی وساطت سے ہم
قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ محترم شوکت افضل
صاحب کی تحریر کے عنوان میں غلطی سے ”کلی کو“ لکھی،
لکھ دیا گیا۔ اس حوالے سے ہمیں بے شمار خطوط،
ٹیلی فونز اور ای میلز بھی موصول ہوئیں۔ ہم قارئین
سے معذرت خواہ ہیں۔ تحریریں ہر ماہ کی یکم تاریخ
تک مل جانی چاہئیں۔

اشفاق احمد صاحب کی کتاب

جناب محترم کامران احمد خان صاحب! السلام
علیکم۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔
ماہ دسمبر 2011 کا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔
”بابا صاحب، وڈزم آف دی ایٹ“ زبردست رہا۔
اشفاق احمد صاحب نے اپنے تجربات کا نچوڑ
ہمارے لیے مہیا کر دیا۔ یقیناً یہ کتاب پڑھنے کے
لائق ہے۔ دیگر آرٹیکلز اور غزلیں بھی خوب رہیں۔
ہمارے آرٹیکلز لگانے کا شکریہ۔ آئندہ شمارہ کے لیے
مواد ارسال خدمت ہے۔ امید ہے قریبی اشاعت
میں جگہ دیں گے۔ ہماری طرف سے آپ کو اور دیگر
شاف اور ”سیارہ ڈائجسٹ“ کے تمام لکھنے والوں اور
تمام پڑھنے والوں کو دعا و سلام۔ اپنا خیال رکھیے گا۔
(ایس امتیاز احمد، کراچی)

ذوق کی تسکین

محترم کامران احمد صاحب! السلام علیکم۔
امید ہے آپ اور آپ کے ادارے کے تمام
اجاب خیریت سے ہوں گے۔ میں آپ کی بے حد
مشکور ہوں کہ آپ نے نومبر کے شمارے میں میرا خط
اور غزل شامل کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ شمارے
میں شامل بھی کہانیاں اچھی تھیں۔ لیکن کارنر اور بزم
شاعری میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ اس کے علاوہ
قلندر حسین صاحب کی تحریریں معلوماتی اور اصلاحی
ہوتی ہیں۔ خدا انہیں اور ہمیں طاقت دے کہ وہ اپنی
تحریروں سے ہمارے ذوق کی تسکین کرتے رہیں۔
میں اپنی دو غزلیں ارسال کر رہی ہوں امید ہے
قریبی اشاعت میں جگہ پائیں گی۔ دعا ہے کہ ”سیارہ
ڈائجسٹ“ اسی طرح اپنی آب و تاب کے ساتھ ہر
جگہ جگمگاتا رہے (آمین)

(عصمت اقبال عین، منٹلا ڈیم)

ہے۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں کسی قریبی شمارے
میں جگہ دے دیں۔ میری طرف سے آپ اور تمام
قارئین اور عملے کو نیا سال مبارک ہو اور نیا سال دیکھنا
نصیب ہو۔ خدا آپ کی عمر واز کرے اور صحت
دے۔ پہلے کی طرح آپ میری حوصلہ افزائی کرتے
رہیے گا۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ (محمد
اسلم جاوید، فیصل آباد)

اچھا ماحول

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم۔
چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر کچھ عرصہ ”سیارہ
ڈائجسٹ“ سے دور رہی جس کا افسوس ہے تاہم پہلے
سے بھجوائے ہوئے اشعار سیارہ میں حاضری لگواتے
رہے اس کے لیے بے حد شکریہ۔ آپ قارئین کی
تحریروں کو ضائع نہیں کرتے بلکہ وقتاً فوقتاً شائع کر
دیتے ہیں اس کا بھی بے حد شکریہ۔

بابا صاحب، قصہ ایک خط کا اور راجہ داہر کی ماں
بہترین معلوماتی تحریریں رہیں۔ باقی بھگوز، بوجھ اور
دام اور صیاد بھی پسند آئیں۔ ”کھلتی ہے آرزو کی کلی“
شوکت افضل صاحب کی کہانی کا آخری حصہ پڑھ کر دل
خوش ہو گیا۔ کہانی اتنی دلچسپ رہی کہ وقت گزرنے کا
اندازہ ہی نہیں ہوا۔ بالکل احساس نہیں ہوتا تھا کہ کہانی
پڑھ رہے ہیں یا حقیقت میں یہ سب دیکھ رہے ہیں۔
مصنفہ کی گرفت بڑی مضبوط دکھائی دیتی ہے کہانی پر۔
باقی بزم شاعری میں سارا کلام اچھا لگا۔ آئندہ کوشش
کروں گی کہ کوئی مضمون، کہانی ارسال کروں۔ کیونکہ
ایک زمانے میں میں نثر اچھی لکھا کرتی تھی۔ خیر وقت
وقت کی بات ہے۔ اچھا ماحول اور اچھا ساتھ انسان کی
حقیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں معاون ہوتا
ہے۔ میرے لیے دعا کیجئے گا۔

(یاسمین کنول، پسرور)

جگہ پائے گا۔ (اقبال تبسم، راولپنڈی)

☆ اقبال تبسم صاحب! آپ کی یہ دلچسپ تحریر
تازہ شمارے میں شامل ہے۔

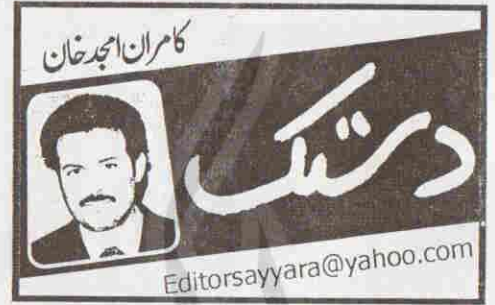
بھٹکے ہوؤں کی راہنمائی

جناب احمد رؤف خاں صاحب! السلام علیکم۔
شہر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک بک شال پر
ماہ دسمبر کا تازہ شمارہ ”سیارہ ڈائجسٹ“ دیکھ کر میرا دل
خوشی سے بارغ بارغ ہو گیا۔ سرورق اپنی مثال آپ تھا۔
ایسا خوبصورت شمارہ نکالنے پر دل مبارکباد قبول کریں۔
یہ ایک معیاری شمارہ ہے جو کہ عوام میں بہت مقبول
ہے۔ میں اس کا ایک بہت ہی پرانا قاری ہوں۔ ماہ
نومبر اور دسمبر میں بزم شاعری میں غزلیں شائع کرنے
پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ ہماری حوصلہ
افزائی کرتے ہیں اس کے لیے بہت بہت شکریہ۔ ہر
ماہ کے آخر پر شمارے کا ہمیں بڑی شدت سے انتظار
ہوتا ہے۔ یہاں بک شال پر شمارہ بہت ہی کم تعداد
میں ملتا ہے۔ دونوں شمارے میرے زیر مطالعہ ہیں۔
پرچے کے تمام عنوان اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں جیسے
انگوٹھی میں گینڈ فٹ ہو مثلاً دستک، القرآن والحدیث،
اظہار خیال، بزم شاعری وغیرہ۔ تحریریں جن سے میں
متاثر ہوا مثلاً قائد اعظم، آؤ لڑیں، اپنا گھر، مڈل کلاس
بہت خوب تھیں۔ بابا صاحب کی کرامات والا مضمون اپنی
جگہ بے مثال تھا جسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ الغرض
شمارہ اپنی پوری آب و تاب سے روشن تھا جو بھٹکے ہوؤں
کی راہنمائی کرتا ہے، غم کے ماروں کے لبوں پر پھول
کھلاتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ سال ہم سے ہمیشہ کے
لیے رخصت ہو رہا ہے۔ بہت ہی خوش سال تھا۔ کیا
پایا اور کیا کھویا یہ آپ خود ہی جانتے ہیں۔ ویسے غریب
انسان کی زندگی بیکار ہے جو ساری زندگی خوشی کے لیے
ترہتا ہے۔ بہر حال یہ سال آہستہ آہستہ رخصت ہو رہا

شریف کی جانب سے ایک ایسی پیشین سپریم کورٹ میں داخل کرائے جانے پر کہ جس کے نتائج فوجی منشا کے عین مطابق ہوں، صدر زرداری کو مکمل یقین ہو گیا کہ ان کے اقتدار کو شدید خطرات لاحق ہو چکے ہیں لہذا انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بجائے پاکستان میں رہ کر مجرم بننے کے ملک سے باہر جا کر پارٹی کو زندہ رکھا جائے اور جمہوریت پر شب خون کے روایتی نعرے کا سہارا لے کر سیاسی جدوجہد جاری رکھی جائے۔

اس حوالے سے سب سے اہم اور انکشاف انگیز خبر یہ ہے کہ صدر آصف علی زرداری دینی روایتی کے وقت سابق سفیر حسین حقانی اور ان کی اہلیہ فرح ناز اصفہانی کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ ایک رپورٹر کی بانی لائن خبر (رپورٹر کے نام کے ساتھ شائع ہونے والی خبر، جس کے بارے میں اس رپورٹر کو یقین ہو کہ خبر مصدقہ ہے) کے مطابق حسین حقانی صدر کو دینی کے لیے لیجانے والے ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے تھے لیکن وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی مداخلت پر انہیں اتار لیا گیا۔ یہ وزیراعظم کا بروقت اور درست اقدام تھا ورنہ اس وقت ملک میں شاید جمہوریت کی ٹرین ایک بار پھر پڑی سے اتر چکی ہوتی۔ بہر حال اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ صدارتی حلقوں نے اس موقع پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ صدر مملکت طبی معائنے کے لیے آرمی کے ہسپتال اے ایف آئی سی جاکر گئے تاہم یہ خبر میڈیا پر نشر ہوتے ہی صدارتی ترجمان نے اس کی تردید کر دی۔ منصوبہ کے مطابق صدر کا جہاز چکالہ ایئر بیس پر دینی روایتی کے لیے تیار تھا تاہم صدارتی حلقوں نے جان بوجھ کر یہ تاثر دیا کہ صدر معائنے کے لیے راولپنڈی اے ایف آئی سی جاکر گئے۔ جب صدر ایوان صدر سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے روانہ ہوئے تو اس وقت ان کے ساتھ حسین حقانی اور ان کی اہلیہ فرح ناز اصفہانی بھی تھیں۔ یہ ہیلی کاپٹر ایوان صدر سے راولپنڈی جانے کے بجائے سیدھا چکالہ ایئر بیس پر جا اتر جہاں دینی جانے کے لیے جہاز تیار تھا۔

دوسری طرف سیکورٹی ادارے ایوان صدر میں ہونے والی تمام نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے اور اس ہیلی کاپٹر میں موجود تمام افراد پر بھی ان کی پوری نگاہ تھی چنانچہ جب ہیلی کاپٹر چکالہ ایئر بیس پر اتر تو وہاں سیکورٹی اداروں کے حکام پہلے سے موجود تھے۔ جب صدر نے طیارے میں سوار ہو کر حسین حقانی اور ان کی اہلیہ کو ساتھ لے جانے کی کوشش کی تو انہیں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ سپریم کورٹ میونسپلٹیڈل میں حسین حقانی کے ملک سے باہر جانے پر پابندی عائد کر چکی ہے اور وہ باہر نہیں جاسکتے۔ اس موقع پر صدر زرداری انتہائی اشتعال میں آ گئے اور حسین حقانی اور ان کی اہلیہ کو ساتھ لے جانے کی کوشش کی تاہم حکام نے انہیں بار بار اپنی مجبوری بتائی۔ بالآخر وزیراعظم کو مداخلت کر کے صدر کو راضی کرنا پڑا کہ حسین حقانی کو ساتھ لے جانا ایک نئے طوفان کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ یوں صدر حسین حقانی کو با امر مجبوری چھوڑ کر خود دینی روانہ ہو گئے۔



صدر زرداری کی واپسی.....؟

صدر آصف علی زرداری ان دنوں دینی میں مقیم ہیں۔ کچھ روز ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد وہ اب دینی میں اپنے گھر منتقل ہو چکے ہیں۔ صدر کی وطن واپسی اور ملکی سیاست میں کردار کے حوالے سے پاکستان کے اندر اور بیرون ملک بھی بے شمار تبصرے و تجزیے سامنے آ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صدر زرداری دراصل میوگیٹ، این آر او اور رینٹل پاور کیمرز کے ذریعے اپنے گرد گھیرا تنگ ہوتا دیکھ کر دینی چلے گئے ہیں اور ان کی واپسی کے امکانات اس وقت تک نہیں جب تک کہ ان کیمرز کے حوالے سے کوئی واضح نتیجہ سامنے نہیں آ جاتا تاہم کچھ حلقے خاص طور پر پیپلز پارٹی سے ہمدردی رکھنے والوں کا خیال ہے کہ صدر واقعی بیمار ہیں اور انہیں علاج کے لیے بیرون ملک جانا پڑا اور جیسے ہی انہیں ڈاکٹرز نے اجازت دی وہ وطن واپس آ جائیں گے۔ بعض جذباتی خیالے تو یہ بھی کہتے نظر آتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے اس وطن کو ہمیشہ خون کا نذرانہ پیش کیا ہے، ہمارے لیڈر بھاگنے والوں میں سے نہیں!

کچھ اطلاعات یہ بھی ہیں کہ صدر آصف علی زرداری کو اس روز یہ یقین ہو گیا تھا کہ افواج پاکستان کے مقتدر حلقے اب ان کے بارے میں پوری طرح بدگمان ہو چکے ہیں، جس روز حسین حقانی کو صدر اور وزیراعظم کی موجودگی میں آرمی چیف اور ڈی جی آئی ایس آئی نے میوگیٹ کے حوالے سے خصوصی اجلاس میں آڑے ہاتھوں لیا اور میمو کو واضح حقیقت اور اس کے تمام شواہد اور ثبوتوں کو درست قرار دیتے ہوئے حقانی کی فوری برطرفی کا مطالبہ کیا۔ اس اجلاس کے بعد آرمی چیف کا رویہ صدر کے لیے تشویش کا باعث تھا۔ مزید برآں مسلم لیگ (ن) کے سربراہ میاں نواز

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر صدر آصف زرداری حسین حقانی کو کیوں ساتھ لے جانا چاہتے تھے حتیٰ کہ انکا نام ای سی ایل میں موجود ہونے کے باوجود بھی صدر یہ رسک لینے کو تیار تھے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں حسین حقانی کے اب تک کے ٹریک ریکارڈ کو مد نظر رکھنا ہو گا۔ حسین حقانی اگرچہ اب تک اس موقف پر ڈٹے رہے ہیں کہ میمو گیٹ سے ان کا کوئی تعلق نہیں وہ خود اس کی تحریر میں ملوث ہیں اور نہ ہی کسی مقتدر حکومتی شخصیت نے انہیں میمو کے حوالے سے کسی قسم کی کوئی ہدایت دی تھی مگر حسین حقانی کا ماضی اور کردار یہ بتاتا ہے کہ حقانی اپنی ترقی، بقا اور پوزیشن قائم رکھنے کے لیے کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں۔ وہ کسی دور میں نواز شریف کے ساتھ تھے تاہم اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں دیکھتے ہوئے وہ بعد ازاں آصف علی زرداری کے قریب ہو گئے لیکن بہت جلد انہوں نے آصف زرداری کے لیے ”مسٹر ٹین پریسٹ“ کے خطاب کو تخلیق کیا۔ بعد ازاں وہ جنرل پرویز مشرف کے بھی قریب ہوئے۔ موجودہ دور حکومت سے قبل وہ ایک بار پھر آصف علی زرداری کے انتہائی قریب آچکے تھے اور پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہونے کے بعد امریکہ جیسے اہم ترین ملک میں سفارتی عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

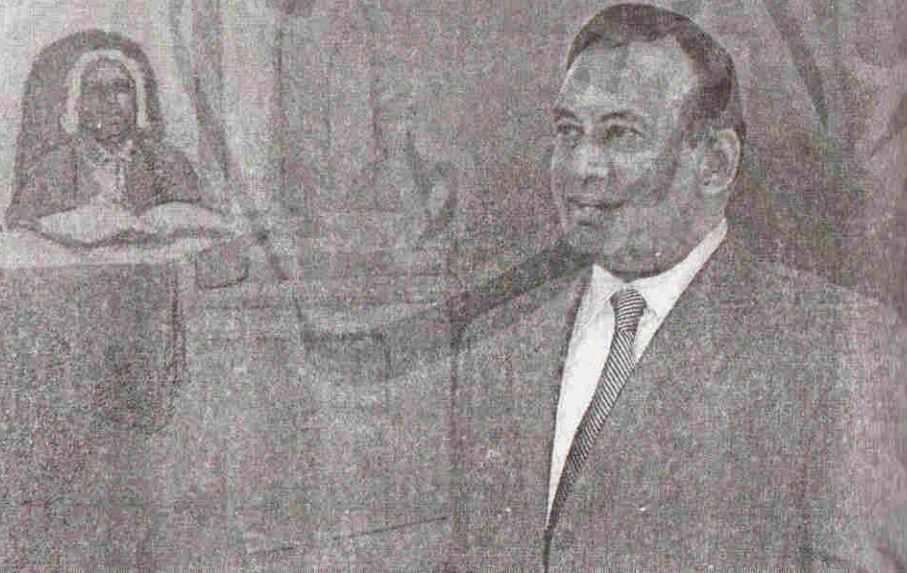
چنانچہ حسین حقانی کا کردار یہ واضح کرتا ہے کہ وہ کبھی بھی اپنے مفاد کی خاطر اپنی وفاداریاں اور جھکاؤ تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہی خوف صدر آصف زرداری کو اس امر پر مجبور کر رہا تھا کہ وہ سپریم کورٹ کے حکم اور ملک میں زبردست سیاسی بحران پیدا ہو جانے کے خطرے کو نظر انداز کرتے ہوئے حسین حقانی کو اپنے ساتھ لے جائیں تاکہ آئندہ آنے والے دنوں میں بالخصوص ان کی ملک میں عدم موجودگی کے دوران حسین حقانی اپنی وفاداریاں تبدیل نہ کر لیں۔ تاہم ایسا ممکن نہ ہو سکا اور صدر کو مجبوراً تنہا دعویٰ روانہ ہونا پڑا۔

اس حوالے سے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر صدر زرداری کا دعویٰ میں قیام طویل ہوتا ہے اور ملک میں ان کی جلد واپسی ممکن نہیں ہو پاتی تو ملک کی سیاسی صورتحال کیا رخ اختیار کرے گی۔ اس حوالے سے بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ حکومت اور فوج کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہو گیا ہے اور صدر آصف علی زرداری کا ملک کی عملی سیاست میں کردار کم ہوتا چلا جائے گا۔ بالخصوص فارن پالیسی اور امریکہ کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے تمام فیصلوں پر فوجی قیادت کو اعتماد میں لیا جائے گا۔ اکثر ممالک میں پاکستان کے سفیروں کی تبدیلی کو بھی اس معاہدے کی ایک کڑی قرار دیا جا رہا ہے۔ بہر حال یہ طے ہے کہ آنے والے دنوں میں ملک کا سیاسی منظر نامہ بہت تیزی سے تبدیل ہونے جا رہا ہے اور کچھ مثبت تبدیلیاں پاکستانی عوام کی امیدوں کو جگانے کا سبب بنیں گی! انشاء اللہ



میمو سکیئنڈل..... کیا رنگ لائے گا؟

بات چل نکلی ہے..... اب دیکھیں کہاں تک پہنچے؟



میمو سکینڈل..... کیا رنگ لائے گا؟

سیارہ رپورٹ

بات چل نکلی ہے..... اب دیکھیں کہاں تک پہنچے؟

ملک کے سیاسی ماحول میں گرما گرمی کا دور ہے، ہر روز ایک نئی خبر کے ساتھ حالات ایک نیا رخ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر میمو گیٹ سکینڈل نے حکومتی ایوانوں میں بھونچال برپا کر رکھا ہے۔ امریکہ میں پاکستان کے سابق سفیر حسین حقانی کے مستعفی ہونے اور اس میمو کے سرے اعلیٰ حکومتی شخصیات سے جاننے کی خبروں سے پیپلز پارٹی کی حکومت کی بنیادیں ہلکی نظر آ رہی ہیں۔ اگرچہ وفاقی وزراء اور پیپلز پارٹی کے رہنما اسے مخالفین کی سازش اور افواہ سازی کا کرشمہ قرار دیتے ہیں لیکن سپریم کورٹ میں رٹ پٹیشن داخل ہونے کے بعد پیپلز پارٹی کے وزراء کی ”گرما گرم“ پریس کانفرنس میں سیاسی مخالفین کے ساتھ عدلیہ کو ہدف تنقید بنانا اور بعد ازاں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی طرف سے پارلیمنٹ میں خطاب کے دوران یہ کہنا کہ اگر میری اور صدر کی شکلیں کسی کو پسند نہیں تو وہ آئینی طریقے سے ہمیں ہٹائے نہ کہ سازشوں کے ذریعے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ ان کی حکومت خطرے میں ہے۔ وزیراعظم نے یہ بھی کہا کہ وہ ملک کے پہلے وزیراعظم ہیں جن کی حکومت نے چار سال کا عرصہ پورا کیا لیکن اس کے ساتھ انہوں نے خبردار کیا کہ اگر ان کی حکومت کو مدت پوری ہونے سے پہلے ہٹایا گیا تو ہماری زندگیوں میں بھی دوبارہ انتخابات نہیں ہونگے۔

افواہوں اور مفروضوں کو تقویت اس وقت ملی جب صدر مملکت اچانک دہلی روانہ ہو گئے اور معلوم ہوا کہ وہ وہاں ہسپتال میں زیر علاج ہیں اور کچھ دن وہاں ہی مقیم رہیں گے۔ اس موقع پر حکومت اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کی طرف سے متضاد بیانات سے انکی بوکھلاہٹ واضح ہو گئی اور لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یقیناً ”کچھ“ ہونے والا ہے۔

سپریم کورٹ میں وفاق، آرمی چیف اور ڈی جی آئی ایس آئی نے میمو کیس کے حوالے سے اپنے جوابات جمع کرا دیے ہیں جبکہ حسین حقانی پہلے ہی اپنا موقف پیش کر چکے ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم اس میمو کی حقیقت، اس کے ملکی سیاست پر اثرات اور آئندہ دنوں میں ملک کے سیاسی ماحول کی بدلتی صورتحال کا تفصیلی تجزیہ پیش کر رہے ہیں!

(ایڈیٹر)

ایڈمرل مولن کے نام میمو (MEMO) کے متن اور مندرجات کے ساتھ ساتھ اعلانیہ طور پر وفادار امریکی شہری منصور اعجاز کے بلیک بیری فون کے پیغامات منظر عام پر آنے سے پاکستان کے تمام ادارے اور شہری حیران ہیں اور اس یادداشت میں کیے گئے مطالبات یا فریاد کو امریکہ کی جانب سے پورا کرنے کی صورت میں پاکستان جو کچھ کرنے کے وعدے کئے گئے تھے ان کا تفصیلی تجزیہ اور اثرات کا اندازہ کئے بغیر ہی پاکستان کا ہر شہری یہ جاننے کا خواہشمند ہے کہ امریکہ کے وفادار شہری منصور اعجاز کے بیانات، تحریر اور فون پیغامات کی حقیقت کیا ہے؟ امریکہ میں پاکستان کے سفیر حسین حقانی کی تردید اور اس میمو سے لائق کے بیانات کس حد تک درست ہیں؟ اس ”میمو“ کے منظر عام پر آنے کے محرکات و مقاصد کیا ہیں؟ امریکہ میں پاکستانی مفادات کی حفاظت اور فروغ کے لیے تقرری پانے والے سفیر حسین حقانی اس سارے معاملے میں کتنے شریک یا بے گناہ ہیں؟ کیا اس ”میمو“ کے سرے کسی اعلیٰ حکومتی شخصیت سے جاملتے ہیں؟ ان سوالات کے جوابات خالص پاکستانی مفادات کی سوچ رکھنے والی کوئی انکوائری کمیٹی ہی دے سکتی ہے۔ تاہم چند بنیادی حقائق اور اقدامات انکوائری سے قبل ہی پاکستانی قوم کو رائے قائم کرنے اور حقیقت تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک بات واضح رہے کہ منصور اعجاز کھلے عام ایک امریکی وفادار شہری ہے اور امریکہ کے مفادات کے لیے کام کر رہا ہے۔ پاکستان کے متعدد سربراہان مملکت، وزرائے خارجہ، سابق سفیر سمیت سب ہی اس سے واقف ہیں لہذا اس سے پاکستانیوں کو توقعات رکھنے کی خام خیالی میں جھلا رہنے کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی بہت سے پاکستانی قائدین اور حکومتی عہدیدار منصور اعجاز سے قریبی تعلقات رکھنے کے لیے کوشاں بھی رہے ہیں۔ منصور کے پیغامات کی سچائی معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ پاکستانی سفیر حسین حقانی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے حکومت پاکستان کو اختیار دے دیں کہ ان کے تمام فونز کے جنوری 2011ء سے اب تک تمام پیغامات اور فون کالوں کا ریکارڈ فون کمپنیوں سے حاصل کر کے دیکھا جائے کہ انہوں نے پاکستان کے مفاد کی حفاظت کرتے ہوئے کس کس عہدیدار یا شخص سے رابطہ کیا یا پیغامات بھیجے اور وہ پیغامات کیا تھے؟ اسی طرح وہ اپنے ذاتی اور سرکاری ای میل ایڈریسز پر آنے اور جانے والی ای میل بھی حوالے کر دیں کیونکہ وہ حکومت پاکستان کے ملازم اور نمائندہ ہیں۔ امریکہ میں بھی الزامات کی صورت میں تحقیقاتی ادارے سرکاری ملازمین سے یہ سب کچھ طلب کرتے ہیں۔ (2) منصور اعجاز پر حکومت پاکستان کو نہ تو کوئی اختیار ہے اور نہ ہی منصور اعجاز ان کا پابند ہے لہذا منصور اعجاز سے درخواست کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ منصور اور حسین حقانی کے درمیان تعلقات کب سے ہیں اور ان کے درمیان دیگر کون کون سے امور پر باہمی تعاون یا تبادلہ خیال ہوتا رہا ہے۔ (3) پاکستانی سفارتخانہ واشنگٹن، نیویارک، شکاگو، ہوسٹن اور لاس اینجلس کے پاکستانی قونصلیٹ کے عملے سے انٹرویوز کئے جائیں اور اقوام متحدہ میں پاکستانی سفیر اور سفارتکاروں سے یہ بھی

معلوم کیا جائے کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی نشست کے انتخاب کی مہم کے دوران امریکہ میں پاکستانی سفیر کا رول کتنا مفید یا منفی تھا۔ (4) پاکستانی کمیونٹی میں حسین حقانی ”سفیر امریکہ برائے امریکہ“ کیوں مشہور ہو گئے تھے۔ پاکستانی کمیونٹی، پاکستانی ڈاکٹروں اور پاکستانی صحافیوں کے ساتھ ان کا رویہ کس قدر جارحانہ اور ”عقل کل“ والا تھا؟ صرف اپنے چند منظور نظر افراد کے علاوہ امریکہ میں آباد پاکستانیوں کی بڑی تعداد ان کے رویے سے شکی کیوں تھی؟ اب آئیے میمو کے مندرجات اور منصور اعجاز کے بلیک بیری فون کے تبادلہ پیغامات کے متن اور ان کی حقیقت سمجھنے کی طرف چلتے ہیں۔

اگر حسین حقانی اپنے بیان کے مطابق منصور اعجاز سے اتنی قربت نہیں رکھتے تھے تو پھر منصور اعجاز کو لندن سے رابطہ کرنا، اپنے ہوٹل کی اطلاع اور قیام کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اور منصور اعجاز کو یہ تمام معلومات کیسے حاصل گئی؟ منصور اعجاز نے ”ایک سینئر پاکستانی سفارتکار“ کا ذکر ترک کر کے اسے حسین حقانی قرار دے کر اب گیند سفیر حقانی کے کورٹ میں ڈال دی ہے کہ وہ ثابت کریں کہ ان پیغامات کا تبادلہ ان سے نہیں ہوا اور منصور اعجاز غلط الزام لگا رہے ہیں۔ ہیوسٹن کے ایک فون نمبر کا ذکر بھی ہے۔ اگر منظر عام پر آنے والے پیغامات کو منصور اعجاز، حسین حقانی مکالمے تسلیم کر لیا جائے تو اسے محدود ریکارڈ سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ منصور، حقانی، مائیک مولن کا ذکر اور وجود اس گفتگو کا مرکز ہیں اور میمو کی تیاری کا کام بھی منصور اور حقانی کر رہے تھے۔ کس نے تحریر کیا یا کرایا کس نے ٹائپ کیا اور کتنا کیا یہ ذیلی امور ہیں۔ میمو کی عبارت کو سفیر حسین حقانی کی دیگر تحریروں، تقریروں اور انداز تحریر سے ملا کر ان الفاظ و جملوں کی نشاندہی ہو سکتی ہے جو اس کام میں ان کا حصہ ہیں جبکہ منصور اعجاز کی تحریروں، بیانات اور شعلہ مزاحی کا بھی ریکارڈ موجود ہے لہذا حالات، واقعات، تناظر، محرکات و مقاصد کے مجموعی ماحول میں حقیقت کو پانے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ منصور اعجاز کا مقصد تو واضح طور پر امریکی مفادات کو فورغ دینا ہے۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ حسین حقانی پاکستانی مفادات کے محافظ اور امین ہیں، انہوں نے اس کی بجائے اپنے محسن آصف زرداری کو بچانے کے لیے پاکستانی مفادات کو قربان کرنے کا کام کیا ہے یا نہیں؟ یہ بات طے ہونا باقی ہے۔ سفیر حقانی کے بعض جملے حیران کن حد تک پاکستان کی بجائے میزبان ملک امریکہ نوازی پر مبنی ہیں۔ پاک امریکہ تعلقات کی راہداریوں کے حقائق گزشتہ چند سالوں سے اس سے بھی زیادہ سخت اور پاکستانی دلوں کو ہلا دینے والے ہیں مگر ان پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ تو مشترکہ مقاصد کے لیے آپس میں تعاون کرنے والے دو افراد کے درمیان ایک دوسرے کو استعمال کرنے کے واقعے میں دو انتہائی ہوشیار کرداروں کے درمیان ذاتی ٹکراؤ نے مائیک مولن میمو اور پیغامات کے تبادلے کے متن کو پاکستانی قوم کے قدموں میں لاکر ڈال دیا ہے ورنہ تاریخ میں ٹیپو سلطان کے قلعہ کا دروازہ کھولنے والے میر جعفر اور سندھ میں آنے والے انگریزوں کو راہ دکھانے والے خوب چند جیسے کردار پاکستان کے حکمرانوں اور لیڈروں کے قافلے میں بھی موجود ہیں۔

قابل قبول ہوں گے اور پاکستانی حکومت (سول، انٹیلی جنس اور فوج) کے زیر اثر حلقے جو اسامہ کو پناہ دینے اور مدد دینے کے ذمہ دار ہوں گے ان کی صحیح اور مفصل تفصیلات دے گی۔ یہ بات یقینی ہے کہ اسامہ بن لادن کی کمیشن متعلقہ حکومتی دفاتر اور ایجنسیوں میں موجود ایسے سرگرم افسران جو اسامہ بن لادن کی حمایت یا اعانت کے ذمہ دار ہوں گے ان کو فوری برطرف کرے گا۔

(3) نئی نیشنل سکیورٹی ٹیم پاکستانی سرزمین پر باقی رہ جانے والی القاعدہ قیادت بشمول امین اللہ اہری، ملا عمر اور سراج حقانی یا القاعدہ سے منسلک گروپوں کی قیادت کو حوالے کرنے کی پالیسی پر عملدرآمد کرے گی یا امریکی ملٹری فورسز کو ان افراد کو پاکستانی سرزمین سے پکڑنا یا ہلاک کرنے کے آپریشن کا گرین سگنل دے گی۔ یہ مکمل اجازت سیاسی لحاظ سے خالی از خطہ نہیں ہے مگر یہ نئے گروپ کا ہماری سرزمین سے برے عناصر کے خاتمے کا عزم ظاہر کرتی ہے۔ اس عزم کو ہماری اعلیٰ سول قیادت کی حمایت حاصل ہے اور ضروری مدد کی بھی یقین دہانی کرائی جاتی ہے۔

(4) ملٹری انٹیلی جنس اسٹیمپلشمنٹ کو سب سے زیادہ خدشہ یا خوف یہ ہے کہ آپ کی سٹیلیٹ ٹیکنالوجی کے باعث پاکستان کی فضائی حدود میں آزادانہ آنے جانے کی صلاحیت کے باعث پاکستان کے جوہری اثاثے اب اصل ہدف ہیں، نئی سکیورٹی ٹیم پاکستانی حکومت (ابتداء میں سول بعد ازاں طاقت کے تینوں مراکز کے ساتھ) کی مکمل حمایت کے ساتھ جوہری پروگرام کے لیے ایک قابل قبول فریم ورک تیار کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کوشش کی ابتداء سابقہ فوجی دور میں کی گئی تھی جس کے نتائج بھی قابل قبول تھے۔ ہم اس آئیڈیا پر کام شروع کرنے کے لیے تیار ہیں اور اس انداز میں کہ پاکستانی جوہری اثاثے مزید شفاف اور محسوس طریقہ کار میں آجائیں۔

(5) نئی قومی سکیورٹی ٹیم آئی ایس آئی کے سیکشن ”ایس“ کو ختم کر دے گی جس پر طالبان اور حقانی نیٹ ورک وغیرہ سے تعلقات کا الزام ہے۔ اس سے افغانستان کے ساتھ تعلقات ڈرامائی طور پر بہتر ہو جائیں گے۔

(6) ہم نئی سکیورٹی ٹیم کی زیر رہنمائی ممبئی حملوں کے پاکستانی ذمہ داران کے خلاف کارروائی کے لیے بھارت کی حکومت سے تعاون کے لیے تیار ہیں، یہ ذمہ داران چاہے غیر سرکاری ہوں یا سرکاری ہوں، بشمول انٹیلی جنس ایجنسیوں کے، اس تعاون میں ان لوگوں کو جن کے خلاف ٹھوس شواہد موجود ہیں، کو بھارتی سکیورٹی فورسز کے حوالے کرنا بھی شامل ہے۔ پاکستان کو انتہائی غیر معمولی صورتحال کا سامنا ہے۔

ہم جو جمہوری نظام حکومت اور خطے میں بھارت اور افغانستان کے ساتھ بہتر ڈھانچہ جاتی تعلقات بنانے پر یقین رکھتے ہیں کہ آپ کے اور ہمارے مفادات کے خلاف صف بند قوتوں کو ان کی حدود میں رکھنے کے لیے امریکی مدد کی ضرورت ہے۔

ہم آپ کو یہ میمورنڈم آپ کی حمایت کے ساتھ صدر پاکستان کی طرف سے تشکیل دی جانے والی نئی

مائیک مولن کو لکھے گئے مبینہ خفیہ میمو کا متن

صدر، وزیراعظم اور آرمی چیف کے درمیان ہونے والی ملاقات کے بعد 72 گھنٹوں کے دوران پاکستان میں سیاسی صورتحال بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ حکومت میں موجود مختلف ایجنسیوں اور گروپوں کی طرف سے آئی ایس آئی، فوج یا سول حکومت پر اسامہ بن لادن کیخلاف آپریشن کے الزامات عائد کرنے کی بڑھتی ہوئی بھرپور کوششیں فوج اور سولین شعبے کے درمیان رسہ کشی پر چھائی ہوئی ہیں۔ نتیجتاً اگلے کے بدلے کی صورت میں آئی ایس آئی حکام کی طرف سے اسلام آباد میں سی آئی اے کے سٹیشن چیف کا نام افشا کیا گیا جو اسلام آباد میں جہاں کوئی مرکزی کنٹرول نظر نہیں آتا زمینی صورتحال خطرناک ہونے کا مظہر ہے۔ سول حکومت آرمی کی طرف سے بڑے پیمانے پر تبدیلیوں کے لیے دباؤ کی تاب نہیں لاسکتی۔ اگر سول حکومت کو بزور ختم کر دیا گیا تو پاکستان اسامہ بن لادن کی باقیات کا مسکن بن جائے گا اور القاعدہ طرز کی انتہا پسندی اور دہشت گردی کو مزید تیزی سے پھیلاؤ کا پلیٹ فارم بن جائے گا۔ اسامہ بن لادن کے معاملے میں اعانت کی بنا پر آرمی اور انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹس پر سول حکومت کا برتری حاصل کرنے کا ایک منفرد موقع ہے۔ آپ سے استدعا ہے کہ جنرل کیانی کو سخت، فوری اور براہ راست پیغام دیا جائے جس میں ان سے اور جنرل پاشا سے کہا جائے کہ پاکستان کی تاریخ کے ایک اور 1971ء جیسے لمحے پر سول نظام کو ختم کرنے کی کوششوں کو بند کیا جائے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو واشنگٹن کی سیاسی و ملٹری حمایت کے نتیجے میں سول حکومت کی تنظیم نو ہوگی۔ جو اب سڑجنگ حوالے سے اعلیٰ سطح پر کمزور ہے (اگرچہ انہیں ملکی سیاسی قوتوں کی حمایت حاصل ہے) یہ تبدیلی بڑی سطح کی ہوگی جس میں قومی سلامتی مشیر اور دیگر قومی سلامتی کے حکام کی جگہ ایسے لوگوں اور بااعتماد مشیروں کی تعیناتی شامل ہے جو سابق فوجی یا سول لوگ ہوں گے جو واشنگٹن کی نظر میں ان کے حمایتی ہوں گے۔ ان میں سے ہر کسی کے امریکی، سیاسی اور انٹیلی جنس طبقے کے ساتھ طویل اور تاریخی تعلقات ہوں گے۔ ان لوگوں کے نام یہ پیغام پہنچانے والی شخصیت کے ذریعے براہ راست ملاقات میں پہنچا دیے جائیں گے۔ پاکستان کی فوجی اسٹیمپلشمنٹ کو رام کرنے کے لیے اگرچہ آپ کے کیانی کے ساتھ براہ راست رابطے (کیونکہ اس وقت وہ صرف آپ ہی کی بات سنیں گے) کی صورت میں پس پردہ امریکی مداخلت ہوئی ہے تو نئی قومی سلامتی کی ٹیم سول حکومت کی مکمل حمایت کے ساتھ درج ذیل امور سرانجام دینے کو تیار ہے۔

- (1) صدر مملکت پاکستان کی طرف سے اسامہ بن لادن اور القاعدہ کے دیگر سینئر ارکان کی معاونت کرنے اور پناہ دینے کے الزامات کی آزادانہ انکوائری کا حکم دیں گے۔ وائٹ ہاؤس پینل میں شامل کرنے کے لیے دو پارٹی نائن الیون کمیشن طرز پر آزاد/خود مختار تفتیش کاروں کا نام دے سکتا ہے۔
- (2) یہ انکوائری قابل احتساب اور آزاد ہوگی اور اس کے نتائج امریکی حکومت اور عوام کے لیے

سیوری ٹیم کے ارکان کے طور پر اجتماعی طور پر پیش کر رہے ہیں۔

حسین حقانی کی کھانی..... صحافت سے سفارت تک

(جاوید چودھری)

حسین حقانی حقیقتاً ایک ٹیلنٹڈ اور کامیاب شخص ہیں، یہ دنیا کے کسی اصول کو اپنی کامیابی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے دیتے۔ حسین حقانی نے ایک مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی، یہ بچپن سے صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، حسین حقانی نے اپنا فکری اور سیاسی کیریئر جماعت اسلامی سے شروع کیا لیکن جب جماعت اسلامی ان کے راستے میں رکاوٹ بننے لگی تو انہوں نے اسے بھی چھوڑ دیا۔ یہ 1980ء میں ”عریب۔ دی اسلامک ورلڈ ری ویو“ کے خصوصی نمائندہ کی حیثیت سے صحافت میں داخل ہوئے لیکن جب صحافت ان کے راستے میں حائل ہونے لگی تو انہوں نے اسے بھی خیر باد کہہ دیا، یہ 1988ء میں میاں نواز شریف کی صوبائی کابینہ میں وزیر کی حیثیت سے شامل ہوئے، حسین حقانی اس دور میں محترمہ بینظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کی کردار کشی کے خصوصی سیل کے انچارج بھی تھے، دنیا آصف علی زرداری کو مسٹر ٹین پرسنٹ کے نام سے جانتی ہے۔ یہ ٹائل انہیں حسین حقانی نے دیا تھا۔ آصف علی زرداری کے گھوڑوں اور اونٹوں کی داستانیں بھی حسین حقانی نے ہی پھیلای تھیں۔ یہ میاں نواز شریف کے انتہائی قریب ہوتے تھے، یہ 1992ء میں نواز شریف کے پہلے دور حکومت میں سری لنکا میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے لیکن جب میاں نواز شریف اور پاکستان مسلم لیگ ان کے راستے میں رکاوٹ بنی تو انہوں نے انہیں بھی چھوڑ دیا اور یہ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ حسین حقانی کی اس سیاسی قلابازی پر ملک کے نامور کالم نگار، ادیب اور شاعر عطاء الحق قاسمی نے تاریخی تبصرہ کیا۔ قاسمی صاحب کا کسی تقریب میں حسین حقانی سے آمناسامنا ہو گیا۔ قاسمی صاحب نے ان کا ہاتھ تھاما اور لوگوں کو مخاطب کر کے بولے ”حسین حقانی میری زندگی کا سب سے بڑا محسن ہے“ لوگوں نے پوچھا ”کیسے؟“ قاسمی صاحب نے جواب دیا ”حسین حقانی نے میری زندگی کا سب سے بڑا نظریہ تبدیل کر دیا“ لوگوں نے پوچھا ”کیسے؟“ قاسمی صاحب نے جواب دیا ”میں سمجھتا تھا کوئی شخص 50 سے پہلے بدل نہیں سکتا لیکن حسین حقانی نے یہ کام ستریس سال میں کر کے میرا نظریہ تبدیل کر دیا۔“ محترمہ بینظیر بھٹو 1993ء میں وزیراعظم منتخب ہوئیں تو یہ ان کے میڈیا ایڈوائزر بن گئے۔ یہ جولائی 1994ء میں سیکرٹری اطلاعات بنے اور جون 1995ء میں ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے چیئرمین مقرر ہو گئے۔ میاں نواز شریف کی دوسری حکومت آئی تو انہوں نے ان کے ساتھ تعلقات ٹھیک کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ 1999ء میں جنرل پرویز مشرف نے ٹیک اور کیا تو حقانی کو محسوس ہوا کہ محترمہ بینظیر بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے محترمہ سے ناٹھ توڑا اور یہ جنرل پرویز مشرف کے قریب آ گئے۔ اس وقت اطلاعات و نشریات کی وفاقی

وزارت جاوید جبار کے پاس تھی۔ حسین حقانی کی کوششیں رنگ لائیں، جاوید جبار فارغ ہو گئے اور حسین حقانی وزیر اطلاعات بننے لگے لیکن کامیابی کا گھونٹ بھرنے سے ایک لمحہ پہلے پیالی حقانی صاحب کے ہاتھ سے نکل گئی۔ میجر جنرل راشد قریشی نے جنرل پرویز مشرف کو قائل کر لیا اور یوں حسین حقانی کامیاب ہوتے ہوتے رہ گئے۔ یہ اس کے بعد امریکہ شفٹ ہوئے۔ یہ جاز ہالینز یونیورسٹی اور بعد میں یوسٹن یونیورسٹی کے ساتھ منسلک ہوئے اور انہوں نے پاکستانی فوج، پاکستان کے جوہری پروگرام اور پاکستان کے مذہبی طبقوں کو اپنی تحقیق کا ہدف بنالیا۔

آصف علی زرداری نومبر 2004ء میں رہا ہوئے تو حسین حقانی ان کے سفارتی ایڈوائزر بن گئے، حقانی صاحب اس وقت تک امریکہ کے اعلیٰ پائے کے کانگریس مین اور سینیٹرز کے قریب آ چکے تھے، زرداری صاحب کو اپنی ایج بلڈنگ کے لیے حقانی صاحب جیسے ساتھی کی ضرورت تھی۔ حقانی صاحب نے زرداری صاحب کا ہاتھ تھاما اور یہ دونوں امریکی میدان میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ 2004ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت تشکیل پائی تو حسین حقانی کو امریکہ میں پاکستان کا سفیر بنا دیا گیا۔ یہ انتہائی بااثر سفیر تھے۔ یہ براہ راست صدر سے مشورہ کرتے تھے اور اس مشاورت کے دوران وزارت خارجہ، وزیر خارجہ اور وزیر اعظم تک کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ مجھے شاہ محمود قریشی نے خود بتایا ”حسین حقانی ہمارے کنٹرول میں نہیں ہیں“ حقانی صاحب پر 2008ء سے 2010ء کے درمیان ایسے ایسے الزامات لگے جن کی بنیاد پر وہ امریکہ میں امریکی سفیر کہلانے لگے۔ انہوں نے اس دور میں امریکیوں کو دھڑا دھڑا ویزے بھی جاری کئے اور ان ویزوں کی وجہ سے ریمنڈ ڈیوس جیسے سینکڑوں لوگ پاکستان آ گئے۔ آئی ایس آئی نے ان ویزوں کا نوٹس لیا، وزارت خارجہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی، تحقیقات ہوئیں تو معلوم ہوا کہ یہ ویزے حسین حقانی نے جاری کرائے ہیں اور اس کام کے لیے وزارت خارجہ تک کو بانی پاس کر دیا گیا تھا۔ شاہ محمود قریشی نے یہ الزام لگایا تھا کہ پاکستان نے عافیہ صدیقی کو قانونی معاونت کے لیے دو ملین ڈالر حسین حقانی کو بھجوائے تھے جن کا سراغ نہیں ملا۔ حسین حقانی پر پاکستانی فوج کے خلاف تحریری پروپیگنڈے کا الزام بھی لگا اور یہ حقیقت بھی سامنے آئی۔ کیری لوگر بل میں فوج کو پابند کرنے کی جو شرائط شامل تھیں ان کے محرر بھی حسین حقانی تھے۔ حسین حقانی کی سفارت کے ساڑھے تین سال ثابت کرتے ہیں کہ حسین حقانی کامیابی کے لیے ہر حد تک جانے کے لیے تیار رہے اور یہ یوسف رضا گیلانی کی جگہ لینے کے لیے پرتول رہے تھے۔ ریمنڈ ڈیوس کے واقعے کے بعد آئی ایس آئی اور سی آئی اے کے تعلقات خراب ہو گئے۔ امریکہ نے پاکستان پر دباؤ بڑھا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ حسین حقانی نے ان حالات کا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ یہ سی آئی اے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ حسین حقانی نے بیرسٹر اعتر از احسن کی موجودگی میں انکشاف کیا ”سی آئی اے نے پاکستان کی 362 بڑی شخصیات کی فہرست بنا رکھی ہے اور یہ تمام لوگوں کو ایک ایک کر کے قتل کرادے گی۔“ حسین حقانی کا کہنا تھا ”اس فہرست میں

16:09-05-09-2011 حسین حقانی: برائے مہربانی میرے سیل نمبر 16179532836 پر ابھی کال کریں۔

16:10-05-09-2011 حسین حقانی: کال رنگ۔

16:19-05-09-2011 منصور اعجاز: معاف کرنا۔ میں ڈی سی کال پر مصروف تھا۔ برائے مہربانی جب دوبارہ تیار ہوں، کال کریں۔

18:26-05-09-2011 حسین حقانی: کال رنگ۔

18:27-05-09-2011 منصور اعجاز: میں نے کوشش کی۔ فون پر بتایا گیا کہ دستیاب نہیں ہیں۔

19:02-05-09-2011 منصور اعجاز: بہر حال دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اے زیڈ کی جانب سے میسج کی منظوری پر غور کر رہے ہیں، جو ملک میں اس وقت کسی بھی چیز سے بڑھ کر ہے۔ آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟

20:43-05-09-2011 منصور اعجاز: میرے پاس آپ کے لیے اضافی معلومات ہیں۔ جب میں آپ کو کال دوں تو رنگ کریں۔

21:10-05-09-2011 منصور اعجاز: کیا یہ کہنا محفوظ ہو گا کہ آپ اسے اپنے فلیگ پول پر نہیں چلانا چاہتے۔ کیونکہ آپ کو درمیان سے ڈبل پر کام کرنے کی ضرورت ہے؟ اگر یہ بات ہے تو بتائیں کہ میں دوسرا طریقہ اختیار کروں، جس میں لکھ کر دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں یہ کافی ہو گا کہ اگر آپ بلیک بیری میسج پر بتا دیں کہ گفتگو کے نکات درست ہیں یا نہیں اور تب آپ اپنی میز سچالیں، میں اپنی، اور یقیناً رکھیں جب دعوت شروع ہوگی تو آپ میری میز پر معزز مہمان ہوں گے۔ اگر آپ اس کے ساتھ اچھے رہے، مجھے گفتگو کے نکات کی آپ کی جانب سے منظوری کی ضرورت ہے۔ اسے اے زیڈ۔ پول پر چلانے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ میری بات کو سمجھیں۔

00:29-05-09-2011 حسین حقانی: کال رنگ۔

00:37-05-09-2011 منصور اعجاز: آپ اپنی ٹوئیکس بھیجیں گے یا میں اپنی کاپی کو حتیٰ سمجھوں؟ اگر ٹوئیکس مختصر ہیں تو میں انہیں حاصل کرنے کے لیے کال دوں گا۔

12:45-05-09-2011 منصور اعجاز: مجھے ایک سینٹر امریکی انٹیلی جنس افسر نے بتایا کہ جی ڈی ایس 11 مسٹر پی نے دریافت کیا اور زیڈ کو برخاست کرنے کے لیے سینٹر عرب رہنماؤں سے اجازت حاصل کی جو اس کے مستحق ہیں۔

13:08-05-09-2011 حسین حقانی: شکریہ۔ بے حد مفید۔

13:09-05-09-2011 حسین حقانی: میں اور میرا دوست درمیانی آپشن سے متفق ہیں۔ کام شروع کریں۔

جنرل بھی شامل ہیں۔“ حسین حقانی جس وقت یہ انکشاف کر رہے تھے اس وقت کھانے کی میز پر سی آئی اے کے عہدیدار اور امریکی سینئر بھی موجود تھے۔

منصور اعجاز کی جانب سے جاری کئے گئے

بلیک بیری پیغامات کی تفصیل

امریکی برنس مین منصور اعجاز کی جانب سے میڈیا کو جاری کئے گئے بلیک بیری پیغامات کا متن ذیل میں دیا جا رہا ہے۔ منصور اعجاز کا دعویٰ ہے کہ یہ تفصیل ان پیغامات کی ہے جن کا انہوں نے امریکہ میں مقیم پاکستانی سفیر حسین حقانی سے بلیک بیری پر تبادلہ خیال کیا تھا۔

13:39-05-09-2011 حسین حقانی: مجھے یقین ہے رسی مطالبے پر اس کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔
13:40:05-09-2011 منصور اعجاز: سسٹم کو باہر سے توڑنا سنگین ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہم صاف گوئی سے سچ اخذ کر سکیں گے؟

13:40-05-09-2011 منصور اعجاز: اصفہانی کے لوگوں کو کالز کی گئیں۔ اب تک بڑا مثبت رد عمل سامنے آیا ہے۔

13:44-05-09-2011 حسین حقانی: اگر میرے دوست اور میں نے یہ سمجھا کہ ”میرے لڑکوں“ سے نمٹنے کا مناسب اختیار رکھتے ہیں، میں یقین دلاتا ہوں ہم مقصد حاصل کر لیں گے۔

13:45-05-09-2011 منصور اعجاز: میں سمجھ گیا۔ اگر میں دیکھوں کہ ہم تمہیں طلائی دستے کے ساتھ ہتھوڑا نہیں دے سکے۔

13:47-05-09-2011 حسین حقانی: یہ بہتر ہو گا۔
13:47-05-09-2011 منصور اعجاز: میں تمہیں ایک پن میسج بھیج رہا ہوں جسے دوسرے نہیں دیکھ سکیں گے، برائے مہربانی جواب دیں۔ شکریہ۔

13:48-05-09-2011 حسین حقانی: اوکے۔ شکریہ۔
14:22-05-09-2011 منصور اعجاز: میسج اصفہانی کو پہنچا دیا گیا۔ جواب مثبت ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ کرنے پر اتفاق کریں۔ کیا میں آپ کو کال کر سکتا ہوں؟

15:02-05-09-2011 منصور اعجاز: برائے مہربانی بتائیں آپ کب اور کس نمبر پر بات کر سکتے ہیں۔ وقت بڑا حساس ہے۔

15:05-05-09-2011 حسین حقانی: نمبر 10 داخل کر رہا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد سیل پر بات کر سکتے ہیں۔

15:05-05-09-2011 منصور اعجاز: اوکے میں آپ کی کال کا انتظار کروں گا۔

16:09-05-09-2011 حسین حقانی: کال رنگ۔

آتا ہے۔

منصور اعجاز: جی زز! تم کیا، تم میرے چکر لگاتے رہو گے۔

حسین حقانی: کون کہتا ہے میں تمہارے چکر لگاتا رہتا تھا، ایک منٹ قبل تک تو تم میرے چکر لگا رہے تھے۔

منصور اعجاز: کیا واقعی!

منصور اعجاز: مجھے ایک اہم بات بتاؤ۔ امریکی اسٹیلٹمنٹ میں کون تمہارا مداح اور کون نقاد ہے۔

حسین حقانی: امریکی اسٹیلٹمنٹ میں، میں لیون اور پیٹریاس پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔

منصور اعجاز: میرے خیال میں تم باس تھے۔

منصور اعجاز: تمہارا مخالف کون ہے؟

حسین حقانی: وزارت خارجہ میں کچھ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔

منصور اعجاز: کیوں؟

منصور اعجاز: کیا اے زیڈ کے قریب ہونے کی وجہ سے؟

حسین حقانی: ان کے خیال میں میں ڈی او ڈی اور دیگر کے ساتھ زیادہ ملوث ہوں اور پاک فوج

سے ڈیل میں مددگار نہیں ہوں۔

حسین حقانی: اے زیڈ سے کچھ زیادہ قریب ہوں۔

منصور اعجاز: میں ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ ایچ آر سی تمہاری بڑی مداح ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے خطے سے

ایک خاتون بھی ان کے ساتھ کام کر رہی ہے۔

حسین حقانی: ہو سکتا ہے ایم آر سی مجھے پسند کرتی ہو لیکن رچرڈ ہالبروک میرے زیادہ گرویدہ رہے۔

جو بھی ان کو پسند نہیں کرتا، مجھ سے بھی نفرت کرتا ہے۔

حسین حقانی: اسٹیٹ طریق عمل کو پسند کرتا ہے۔

حسین حقانی: کانفرنسیں اور بیانات۔ کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہوا۔

منصور اعجاز: بہر حال اسٹیٹ ہمیشہ سے مجھے پسند نہیں کرتا کیونکہ میں ان کے طریق کار سے اتفاق

نہیں کرتا۔

حسین حقانی: روبن رافیل، گرامسین کی نائب بن کر آگئیں۔

حسین حقانی: تم نے کشمیر مشن کے ذریعے اس کے انگوٹھے پر اپنا پیر رکھ دیا۔

منصور اعجاز: گرامسین مجھ سے واقف ہے اس کو معلوم ہے کہ میں کتنا سیریس ہوں، رافیل کشمیر

مداخلت پر اب بھی مجھ سے نفرت کرتی ہے، اس نے میری ایسی کی تیشی کرنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔

حسین حقانی: اب وہ مجھ سے زیادہ چڑتے ہیں جب فاکس ملک واپس آیا جو مجھ سے نفرت کرتا ہے

12:33-05-11-2011 منصور اعجاز: مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ پتہ کروں آپ کی مینٹنگ کس

وقت ہے۔ اب تک کے جوابی رد عمل سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کا سختی سے جائزہ لے رہے ہیں۔ گو کہ وہ

اسے تقریباً ناقابل یقین سمجھتے ہیں کہ کوئی ایسے نتائج دے سکتا ہے جس کی توقع ہو، میرے خیال میں۔

امید ہے تم گھر خیریت سے پہنچ گئے ہو گے۔ کیا تم لندن میں قیام کے دوران پرویز مشرف سے ملے۔

14:59-05-11-2011 منصور اعجاز: کال رنگ۔

فائنل ٹائمر میں نومبر 2011ء کے پہلے ہفتے میں آرٹیکل شائع ہونے کے بعد منصور اعجاز کی حسین

حقانی سے بات چیت کی تفصیلات:

حسین حقانی: تم یہ کہتے رہو کہ تم نے مسیح پہنچا دیا ہے اور ثابت کرنے کے لیے اسے بلیک بیری

مسیح پر دکھاؤ۔

حسین حقانی: تم ایک امریکی شہری ہو۔

حسین حقانی: تمہیں امریکی مفادات کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

منصور اعجاز: میں نے ایک آرٹیکل لکھا ہے اور اس وقت سے کسی کو بھی ایک لفظ آن ریکارڈ

نہیں بتایا۔

حسین حقانی: پاکستان کی سیاست میں امریکی پھوٹو تصور کیا جانا افادیت کھو دیتا ہے۔

حسین حقانی: اب اس کو ختم ہونے دو۔

حسین حقانی: ہم درست سمت میں ہیں۔

حسین حقانی: ہم اب بھی منظر نامہ ترتیب دے سکتے ہیں۔

منصور اعجاز: اوکے، مجھے معلوم ہے میرا آئی کیو کمزور ہے، ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں سمجھ

نہیں سکا۔

حسین حقانی: تم پی پی ایل کو وطن جانے نہیں دو۔ میں تمہاری ٹیم سے کھیلوں گا، اپنی سے نہیں۔

منصور اعجاز: لیکن میرا نکتہ نظر یہ ہے کہ اگر حقیقی خطرہ ہے، جیسا کہ تم نے اس وقت بتایا تھا۔

حسین حقانی: تم یہ سمجھ رہے ہو کہ پاکستان میں ایسی طاقتور شخصیات نہیں جو ڈبلیو/یو ایس قبل از وقت

انکشاف افشا کرنے پر آمادہ ہوں۔

حسین حقانی: یہی وہ جسے تم نے مس کیا اور تمہیں یہ کوئی اور نہیں بتا سکتا کہ تم تک مزاج ہوتے اور

خس مزاج کھوتے جا رہے ہو۔

منصور اعجاز: میں کوئی کروڑ پتی نہیں ہوں لیکن ساحل سمندر پر اچھی جگہ کے بارے میں ضرور

جاننا ہوں۔

حسین حقانی: میں بھی کوئی مضامین کا پلا پچر نہیں ہوں لیکن مجھے اچھے لوگوں کو دوست بنانے کا فن

اور اس نے اس کو بتایا کہ میں اور تم معاملات پر ساتھ ہیں (یہ الگ بات کہ ہم ہیں یا نہیں)
حسین حقانی: گرامین اچھا آدمی ہے لیکن وہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی زندگی سے بڑھ کر کردار پلے کرے، اولڈ سکول!

حسین حقانی: یہ وجہ ہے کہ میں تم سے درخواست کر رہا ہوں۔

منصور اعجاز: ہاں میں جانتا ہوں جب وہ ہمارا لایسٹ تھا تب سے واقف ہوں وہ اچھا انسان ہے۔
حسین حقانی: اس نے مجھ سے توجہ ہٹالی۔

منصور اعجاز: تہقید۔ یقین نہیں کہ تم سے توجہ ہٹالی۔

حسین حقانی: میں کوشش کرتا ہوں کہ یہاں معاملہ ٹھیک ہو جائے اور ملک میں لڑائی پر توجہ دوں۔

منصور اعجاز: ڈپلومیسی شاندار۔

حسین حقانی: ہاں صحیح ہے! لیکن کم از کم مجھے یہ نہیں کہا جانا چاہیے کہ میں تمہاری ٹیم کے لیے کھیل رہا ہوں۔

منصور اعجاز: کیوں نہیں؟ تم ان دنوں میں اچھی رہنمائی کرتے رہے ہو۔

حسین حقانی: میں مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں، لڑنا نہیں۔

حسین حقانی: دیکھو اور انتظار کرو، بھلری کے تازہ حملے چیزوں کو کس سمت میں تبدیل کرتے ہیں۔

منصور اعجاز: کیا ہم نے حقیقتاً ایک حقیقی مسئلہ حل کیا ہے یا یہ سب دھواں اور آئینہ ہے؟ میرا مطلب ہے ان دنوں کا دباؤ.....

حسین حقانی: میرا خیال ہے ہر شخص ISloo Sucks ہے۔

منصور اعجاز: بالکل درست!

حسین حقانی: معاملہ حل ہونا کہنا جلد بازی ہوگی۔

منصور اعجاز: اگر ہر شخص چوسنے میں لگا ہے تو ہم نے کیا بچایا۔ ایک ڈوبتا جہاز جو کسی بھی طرح

ڈوبنے جا رہا ہے؟

حسین حقانی: یہ ایک جینیاتی مسئلہ ہے بالآخر صورتحال موافق ہو جائے گی۔

منصور اعجاز: یقیناً۔

حسین حقانی: میرا خیال ہے ہم انتہائی خراب حالات سے قبل صورتحال بہتر کر لیں گے۔

منصور اعجاز: تم کیسے مسئلہ حل کر سکتے ہو، تمہیں یہاں خوب معلوم ہے اگر تمام افراد جو وہاں انچارج

ہیں غلط ہیں؟ صرف ایک سال میں امریکہ میں ہم نے تبدیلی دیکھی، تب تمہیں حقیقتاً نہیں پتہ تھا یہاں

کون ہوگا!

حسین حقانی: میرا مطلب ہے شاہ ایران محفوظ رہتا اور بعض حقیقی اصلاحات متعارف کرا دی جاتیں

بن گئی تھیں، نے 1996 (میں یہ گھٹیا طریقے اختیار کیے تھے) تب ملیمہ پاکستان کی سفیر تھیں، نتیجتاً نومبر 96ء میں ان کی حکومت ختم ہو گئی تھی۔

حسین حقانی: میں ایسا شخص نہیں ہوں، وہ مجھ سے پیغام کو بہتر طور پر وصول اور سمجھ لیں گے۔ منصور: عمران کو میرا جواب بہت سادہ اور سچا تھا، میں نے کوئی باغیانہ خط نہیں لکھا اور اگر عمران کے پاس کوئی کاپی ہے تو وہ سامنے لائیں۔ حسین حقانی: میرا خیال کہ تمہاری دھمکی کارگر ہوگی۔

منصور اعجاز: یہ میرے نکتہ نظر سے درست ہے مگر سیاست دان سیاست دان بنے۔ منصور اعجاز: میں نے کوئی دھمکی نہیں دی، حقائق بتاتے ہیں، تمہارے پاس کو حقائق بتانے کی ضرورت نہیں۔

حسین حقانی: تمہیں یقین ہے تمہاری جانب سے تردید نہیں ہوگی۔ منصور اعجاز: نہیں ممکن ہے وہ کر دیں لیکن یہ ایک غلطی ہوگی، دوسری جانب کافی ثبوت موجود ہیں۔ حسین حقانی: مگر کیا کوئی چیز ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں؟ حسین حقانی: کیا یہ نئی نوعیت کا مشن نہیں تھا جس کی حکام تردید کرتے ہیں؟ منصور اعجاز: مجھے معلوم ہے کہ اور نہ اس کی پرواہ ہے میرا موقف سادہ ہے جو میں کرنے جا رہا ہوں وہ بتا دیا۔

حسین حقانی: اگر تم میرا مشورہ مانو، تم اسے پھیلنے دو اور بعد میں اپنے آپ کو ثابت کرو۔ حسین حقانی: عام طور پر یہ میری حکمت عملی ہوتی ہے۔ اس وقت وہاں پہنچو جب دیگر از خود ختم ہو چکے ہوں۔

منصور اعجاز: میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ تم نے وہی کچھ کیا جو تمہارے خیال میں باہر جتنوں پر موجود تھا۔ حسین حقانی: میں وہی کروں گا جسے میں ٹھیک رکھ سکتا ہوں۔ حسین حقانی: میرے پاس نہیں ہے۔

منصور اعجاز: تم جس بات کا مجھے کریڈٹ دے رہے ہو میں اسے کہیں زیادہ جانتا ہوں۔ حسین حقانی: ایک دوسرے سے جڑے رہو، اپنا خیال رکھو۔ حسین حقانی: میں نے خاموشی برقرار رکھی ہوئی ہے۔ کسی رد عمل سے پہلے مجھ سے دریافت کر لو۔ منصور اعجاز: یہ بات دلچسپ اور حوصلہ افزاء ہے کہ میو میں دی گئی کئی تجاویز میری بلیک ہیری وائر لیس ڈیوائس سے بھیجی گئیں۔

منصور اعجاز اور حسین حقانی کی دو طرفہ کانز کاریکارڈ
میونسپل کے مرکزی کردار امریکی بزنس مین منصور اعجاز نے کہا ہے کہ امریکہ میں پاکستانی سفیر

تو ایران بہتر کر سکتا ہے۔ حسین حقانی: اصل میں، میرا خیال ہے معاملات کے لیے نئی PPL بہتر ہوگی۔ وہ جھوٹ برداشت نہیں کرتے۔

منصور اعجاز: اس پر شرط نہیں لگانا، ہم دہشت گردوں کی بڑی تعداد تیار کر کے سسٹم میں داخل کر رہے ہیں۔ وہ کسی پاکستانی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔

حسین حقانی: ٹھیک۔ اس صورت میں مجھے ساحل کا سستا کھڑا تلاش کر دیں۔ منصور اعجاز: کین، روٹنے (جو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں) ہیری۔ سب اسی طرح کے ہیں۔ ٹھیک۔ میں اریخ کر سکتا ہوں۔

Z کیوں ایک ایڈیٹ چاہتا ہے؟ حسین حقانی: لیکن مشاورت سے قبل کچھ نہیں لکھتا اس معاملے پر۔ حسین حقانی: سخت سوال ہے۔ حسین حقانی: بولتے ہوئے 20 منٹ ہو گئے، پھر بات کرتے ہیں۔

حسین حقانی: بائے۔ منصور اعجاز: اوکے۔ گڈ لک۔ حسین حقانی: تھینک یو۔

منصور اعجاز: اے بڈی، میرا خیال ہے تم/تمہارے دفتر خارجہ والے لائیں کلباڑیاں لے کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں، بد قسمتی سے۔ انتہائی بد قسمتی۔ حسین حقانی: میں معلوم کروں گا اور انہیں روکوں گا، اس کی ضرورت نہیں ہے۔

حسین حقانی: تم پاکستانی میڈیا سے بات کر کے مدد نہیں کر رہے۔ حسین حقانی: خاموش مجاہد کے ساتھ کیا ہو۔ منصور اعجاز: عمران خان کی ریلی کے بعد یہ سب کچھ ختم کرنے کے لیے بیان جاری کیا ہے لیکن میں اپنی کردار کشی برداشت نہیں کروں گا۔

حسین حقانی: مجھے اتفاق ہے۔ اس کو روکنے کے لیے اپنی پوری کوشش کروں گا۔ منصور اعجاز: روبرو دیت۔

حسین حقانی: کوئی کیا کرتا ہے اس کے بجائے اپنے پالیسی پیغام پر فوکس کرو۔ منصور اعجاز: پلیز اپنے پاس کو یاد دلائیں کہ ان کی عزیز بیگم جو بعد ازاں میری بہت اچھی دوست

ڈیوڈ رچرڈز اور اس وقت کے پارلیمانی سیکرٹری برائے دفاع ٹوبیاس ایلوڈ سمیت دیگر اعلیٰ برطانوی عہدیداروں سے ملنے لندن گئے تھے، مذکورہ عہدیداران اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس وقت پاک امریکہ تعلقات کی جو صورت حال تھی اس کے پیش نظر میرے ذہن میں حکومت کا تختہ الٹے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا، انہوں نے اپنے بیان میں مزید کہا ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کیوں منصور اعجاز ایک طرف میمو پنچا کر سولین حکومت کی مدد کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ دوسری جانب منتخب حکومت اور پاک فوج کے خوشگوار تعلقات کو نقصان پہنچا کر جمہوریت کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ اس بارے میں کچھ بھی کہنا حیران کن ہوگا۔ حسین حقانی نے کہا ہے کہ وہ منصور اعجاز کو گزشتہ ایک عشرے سے جانتے ہیں اور اس دوران وہ کئی بار ان سے آن اور آف دی ریکارڈ گفتگو کر چکے ہیں۔ ایک بار منصور اعجاز نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے مقابلے میں زیادہ امیر اور خوبصورت ہے اس لیے مجھے اس پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ یہ بات واضح ہے کہ وہ اپنے اقدامات کے نتائج کے بارے میں نہیں سوچتا، پاکستانی سفیر کا کہنا تھا کہ وہ سکتا ہے منصور اعجاز دنیا کا واحد ایسا نام نہاد خفیہ جاسوس ہو جو اس قدر تشہیر کا خواہشمند ہو، انہوں نے اپنے 10 اکتوبر کے آرٹیکل میں جو کچھ لکھا ہے اگر وہ صحیح ہے تو انہیں اس کی وضاحت کرنا ہوگی۔

سپریم کورٹ میں میمو گیت

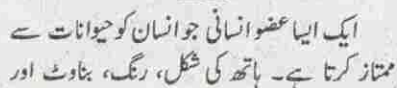
مسلم لیگ ن کے سربراہ میاں محمد نواز شریف اور ان کے ساتھیوں نے سپریم کورٹ میں ایک پٹیشن داخل کی ہوئی ہے جس میں سپریم کورٹ سے درخواست کی ہے کہ میمو گیت کا مسئلہ بڑا حساس نوعیت کا ہے اس سے پاکستان کی بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔ پاکستانی افواج کے خلاف دوسرے ملک سے مدد مانگی گئی ہے۔ اس کی پوری طرح تحقیقات ہوئی چاہئیں کہ اس کے پیچھے کیا سازش کارفرما ہے اور سازش کرنے والے کون لوگ ہیں۔ اس پٹیشن میں صدر، وزیراعظم، آرمی چیف، ڈی جی آئی ایس آئی اور حسین حقانی کو فریق بنایا گیا ہے۔ سپریم کورٹ میں اس پر کارروائی ہوئی اور عدلیہ نے صدر، وزیراعظم، آرمی چیف اور ڈی جی آئی ایس آئی سے پندرہ روز کے اندر رپورٹ طلب کر لی اور حسین حقانی کا نام ای سی ایل میں شامل کر لیا گیا کہ وہ ملک چھوڑ کر باہر نہیں جاسکتے۔ ساتھ ہی ایک تحقیقاتی کمیشن بھی مقرر کر دیا گیا۔ اب اس درخواست کی سماعت 19 دسمبر 2011 کو ہو رہی ہے جس میں فریقین نے اپنے اپنے جوابات پیش کرنے ہیں۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق وفاقی حکومت، آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی اور ڈی جی آئی ایس آئی جنرل شجاع پاشا نے اپنے جوابات سپریم کورٹ میں جمع کرا دیئے ہیں جبکہ حسین حقانی پہلے ہی اپنا موقف پیش کر چکے ہیں۔ وفاق اور سکیورٹی اداروں کے جوابات نے ملک کے سیاسی اتق پر نئی پچھل مجادی ہے کیونکہ ان جوابات سے حکومت اور فوج آمنے سامنے آکھڑے ہوئے ہیں۔ وفاق کی طرف سے حسین حقانی کے موقف کی

حسین حقانی کو اور ان کی جانب سے کی گئی کارڈ ریکارڈ جاری کر دیا گیا ہے۔ ان دوطرفہ کارڈز کی ایک سینئر پاکستانی افسر نے بھی تصدیق کر دی ہے۔ حسین حقانی اور امریکی رابطے کے درمیان یہ کارڈ گزشتہ 9 اور 10 مئی کے درمیان کی گئیں، منصور اعجاز کی جانب سے جاری ٹیلی فون ریکارڈ میں تاریخ، وقت، فون نمبرز اور دوطرفہ کارڈز کے دورانیے کی تفصیلات درج ہیں۔ تمام کارڈز جی ایس ایم نمبر +44773033 سے کی گئیں اور وصول کی گئیں۔ ذیل میں ریکارڈ کی تفصیلات ہیں جس میں سے امریکی رابطے کے نام اور فون نمبرز کو خارج کر دیا گیا ہے۔ (ان کا مطلب آنے والی اور آؤٹ مطلب جانے والی کارڈز ہیں) تفصیلات تاریخ، وقت، ٹیلی فون نمبرز، آنے اور جانے والی کارڈز دورانیہ اور بیان کی ترتیب میں ہیں۔ 05-09-2011، 12:35:49، +442071060900، 16:03 آؤٹ، حسین حقانی مقیم انٹرکانٹینٹل لندن، کمرہ نمبر 430، 05-09-2011، 12:58:06، +1703، آؤٹ، امریکی رابطے، قیام گاہ (المیہ سے بات کی، منج چھوڑا) 05-09-2011، 13:54:31، +1703، 19:26، ان، امریکی رابطے، موبائل فون کے ذریعے فون کال کا جواب۔ 05-09-2011، 17:51:41، +16179532835، 00:23، آؤٹ، حسین حقانی موبائل۔ 05-09-2011، 18:28:45، +16179532835، 02:34، ان، حسین حقانی موبائل کالنگ ان۔ 05-09-2011، 18:36:41، +1703، 00:48، آؤٹ، امریکی رابطے موبائل، حقانی کی کال کا خلاصہ جاری کیا۔ 05-09-2011، 21:20:11، +442071060900، 00:31، آؤٹ، حسین حقانی مقیم انٹرکانٹینٹل ہوٹل کمرہ نمبر 430، 05-10-2011، 00:30:55، +16179532835، 01:17، ان، حسین حقانی موبائل کالنگ ان۔ 05-10-2011، 00:33:05، +1703، 01:39، آؤٹ، امریکی رابطے موبائل۔ 05-10-2011، 09:06:16، +442071060900، 11:16، آؤٹ، حسین حقانی مقیم انٹرکانٹینٹل لندن، کمرہ نمبر 430۔ 05-10-2011، 14:51:33، +1703، 02:55، آؤٹ، امریکی رابطے موبائل۔

منصور اعجاز کے تمام دعوئے اور حسین حقانی کا موقف

پاکستان میں امریکہ کے سفیر حسین حقانی نے پاکستانی نژاد امریکی بزنس مین منصور اعجاز کی جانب سے جاری کئے گئے بلک بیری کے مبینہ بیانات کی صداقت سے انکار کرتے ہوئے منصور اعجاز کے تمام دعوؤں اور الزامات کی تردید کی ہے۔ ایک وضاحتی بیان میں انہوں نے کہا کہ انہوں نے کوئی میمو لکھا نہ بھجوایا اور نہ ہی منصور اعجاز سمیت کسی شخص کو ایسا کرنے کا اختیار دیا۔ حسین حقانی کا کہنا تھا کہ اس مبینہ بات چیت کے حوالے سے مئی کے مہینے کی جس تاریخ کا حوالہ دیا جا رہا ہے اس روز وہ لندن کے پارک لین انٹرکانٹینٹل ہوٹل میں مقیم تھے۔ پاکستانی سفیر کے مطابق وہ برطانیہ کے چیف آف جنرل شاف سر

آج کل جو بات ہر چینل پر کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ صدر جب تک واپس نہیں آئیں گے جب تک انہیں پتہ نہیں چل جاتا کہ سپریم کورٹ میں میموگیٹ کیس کیا رخ اختیار کرتا ہے۔ اگر آئی ایس آئی نے سپریم کورٹ میں وہ تمام ثبوت پیش کر دیئے جو میموگیٹ کو جی ثابت کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں تو یہ معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر جائے گا۔ سپریم کورٹ میں اور بھی کئی مقدمات ہیں جن کے فیصلوں پر حکومت عملدرآمد نہیں کر رہی اسی لیے حالات پاکستان میں بہت نازک صورت اختیار کر چکے ہیں ہر پاکستانی شہری کا خیال ہے کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے.....!



or Animal Hand)



جانور سے
مشابہ ہاتھ پھیلی
بھدی، کھوری،
سخت، انگوٹھا بے
ڈھب، مختصر،
بد صورت انگلیاں
پھیلی کے برابر،
بعض اوقات

جسامت ہی کسی انسان کی شخصیت کے بارے میں واضح کرتی ہے کہ یہ انسان کن خصوصیات کا مالک ہو گا۔ ان خصوصیات میں کردار، سیرت و اخلاقیات اور جذبات، ذہنی رجحانات وغیرہ سبھی کچھ شامل ہے۔ ہاتھ کی ساخت میں یہی سب سے نمایاں حصہ ہے جس کے ساتھ انگلیاں اور انگوٹھا بھی شامل ہے۔ کسی بھی پاسٹ کی نظر میں ہمارا ہاتھ ایک آئینہ کی مانند ہوتا ہے جس میں انسانی نوشتہ تقدیر کی تمام جھلکیاں بصورت لکیروں کے جال کے نظر آتی ہیں اور انسان کے ذہنی رجحانات کے مطابق اس کے بننے، سنوارنے یا بگڑنے کا باعث بنتی ہیں۔ انہی لکیروں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس انسان کا معاشرے میں کیا مقام ہے۔

ہاتھ کی اقسام

یوں تو ہاتھ کی بنیادی اقسام تین ہیں جو کہ مخروطی، مربع اور چھٹی اقسام ہیں لیکن ماہرین پامسٹری نے بالتفصیل ان کو ذیل کی سات اقسام میں منقسم کیا ہے تاکہ ان سے باآسانی بخوبی تفصیلات کا علم ہو سکے اور پیش گوئی درست طریقے سے کی جاسکے۔ وہ سات اقسام حسب ذیل ہیں:

1- ابتدائی ہاتھ یا وحشی ہاتھ

2- عملی یا مربع ہاتھ

3- چوڑا یا چپٹا ہاتھ

4- فلسفیانہ ہاتھ

5- خیال پرست یا نفسیاتی ہاتھ (روحانی ہاتھ)

6- مخروطی ہاتھ

7- ملا جلا ہاتھ

ہاتھوں کی پہچان

1- ابتدائی/ وحشی ہاتھ (Elementary)



خیالات کے
باعث وقت کا
پابند، زندگی
کے ہر شعبے
کے لیے
یکساں مفید
اور کارآمد
اچھی عادات

رکھنے والا، بزرگوں کا ادب کرنے والا، قاعدہ قوانین اور دستور العمل کا پابند، ہر شے کو منظم اور با ترتیب دیکھنے والا، مذہبی لحاظ سے انتہا پسند، با اصول، مستعد اور معقول طریق کار کا حامل، رسم و رواج کا پابند، جھگڑوں سے دور بھاگنے والا، لوگوں سے میل ملاقات میں احتیاط پسند، جدت پسندی اور خیال آخری سے کوسوں دور، قوت ارادی کا پکا، کردار میں شدت پسند، قدرتی لحاظ سے سائنسی اور علمی علوم سے خاص لگاؤ رکھنے والا، زراعت، تجارت کے پیشوں میں کامیاب، قوت ضبط کے محاسن سے بخوبی آراستہ، فنون لطیفہ سے عدم دلچسپی رکھنے والا، خیالی پکا و پکنا، پسند نہ کرنے والا، عملی کاموں سے لطف اندوز ہونے اور کامیابی پانے والا، ظاہر داری کی بجائے نظریات میں پختہ یقین رکھنے والا، سخت گیر طبیعت کا مالک، دوسروں کی باتوں پر فوری یقین نہ کرنے والا، اپنے دلائل میں حرف آخر، رسم و رواج سے نفرت کھانے والا اور کسی حد تک سرکش، ماتحتی سے دور بھاگنے والا۔

جنسی بے راہ روی سے کوسوں دور، حسن و خوبصورتی کے متعلق ان کا معیار کچھ زیادہ نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کی خوبصورتی سے یہ متاثر ہوتے ہیں۔ حقیقت پسند، اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرنے میں اتنا پرستی کو آڑے نہ آنے دینے والا، ناجائز فائدہ سے مبرا، علم بغاوت کبھی بھی بلند نہ کرنے والا،

حاکم کا وفادار اور قابل بھروسہ دوست، عمل پسندی کی وجہ سے معاشرے کے بہترین کارکن، ست روی اور کاہلی سے کوسوں دور، حقیقت پسندی کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی شے پر تا زندگی بھروسہ کرنے والا، سلامت روی کے باعث بے حد نمایاں شخص، اپنی اصول پسندی اور معاملہ بندی کے باعث لوگوں کو اپنا معاون بنانے والا۔ بعض نمایاں خصوصیات:

☆ جب دماغ کی لکیر لمبی ہو اور نیچے آ کر دو شاخ بن جائے تو ایسے لوگ بہت اچھے مقرر اور راسخ ہوتے ہیں اگر دماغ کی لکیر مریخ کے ابھار پر ختم ہو تو ان کے اندر معاشی شعور اور ہوس زر کا مادہ بیدار ہو جاتا ہے اور دولت مندی کا نشان کہلاتا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کے حقوق غصب کرنے میں ذرا برابر بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے اور تعلیم کے حصول کی صلاحیت ان میں عموماً مفقود ہوتی ہے۔ ☆ اگر انگوٹھا لمبا ہو تو اعلیٰ ڈاکٹر، مشہور وکیل، نامی گرامی سائنسدان ہوتا ہے۔

☆ زندگی اور دماغ کی لکیریں الگ الگ ہوں تو دہریت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے ایسا انسان مذہب کے بعد خدا کی ہستی سے بھی منکر ہو جاتا ہے۔ زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی صورت میں اپنا من پسند فلسفہ رائج کرنے میں دلچسپی زیادہ لیتا ہے اور عقلی و شعوری دلائل سے دوسروں کو قائل کرنے میں مگن نظر آتا ہے۔

☆ ملائیت اور فرقہ پسندی کا رجحان ایسے افراد میں زیادہ نظر آتا ہے اور لوگوں کو گمراہ کرنا ان کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

☆ چست انگلیوں کی صورت میں موجد اور نئی نئی اشیاء کے اختراع کا باعث بننے والا انسان۔

☆ مخروطی انگلیوں کی صورت میں علم و ادب کا متوالا، لٹریچر کا دیوانہ، شاعری کا پروانہ، فنکارانہ صلاحیتوں کا حامل فرد۔

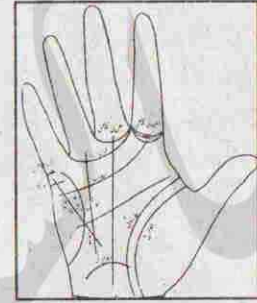
جانب اس طرح پھیلی ہوتی ہیں جیسے کسی معمار کی ہوں یا دواساز کا دوائی کوٹنے والا ہاون دستہ، دیکھنے میں عجیب، ہر انگلی آغاز میں کم چوڑی اور اختتام پر بہت زیادہ چوڑی اور قدرے خمدار اور چوڑے سرے والی، انگلی کی پہلی پور خاصی پھیلی ہوئی اور چھٹی حالت میں۔

خصوصیات: انتہائی باعمل، شدید محنت کش، نئی دنیاؤں (یعنی اور جسمانی دونوں لحاظ سے) کا متلاشی، عمل کا پیکر، پر جوش کارکن، جدت طراز، وراثتی روش کا مخالف، مضبوط جسمانی ساخت کا مالک، اہل ارادوں کا مالک، کسی بھی کام کو نئے اور انوکھے انداز میں کرنے کا خواہاں، مہماتی کاموں میں سبقت لے جانے والا، کالہی سے کوسوں دور، زیر نظر کام یا معاملہ کو بہت اور مضبوط قوت ارادی سے انجام دینے والا، بیرونی ممالک کی سیر کا خواہاں اور ملک سے باہر رہائش پذیری کا خواہاں، ارادوں کی عدم تکمیل سے الجھنوں کا شکار، یعنی تبدیلیوں کا حامل، فرصت کے اوقات میں بے چین و بے قرار، عمل پسندی کے باعث جدت طراز، زندگی میں کامیابی کا خواہاں، دوسروں سے زیادہ کامیاب، فراغ قلب اور حوصلے کا مالک، آزاد منش اور غلامی سے نفرت کرنے والا، موضوعات کو نیا پن دینے والا، ہمدرد انسان، سدا بلند نظر، عظیم منصوبہ ساز، سدا عظمت کی تلاش میں رہنے والا، منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے والا، جس پرستی سے قدرے دور، نئی منازل پانا ان کا مقصد حیات، اکثر دولت مند، سوچ و فکر کا عادی، خوش اخلاقی کا عنصر زیادہ، نرم طبیعت کا حامل، اپنے حلقہ احباب میں ہر لحیزہ، مسلسل تبدیلی کا خواہاں، عموماً تجبلی ذہن کا حامل۔

چھٹے ہاتھ کی درج ذیل دو اقسام ہوتی ہیں۔

☆ ملی جلی انگلیوں کے ساتھ بحری جہازوں، بڑا زمیندار، دریافٹوں کا شیدائی، انجینئر اور مکینک وغیرہ، خود پسند اور اپنی انا کے خول میں بند رہنے والا شخص۔

1-A: نیم ابتدائی ہاتھ (Low Initial Hand)



قدرے بے ڈھنگا، نفاست سے تھوڑا سا دور، جلد تھوڑی سی نرم، انگوٹھا قدرے متوازن، قدرے چھوٹی لکیروں کے ساتھ

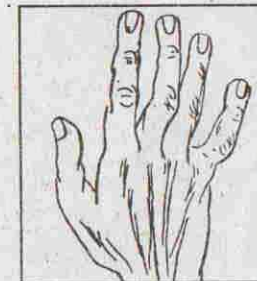
اصانیت، ابتدائی ہاتھ اور ترقی یافتہ حقیقی انسانی ہاتھ کی درمیانی کڑی۔

خصوصیات: ابتدائی ہاتھ والوں کی خصوصیت میں قدرے تبدیلی ہوتی ہے۔ ان میں جہالت کا مادہ قدرے کم ہوتا ہے۔ اچھائی اور برائی میں تمیز کر لیتے ہیں۔ عقل کا مادہ بھی ان میں قدرے موجود ہوتا ہے۔

3- چپٹا (چوڑا) یا بیضوی ہاتھ

(Flat or Spatulate Hand)

ایسا ہاتھ جو ٹکسن کلائی سے پھیلی کی جانب



برصورتی میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ پھیلی چوڑی اور جلد نرم ہوتی ہے۔ انگلیاں تیسری پور سے آگے کی

اقدار کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ حقیقی دنیا میں رہتے ہوئے بھی حقیقت سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ اپنی تخیل پسندی کے باعث بُرے لوگوں کے ہتھے جلد چڑھ جانے والے اور ان کی مکروہ خواہشات کی تسکین کا باعث ہوتے ہیں۔ ایسے ہاتھوں کی اکثریت عورتیں ہوتی ہیں۔ عموماً ایسے ہاتھ کو منخوس ہاتھ بھی خیال کیا جاتا ہے۔

خصوصیات: علم و ادب کا شائق، سکون پسند، شور و غل سے کوسوں دور بھاگنے والا، خاموشی پسند، عموماً طبیعت کا درویش، رسم و رواج سے نفرت نہ کھانے والا، مذہب سے کنارہ کشی نہ اختیار کرنے والا، عبادت کی طرف جھکاؤ رکھنے والا، چھپے ہوئے رازوں سے آگاہی پانے والا، حکیمانہ گفتگو کا حامل، دوسروں کو مشورہ دینے والا، فطرتاً دیندار، روحانیت میں کھویا ہوا، ہر قسم کی ظلم سازی اور عشوہ طرازی سے مسکور لوگوں کے دام خرب میں با آسانی آنے والا۔

نمایاں خصوصیات:

☆ جب دماغ کی لکیریں لمبی اور سیلیمانی رنگ نمایاں ہوں تو کیا گر اور علوم مخفی کا ماہر ہوتا ہے۔
☆ جب دماغ کی لکیر کے ساتھ مشتری کا ابھار اور شمس کی لکیر لمبی ہو تو سائنس میں بڑی ناموری پانے والا فرد ہوتا ہے۔

☆ جب دماغ کی لکیر کا جھکاؤ قمر کے ابھار کی جانب ہو تو بھرنے کو ترجیح دینے والا۔
☆ نرم ہاتھ اور پچیلے انگوٹھے کی صورت میں فلسفیانہ باتوں کا ماہر۔

☆ انگلیاں لمبی اور گرہ دار ہوں تو ذاکر، سوچ بڑی گہری اور پائیدار۔

☆ زہرہ کا ابھار نمایاں ہو تو غزل گو شاعر جس کا کلام پسند کیا جاتا ہے اور گلوکاران کا کلام بہت زیادہ گاتے ہیں۔

وہ ہاتھ جو کلائی کے جوڑ سے کم چوڑا یعنی بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔ اس ہاتھ میں کلائی سے اوپری طرف ہاتھ کی چوڑائی بڑھتی چلی جاتی ہے جبکہ دوسری قسم میں کلائی سے اوپر تک ہاتھ کی حالت یکساں ہوتی ہے۔
نمایاں خصوصیات:

☆ پیشوں کے لحاظ سے انجینئرنگ اور میکانیات کے شعبوں میں بے حد کامیاب، موجد، ہمہ وقت مصروف عمل، طبعاً بے چین اور پریشان رہنا، فارغ بیٹھنا بے حد مشکل کام، ایک جگہ تک کر رہنا ناممکن، خوبصورت گھر ان کی کمزوری، مسلسل سیروسیاحت، منزل مقصود کو جلد پانے کا خواہاں، مسلسل جدوجہد کرنے کا عادی، لکیر کا فقیر نہ بننا، قوت تخیل سے مسکور، متلون مزاج، ہر موضوع پر گفتگو کرنے کا ماہر، مصور۔

☆ دماغ اور شمس کی لکیریں زیادہ لمبی ہوں اور ناخن چھوٹے ہوں تو ہر کام تیز رفتاری سے انجام دینے والا۔

4- خیال پرست / نفسیاتی ہاتھ

(Imagine or Psychic Hand)



ایسا ہاتھ جو بنیاد پر بھاری، استخوانی، گوشہ دار اور انگلیوں کی جانب ہوتا ہے۔ یہ ہاتھ دیکھنے میں خوبصورت، نفیس اور قدرے تخیلی ہاتھ بھی کہلاتا ہے اور امیر و غریب ہر طبقے میں پایا جاتا ہے۔ ایسے ہاتھ والے افراد بہت زیادہ تخیل پسند بلکہ تصوراتی

☆ روحانی لکیر کا حامل اچھا نعت خواں، قوال۔
☆ زیادہ لمبائی کی صورت میں جلد قریب کے
جال میں پھسنے والا فرد، خطبات اور قرأت سے جلد
متاثر ہونے والا فرد۔

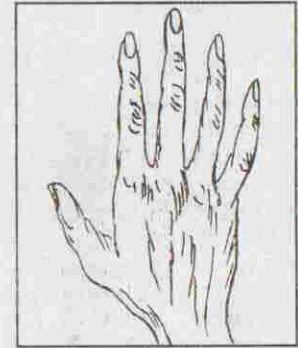
☆ خواتین مرد کی معمولی ہمدردی اور توجہ کا اثر
جلد قبول کر لینے والی ہوتی ہیں۔ اکثر عشق اور رومان
کے ہاتھوں دھوکہ کھانے والی، ایک کے بعد دوسرا
دھوکہ کھانے والی، دل اندر سے ٹوٹے ہوئے اور
منتشر خیالات اور بکھری ہوئی کیفیات کی حامل۔
☆ لومیرج کی قائل، دماغ کی بجائے دل کی
باتوں پر توجہ دینے والی۔

5- فلسفی ہاتھ:

(Philosopher Hand)

فلسفی ہاتھ زاویہ دار ہوتا ہے۔ یہ لمبا اور اگلیوں
کے درمیان زاویہ بناتا ہے۔ ناخن لمبے، اگلیوں کے
جوڑ بڑے ہوتے ہیں۔

خصوصیات: پراسرار علوم سے وابستگی رکھنے والا، عموماً
صوفی، پنڈت، پیر وغیرہ، خاموش طبع، دوسروں کے



راز کو راز
رکھنے والا،
جدوجہد کا
مادہ بے حد
زیادہ، علم و
فضل کے
شائق،
دولت سے
دور بھاگنے

والے، اپنی بے عزتی کو نہ بھولنے والے، مد مقابل
سے بات سوچ کر کرنے والے، جدت پسند، تخلیق
کار، کسی نہ کسی اختراع میں مصروف، عمدہ قسم کے

شاطر، مصنف وغیرہ، تجزیہ پسند، فن میں تجریدیت
رکھنے والے، ابہام پسند شاعر، ہمایلت کی آسودگی
کے حامل، دن میں خواب دیکھنے والے، مفکر، صدمہ
کو قوت برداشت سے ضبط کر جانے والے، اتانیت
پسند، روحانیت سے گہرا تعلق رکھنے والے، ہر شے
میں اسرار و رموز رو رکھنے والے۔

نمایاں خصوصیات:

☆ قسمت کی لکیر تیز اور ابھار شمس کی جانب ہو
تو بے حد کامیاب فرد ہوتا ہے۔
☆ زندگی میں بے حد ترقی کرنے والا۔

6- مخروطی ہاتھ (Conic Hand)

درمیانہ سائز کا ہاتھ، پھیلی سڈول، بناوٹ بڑی
خوبصورت، بڑا نازک اور طویل ہاتھ، انگلیاں
خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ نوکدار، ناخن بادام
کی شکل جیسے، خیال رکھنے والا فرد۔

خصوصیات: خوبصورت رنگوں، گیتوں، حسن اور
شاعری سے رغبت رکھنے والا، حسن پرست، ہر حسین
شے کی جانب فوراً توجہ مبذول کرنے والا، دل آویز

بات چیت
کرنے والا،
دل کو موہ
لینے والی
باتیں کرنے
والا، جذباتی
مناظر پر
آنسو بہانے
والا، لطافت



اور نفاست سے بھرپور، فنون لطیفہ کا دلدادہ، سن
موجی، جذباتی اور پر جوش طبیعت کا مالک، عیش
پسندی کے خیالات بالاتر، ماحول کا جلد اثر قبول کر

”ایکسپرٹ“

ایک مریض کلینک میں داخل ہوا اور اندر بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب ہیں؟ اندر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ ”فرمائیے..... میں ہی یہاں پریکٹس کرتا ہوں“..... ”مجھے پریکٹس کرنے والے نہیں بلکہ ایکسپرٹ ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“ یہ کہہ کر مریض چلا گیا۔

ہوتا ہے۔ اپنی ذاتی جدوجہد اور محنت کو بروئے کار لا کر اپنی قسمت خود بناتا ہے اور زندگی کے اسلوب کو ڈھالتا ہے۔ اس لیے مرد کی شخصیت اور قسمت جاننے کے لیے دایاں ہاتھ دیکھا جائے۔

عورت و مقابلہ مرد مجبور اور بے کس ہوتی ہے اور اکثر والدین کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ معاشرہ بھی اس کو آزادی کی اجازت نہیں دیتا اور شادی کے بعد عورت شوہر کی دست نگر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اپنی قسمت خود نہیں بنا سکتی اور اس کی قسمت کا زیادہ تر انحصار والدین اور بہن بھائیوں پر ہوتا ہے۔ ایسے میں عورت کی شخصیت اور کردار کو جانچنے کے لیے بایاں ہاتھ دیکھا جائے۔

لیکن کسی بھی حالت میں متبادل ہاتھ کو جانچنا نہ بھولا جائے کیونکہ بہت سی مردوں کی باتوں کا انحصار دوسرے ہاتھ کی پوشیدہ لکیروں میں ہوتا ہے۔

بچوں کے ہاتھوں میں چودہ سال کی عمر تک لگاتار تہہ بلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کا بایاں ہاتھ ہی ان کی جسمانی، ذہنی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ہوتی ہیں۔ ایسی شخصیت گونا گوں صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے۔

خصوصیات: موسم کی طرح رنگ بدل طبیعت کے مالک، اپنا ہر پروگرام تبدیل کرنے والے۔ ان کا کوئی پلان کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچتا، زندگی بھر تیز رفتار لوگوں کے ساتھ بھاگنے والے مگر تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے رک جاتے والے، نئی راہ پر چلنے کا ارادہ اور منصوبہ تیار کرنے والے، اپنی بات کا یقین نہ کروانے والے، غیر خوشگوار گھریلو زندگی کے حامل، بیوی بچوں اور دوست احباب میں اہمیت نہ پانے والے، کسی بھی فن میں ترقی نہ کرنے والے، ہر فن مولانا، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے میں مگن، بلند خیالی سے مبرا، قدرے سگی، امین الوقت، موقع شناس، ڈپلومیٹ، رہائش گاہ اور شہر جلد تبدیل کرنے والے۔

نمایاں خصوصیات:
☆ اگر دماغ اور شمس کی لکیر لمبی ہو تو قدرے بہتر زندگی گزارنے والے۔
☆ مٹی جلی انگلیاں ناکامی کی واضح علامت۔
☆ اگر سر کی لکیر مضبوط ہو تو کسی بھی کام میں مہارت کے حامل۔

☆ سفید رنگت والی پھیلی کی صورت میں اپنے خیال میں مست رہنے والے۔
☆ زہرہ پر ابھار، ستارہ، لکیر، ترشول، جزیرہ یا کسی اور شکل کی صورت میں جرم کا ارتکاب کرنے کے خیال کا حامل۔

مرد اور عورت کے ہاتھ میں فرق

(Difference between Man & Woman's Hand)

مرد اور عورت کے ہاتھ میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ مرد خود مختار اور ذمہ دار شخصیت کا آئینہ دار

ادائیں رکھنے والیاں، مردوں کو پسند، وفادار۔
☆ زندگی اور دماغ کی لکیریں باہم ملی ہوں تو دیندار اور بار بار رنج کی سعادت حاصل کرنے والی۔
☆ زندگی اور دماغ کی لکیر الگ الگ ہو تو فیشن پرست۔

☆ سیاست میں ایماندار، کسی کو دھوکہ نہ دینے والا، خود فریب کھانے والا اور خاموشی سے برداشت کرنے والا۔

مرکب یا مخلوط ہاتھ

(Compound Hand)

اکثر افراد کے ہاتھ مرکب یا مخلوط ہوتے ہیں



بعض ایسے ہاتھوں میں مخروطی، مربع، چھٹی ہاتھوں کی علامات پائی جاتی ہیں۔ ان میں کسی ہاتھ کی انگلی مربع، مخروطی یا چھٹی ہوتی

ہیں۔ پھیلی بھی کچھ ابتدائی، تھوڑی سی مربع یا چھٹی ہو سکتی ہے۔ انگوٹھا ابتدائی، مربع یا نوکدار ہو سکتا ہے۔ ایسے ہاتھ کی کوئی کلی یکساں نہیں ہوتی۔ انگوٹھا اور انگلیاں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی بھی شے میں کبھی مناسبت نہیں پائی جاتی کوئی انگلی نیچے سے تو کوئی سیدھی، کوئی موٹی سے تو کوئی پتلی، کوئی نوکدار ہے تو کوئی چھٹی یا مربع، اگر پھیلی ہمارے ہاتھ تو انگلیاں غیر مناسب ہیں۔

ایسے ہاتھ میں علامات بھی منفرد اور مشروط قسم کی

لینے والا، انتہا پسند، جلد غصے میں آ جانے والا، معمولی سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لینے والا، توقعات پوری نہ ہونے کی صورت میں دلبرداشتہ ہو جانے والا، معمولی بے توجہی سے دل ٹوٹ جاتا ہے، جلد پر امید ہو جانے والا، جلد ہی ناامید ہو جانے والا، زندگی میں سینکڑوں مرتبہ دھوکہ کھانے والا، عشق رومان، جسمانی عیاشی میں جلد مبتلا ہو جانے والا، دل کا برا نہ ہونا، رحم دل اور ہمدرد، ظلم سے کوسوں دور بھاگنے والا، دولت اور شہرت نمایاں کمزوری اور اس کی تلاش میں سرگرداں، ناقابلِ بھروسہ، جذباتی صدمات پہنچنے والا، نازک دل، خود غرض تصوراتی علوم میں دسترس رکھنے والا، گفتار کا غازی، زندگی کی دوڑ میں ثابت قدمی کا فقدان، معاملات کی تفصیلات سے کئی کترانے والا، وجدان کا حامل، حساس طبیعت، اولین تاثرات کو قطعی جاننے والا، کمزور صحت کا مالک، آخر عمر میں نری کی طرف مائل، آرٹ کا دلدادہ، عمدہ لباس اور اعلیٰ رہائش پسند۔

نمایاں خصوصیات:
☆ دماغ کی لکیر لمبی ہو تو مصوری، فائن آرٹس اور موسیقی سے لگاؤ رکھنے والا۔
☆ شمس کی لکیر لمبی اور واضح ہو تو آرٹس اور موسیقار۔

☆ چکدار انگوٹھا، ہاتھ نرم ہو تو تصوراتی۔
☆ زہرہ کا ابھار نمایاں ہو تو لافانی محبت کرنے والا۔
☆ مشتری کا ابھار نمایاں ہو تو بہترین منظر نگار اور بڑا نام پیدا کرنے والا۔

☆ اپنے پیشے میں بہت زیادہ فہم کھ، لوگوں سے بہت اچھا سلوک کرنے والا اور گاہکوں کا دل موہ لینے والا، پیاری پیاری نظمیں اور گیت لکھنے والا شاعر۔

☆ عورتیں نازک بدن، نازک مزاج، مثالی

روایات میں ہے کہ آپ ﷺ کے پاس سات زرہیں تھیں۔

(1) آپ ﷺ کی ایک زرہ کا نام ”ذات الفصول“ تھا۔ جب آنحضرت ﷺ غزوہ بدر کے لیے تشریف لے جانے لگے تو حضرت سعد بن عبادہ نے یہ زرہ آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجی تھی۔ یہ لوہے کی تھی۔ یہی وہ زرہ تھی جسے آنحضرت ﷺ نے تیس صاع جو کے بدلے میں اوحم یہودی کے پاس رہن رکھا تھا۔ یہ قرض ایک سال کے لیے تھا۔
(2) ایک زرہ کا نام ”ذات الوشاغ“ تھا۔
(3) ایک کا نام ”ذات الخواشی“ تھا۔

(4) ایک کا نام ”السفریہ“ تھا۔ السفر ایک مقام کا نام تھا۔ جہاں زرہیں تیار کی جاتی تھیں۔ بعض مورخین کے نزدیک اس مقام کا نام ”السفریہ“ تھا۔
(5) ایک کا نام ”الفعمہ“ تھا۔ یہ قبیلہ قبیعہ کی زرہ تھی۔

(6) ایک کا نام ”الحجراء“ تھا۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا تھا کہ زرہ چھوٹی تھی۔
(7) ایک زرہ کا نام ”الحراقی“ تھا۔ یہ نام اس کی نرمی و نزاکت کی بنا پر رکھا گیا تھا۔

تکواریں

آپ ﷺ کے پاس کل 9 تکواریں تھیں۔

(1) ”القضب“ یعنی کاٹ کرنے والی۔

(2) ”حیف“ یعنی موت۔

(3) ”ماثور“..... یہ تکوار آپ ﷺ کے والد

گرامی جناب حضرت عبداللہ کی تھی اور آپ ﷺ کو ورثہ میں ملی تھی۔ جب آپ ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تھے تو یہ تکوار آپ ﷺ کے پاس تھی۔

(4) ایک کا نام ”العصب“ یعنی کانٹے والی تھا۔ جب آنحضرت ﷺ غزوہ بدر کے لیے تشریف لے چلے تو حضرت سعد بن عبادہ نے یہ تکوار آپ ﷺ کی

سے لی تھی۔

(2) ایک کمان کا نام ”الروحاء“ تھا۔

(3) تیسری کمان کا نام ”اصفرأ“ تھا۔ یہ مشہور درخت بیج کی لکڑی سے بنائی گئی تھی۔ کمانیں اور تیر بھی اسی درخت کی شاخوں سے تراشے جاتے تھے۔ یہ کمان غزوہ احد میں ٹوٹ گئی تھی۔

(4) ایک کمان کا نام ”الزورأ“ تھا۔ اسے ”الزورأ“ بھی کہا جاتا تھا کیونکہ جب اس کمان سے تیر پھینکا جاتا تھا تو یہ بہت کم آواز دیتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہی وہ کمان تھی جس کا ایک سرا جنگ احد میں چل کر ٹوٹ گیا تھا۔

(5) ایک کمان کا نام ”اسداد“ تھا۔

ڈھالیں

(1) آپ ﷺ کی ایک ڈھال کا نام ”الارواق“ تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اس پر سے ہتھیار پھسل جایا کرتے تھے۔

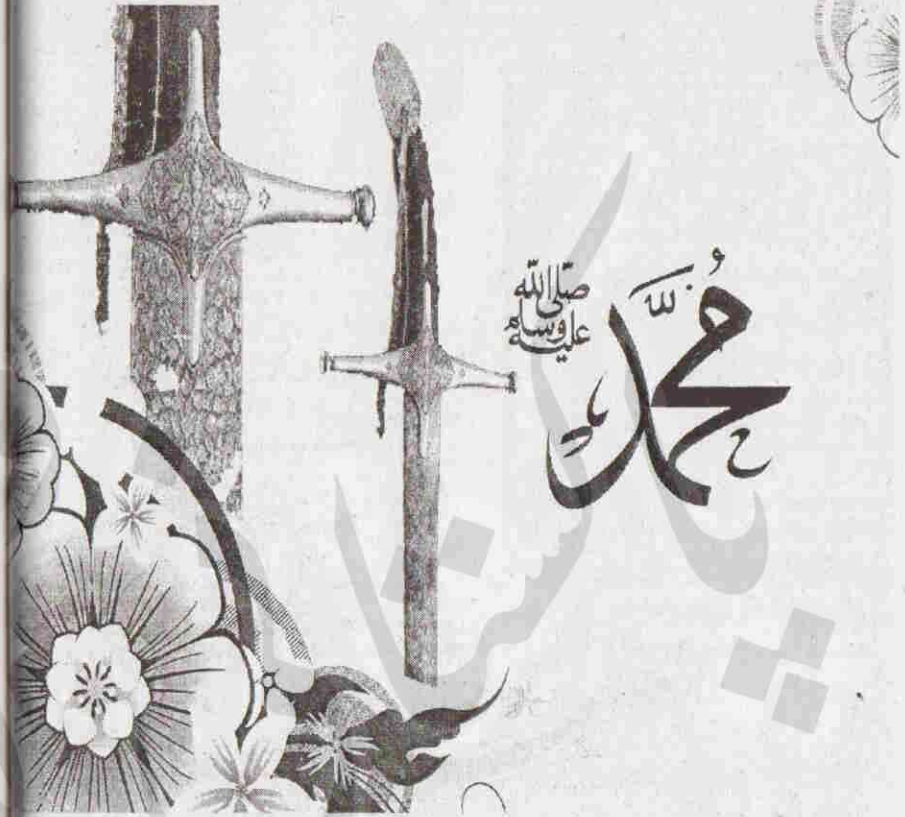
(2) ایک کا نام ”فقی“ تھا۔

(3) ایک زرہ پچھو یا مینڈھے کی صورت کی تھی۔ یہ آنحضرت ﷺ کو پسند نہ آئی۔ اس لیے اللہ نے اسے غائب ہی کر دیا۔ ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے اس پر دست مبارک رکھا ہی تھا کہ غائب ہوگئی۔

نیزے

آپ ﷺ کے پاس دو نیزے تھے۔ ایک ”الہموئی“ تھا۔ یہ لفظ ٹوٹی سے شق تھا جس کے معنی ہیں شکار قائم رکھنے والا۔ یہ نیزہ چونکہ شکار کو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرنے دیتا تھا اس لیے اس کا نام ہموئی پڑ گیا جبکہ دوسرے نیزے کا نام ”الہمشی“ تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ کے پاس سات نیزے تھے۔

زورہیں



رانا محمد شاہد

نبی کریم ﷺ کے زیر استعمال اسلحہ

وہ ہتھیار جو مختلف جنگوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر استعمال رہے!

تکواریں تھیں۔ ان سب کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

کمانیں

(1) آپ ﷺ کے پاس ایک کمان کا نام ”البجاء“ تھا۔ یہ کمان ایک پہاڑی درخت کی لکڑی سے بنائی گئی تھی۔ اکثر کمانیں اسی درخت سے بنائی جاتی تھیں۔ آپ ﷺ کو یہ کمان بنو قبیعہ کے اسلحہ

2 ہجری میں بدر کے میدان میں اسلام اور کفر کے درمیان پہلا معرکہ ہوا۔ 3 ہجری میں غزوہ احد پیش آیا۔ اس کے بعد ہر غزوہ میں آپ ﷺ نے اسلحہ جنگ استعمال فرمایا۔ سرکار دو عالم ﷺ کے پاس پانچ کمانیں، تین ڈھالیں، دو نیزے، پانچ حربے، سات زرہیں اور دو خودوں کے ساتھ نو

”خود جلیں دیدہ اغیار کو مینا کر دیں“



husain.8@hotmail.com

قائد حسین سید سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جا رہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سید نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیا تھ ساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جبینی مٹھاس، لیوں کی گھٹاس، کوڑ تما کی کڑواہٹ اور زہر ہلال کی آمیزش ہے۔ !!

مشعل راہ

☆..... عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنا مشکل ہے مگر عورت کے بغیر زندگی بسر کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔
☆..... کبھی اپنے دوست کی سچائی کا امتحان نہ لو۔ کیا پتہ اس وقت وہ مجبور ہو اور تم ”غلط فہمی“ میں ایک اچھا دوست کھو بیٹھو۔
☆..... ماہرین نفسیات اعصاب کی تقویت کے لیے دو آوازوں کو اہم قرار دیتے ہیں، ان میں ایک آواز پہاڑی علاقوں میں موجود چشموں اور ندی نالوں سے بہتے پانی کی اور دوسری پرندوں کی چہچہات کی آواز ہے۔
☆..... مسلم حکمران عوام کے خلاف ہتھیار استعمال

☆..... ”عورتوں سے حسن معاشرت سے پیش آؤ“ (القرآن)
☆..... ”انسان کی سمجھ داری یہ ہے کہ وہ کفایت شعار ہو“ (حضرت محمد ﷺ)
☆..... انسانی زندگی دنیا میں اس شمع کی مانند ہے جو ہوا میں رکھی گئی ہو۔
☆..... تین آدمیوں میں راز، راز رہ سکتا ہے بشرطیکہ ان میں سے دوسرے چکے ہوں۔
☆..... طلوعِ سحر سے پہلے ہمیشہ اندھیرا ہوتا ہے۔
☆..... اگر فیشن کی سرپرستی عورت نہ کرتی تو ہزاروں روزی بھوکے مر جاتے۔

☆☆ بیش قیمت پھول ☆☆

☆☆ ادب ہی قرآن کا حافظ ہوتا ہے، جس نے قرآن کا ادب کیا وہی اس کا حافظ ہے۔ اگر ادب نہ ہو تو سینے سے قرآن صاف ہو جائے گا۔
☆ فانی کی محبت فنا پیدا کر دے گی، باقی کی محبت بقاء پیدا کر دے گی۔ فانی کی محبت دل سے نکال دو تاکہ آپ کو بقاء کا راستہ ملے۔
☆ اللہ تعالیٰ کا تقرب جنت ہے اور اللہ تعالیٰ سے دوری دوزخ ہے، عشق نبی ﷺ جنت ہے اور عشق نبی ﷺ سے دوری دوزخ ہے۔
☆ جب موت سے پہلے موت کا مقام سمجھ آ جائے تو موت کے بعد ملنے والے انعام موت سے پہلے ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔
☆ اگر تیری نسبت باقی کے ساتھ ہو گئی تو باقی ہو جائے گا۔ اب تیری نسبت فانی کے ساتھ ہے، اس لیے تو فانی ہے۔ فنا سے نسبت اٹھا کر بقاء میں لگا دے تو سب آسان ہو جائے گا۔
☆ چور ضرورت کا نام ہے، بندہ اندر سے برائیاں ہوتا۔ ضرورت برا کرتی ہے اور ضرورت ہی نیک کرتی ہے۔ ضرورت نکال دو، بندہ ٹھیک۔
☆☆☆

خدمت میں پیش کی تھی۔

وزنی تلوار تھی اور اپنی نوک بلیک کے لحاظ سے انفرادی حیثیت رکھتی تھی۔ پھر آنحضرت ﷺ نے یہ تلوار حضرت خالد بن سعید کو یمن کا گورنر مقرر فرماتے وقت بطور ہدیہ عطا فرمادی تھی۔
(7) ایک کا نام ”القلبی“ تھا۔ قلبی، صحرا میں ایک مقام کا نام تھا یعنی کہ یہ اس مقام ”برج قلعة“ کی طرف منسوب تھی۔
(8) ایک کا نام ”الرسوب“ تھا، یعنی اندر دھنس جانے والی، یہ ان 9 تلواروں میں سے ایک تھی جنہیں ملکہ بلقیس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں تحفہ بھیجا تھا۔
(9) ایک کا نام ”الخدم“ (مخدوم) تھا یعنی کاٹنے والی۔ یہ تلوار قبیلہ طے کے بت ”علس“ نامی پر لٹکتی رہتی تھی۔
”خود“ (فولادی، ہیلمٹ)
”خود“ خودہ کے جمع ہیں۔ یہ لوہے کی بنی ہوئی سر کی ٹوٹی ہوئی ہے جسے جنگ میں اوڑھا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے دو ”خود“ تھے۔ ایک کا نام مورخ تھا اور دوسرے کا نام ”السیوح“ یا ذات السیوح تھا۔

حربے

یہ تعداد میں پانچ تھے۔ حربہ دراصل چھوٹے نیزے، بالے یا برجھی کو کہا جاتا ہے۔ اہل عرب میں یہ حربے ہی کہلاتا تھا۔ آپ ﷺ کے پاس جو حربے تھے۔ ان میں نمر، نمبہ، بصر، بیضاء اور عزنہ تھے۔ ان میں سے عزنہ کو زیادہ شہرت ملی۔ یہ حربہ حبشہ سے حضرت زبیر بن العوام لائے تھے اور بدر کے میدان میں حضرت زبیر نے اسی سے مشہور مشرک بوکرش کو ہلاک کیا تھا جس سے اس کا پھل ٹیزھا ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ نے یہ حربہ بعد میں حضرت زبیر سے لے لیا تھا اور یہ آپ ﷺ کے پاس رہتا تھا۔

(5) ایک کا نام ”ذوالفقار“ تھا۔ یہ تلوار آپ ﷺ کو بدر کے میدان سے مالِ غنیمت میں ملی تھی۔ یہ تلوار عاص بن وائل کی ملکیت تھی۔ اس تلوار کا درمیانی حصہ بڑھکی ہڈی کی مانند تھا۔ یہ تلوار ہر جنگ میں آپ ﷺ کے ساتھ رہتی تھی۔
(6) ایک کا نام مصمام تھا۔ یہ تلوار عمرو بن سعد کی تھی جو آپ ﷺ کو ملی تھی۔ یہ بڑی تیز دھار اور

کرنے کی بجائے مسائل حل کریں۔ (خطبہ حج مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز)
☆.....خلیل جبران کہتا ہے کہ میں کبھی لاجواب نہیں ہوا مگر اس سے جس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟

☆☆☆

دو عالمی دن

اسلامی سال کا ۱۰ ذوالحجہ اور ۱۰ محرم الحرام کا دن دراصل خواتین اسلام کے دو عالمی دن ہیں اور یہ کتنی پرسوز حقیقت ہے کہ جس داستان کا آغاز مکہ مکرمہ کی بے آب و گیاہ ذی ذراع وادی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ بی بی حاجرہ بیسی معظم خاتون کے اپنے معصوم بچے کی خاطر پانی کی تلاش کرنے کے منظر سے ہوا تھا اس کا انجام خاتون جنت دختر رسول ﷺ کی گود میں پلے اور تربیت پانے والے، دریائے فرات کے کنارے کھڑے حضرت امام حسین علیہ السلام کے اپنے معصوم بیٹے کے لیے افواج یزید سے دریائے فرات کے پانی کے حق کی طلب کے منظر پر ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کی سلطنت میں دریائے فرات کے کنارے واقع کلدانی شہر ”عز“ سے اختصار پسندوں کے ہاتھوں تک آ کر ترک وطن کر کے دریائے فرات کے کنارے ڈیرے ڈالے تھے گویا اسلام کا قافلہ اپنے تحفظ کے لیے کنارہ فرات سے چل کر ایک بار پھر لب فرات آ پہنچا۔ جوش ملیح آبادی کہتے ہیں۔

شامیانہ حسین اعظم (علیہ السلام) کا آج بھی نصب ہے فرات کنارے حضور اکرم ﷺ کی حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ اسلام کا مہدی اصلاح احوال کے لیے دمشق کے شہر سے ظاہر ہوگا۔ یہ وہی دمشق تو ہے جو کبھی شام کہلاتا تھا۔ جہاں دربار یزید میں شہید کر بلا

حضرت امام حسین (علیہ السلام) کا سر مبارک پیش کیا گیا۔ یہ وہی دمشق تو ہے جس کے پچھواڑے کوہ بسان کے پار بیروت کے سامنے مشرق کی طرف دامن کوہ کے مقام زینبیہ پر خاتون جنت کی گود میں پٹی حضرت زینب بنت علی (رضی اللہ عنہا) کو خواب ہیں۔ جنہوں نے کوہ و شام کے بازاروں میں ننگے سر عوام الناس کو اختصار پسندوں کے ہاتھوں اسلام کے قلعہ کو مسمار کرنے کی کوششوں کے آغاز اور اسلامی اقتدار کو لاحق خطرہ سے آگاہ کیا تھا۔ حج ہی تو ہے کہ گم کردہ اسلامی اقتدار کی تلاش نو کا آغاز اسی مقام ہی سے ہونا چاہیے جہاں ہم ان کو پہلی بار گم کر بیٹھے تھے۔ یہ وہی دمشق تو ہے جو آج بھی اقوام عالم کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ صیہونیت، اشتیالیت، عیسائیت اور سامراجیت کی توجہ کا مرکز بھی ہے۔

(سید نور علی ضامن حسینی کے مضمون سے اقتباس)

☆☆☆

گولڈن ایج

تقریباً دس برس کی بات ہے کہ اسٹرا لوجی پڑھتے ہوئے مجھے پتہ چلا کہ مغرب کے ماہر فلکیات ایک گولڈن ایج کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ”ارے یہ گولڈن ایج کیا چیز ہے؟“ میں نے سوچا۔ معلومات حاصل کرنے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ مغربی ماہر نجوم اس بات پر متفق ہیں کہ کرہ زمین پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جب زمین پر اطمینان، سکون اور امن کا دور دورہ ہوگا۔ نہ جنگ و جدل ہو گی نہ لڑائی جھگڑے، بس امن ہی امن ہوگا۔ شرف ختم ہو جائے گا، خیر ہی خیر ہو جائے گی۔

ان مشاہیر کا کہنا ہے کہ کرہ زمین پر ایسے ایسے اور اتنے سارے مثبت اور مبارک سیاروں اور ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے جو آج تک کبھی نہیں ہوا۔ ان سیاروں اور ستاروں کا اثر سارے کرہ

زمین پر پڑے گا اور یہ اثر اتنا صاف اور مبارک ہوگا کہ انسان کی زندگی بدل جائے گی۔ ان کا کہنا ہے کہ تاروں کے یہ جھرمٹ کئی ایک سالوں سے زمین کی جانب بڑھ رہے ہیں اور 1980ء میں ان کا اجتماع مکمل ہو جائے گا اور دنیا پر اثر انداز ہونا شروع ہوگا۔

اس تفصیل کو جاننے کے بعد ایک اور بات میرے ذہن میں گونجی۔ 1980 عیسوی کا مطلب ہجری کی پندرہویں صدی کی ابتدا ہوئی۔ بچپن میں سنتا آیا تھا کہ چودھویں صدی میں حد ہو جائے گی۔ بے حجابی کی حد، لادینیت کی حد، ہر بات کی حد، میں نے پندرہویں صدی کی بات کبھی نہیں سنی تھی۔ تو کیا ہجری کی پندرہویں صدی میں حدیں ٹوٹ کر نئی زندگی شروع ہونے والی ہے؟

ہر مذہب کے لوگ نشاۃ ثانیہ پر ایمان رکھتے ہیں اور بڑی بے تابی سے اس کے منتظر ہیں۔ عیسائیوں کو یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ یہودیوں کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ سارے وعدے پورے کرے گا جو اس نے بنی اسرائیل سے کئے تھے۔ ہندو رام راجیہ کے منتظر ہیں۔ مسلمان حضرت امام مہدی کے دور پر ایمان رکھتے ہیں۔

رہا سائنس کا دور تو یہ جدید سائنس خود اس خیال کی حامی ہے کہ ہم ایک نیا موڑ مڑنے والے ہیں۔ ہمارے سامنے نئی نئی کھڑکیاں کھلتی جا رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سپیس ہم پر حیران کن حقائق کا راز کھولنے کے لیے بے تاب ہے۔ کیا پتہ کب حقیقت کل سپیس (Space) کی کھڑکی سے جھانک کر ہمیں کائنات کا راز بتا دے۔

برٹینڈر رسل نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کہا تھا: ”میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے وہ سب

باتیں کہہ ڈالوں جو میرے دل کی گہرائیوں میں چلتی ہیں لیکن جنہیں میں نے نہیں پایا۔ جو جذبات سے نہیں بلکہ زندگی کے اس جھوٹے سے تعلق رکھتی ہیں جو دور دراز کے کسی بے نام مقام سے آتا ہے اور ہم انسانوں کی زندگی کو عظیم خوف سے بھر دیتا ہے اور غیر انسانی مخلوق کی بے رحم اور بے انتہا طاقت کی خبر دیتا ہے۔“ ڈی چادر ڈن کا کہنا ہے کہ ”کالمک قدروں کے حوالے سے جدید فرس ہمیں یہ سبق پڑھاتا ہے کہ صرف محیر العقول ہی سچائی کے قریب ہو سکتا ہے۔“

بے بی ایس ہالڈین کہتا ہے کہ ”صرف یہی نہیں کہ حقیقت ہمارے اندازے سے زیادہ محیر العقول ہے بلکہ اس قدر محیر العقول ہے کہ ہمارا خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔“

نیوکلیائی طبیعیات کے ماہر چارلس مارٹن کا کہنا ہے کہ ”جدید سائنسی تحقیق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کا سائنسی علم روایتی سائنس کے خطوط پر نہیں چلے گا۔ آئناہ ان تصورات پر مبنی ہوگا جنہیں ہم اس وقت ناقابل قبول سمجھتے ہیں۔“

لوی پاول کا کہنا ہے: نئے سائنسی حقائق ابھی چند خواص تک محدود ہیں۔ اگر وہ انہیں ظاہر کر دیں گے تو لوگ انہیں پاگل سمجھیں گے۔

لوی پاول اور جیمسن برجر اپنی کتاب ”امپا بل پاسی بلی ٹیز“ (Impossible Possibilities) میں ان کھڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو آج سپیس (Space) کے افق پر کھل رہی ہیں نشاۃ ثانیہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جس طرح سوہویں صدی میں احیائے علم کا دور شروع ہوا تھا اسی طرح آج ہم ایک نئے احیائے علم حقیقت کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ آج ہومینک کلچر کی بنیادیں لڑکھڑا رہی ہیں۔ انیسویں صدی کا علم دم توڑ

گھروں کا آغاز ہو گیا۔

ہندوستان میں شہنشاہ جہانگیر کو جانور اور پرندے جمع کرنے کا شوق تھا لیکن وہ عجیب خلق جانور اور پرندے جمع کرتا تھا یعنی حیرت انگیز طور پر مہیب شیر، ایسا پرندہ جو رات بھر اٹا لنگ کر چہچہاتا، ایسا کبرا جو دودھ بھی دیتا تھا۔ ان پرندوں اور جانوروں کی تعداد سینکڑوں میں تھی اور اس کا ذکر تفصیل سے جہانگیر نے اپنی کتاب ”تزک جہانگیری“ میں کیا ہے لیکن جدید طرز کے چڑیا گھر انگریزوں نے ہندوستان کے بڑے شہروں میں بنائے۔ جن میں لاہور کا چڑیا گھر ایک سو برس سے زیادہ پرانا ہے۔ لاہور کے علاوہ کراچی کا چڑیا گھر بھی معیاری ہے جبکہ کئی چھوٹے چڑیا گھر ملک کے بعض دیگر شہروں میں بھی ہیں۔

(ڈاکٹر عرفان احمد بیک کا کالم ”نئی چڑیا گھر“)

جنگلی میگزین ڈاٹ کام سے اقتباس)

☆☆☆

”شہاب نامہ“ کی حقیقت

(عرفان احمد خاں کی کتاب سے اقتباس)

شہاب نامہ کے 17 ویں باب ”صلہ شہید“ میں قدرت اللہ شہاب فرماتے ہیں: 16 اکتوبر 1951ء کی شام چارنج کر چھ منٹ پر راولپنڈی کے جلسہ عام میں کوئی چلی۔ قائد ملت لیاقت علی خاں نے جام شہادت نوش کیا اور بطور قاتل سید اکبر کو گولی مار کر تحقیقات کا دروازہ بند کر دیا گیا (جبکہ سید اکبر اپنے بیٹے کے ساتھ جلسہ سننے آیا تھا۔ کوئی قاتل اپنے بیٹے کو ساتھ لیے نہیں آتا)۔

قدرت اللہ شہاب کا یہ بیان اس دور کی بیوروکریسی کی جانب سے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی ایک کوشش ہے لیکن شہاب صاحب اکتوبر 1951ء میں نہ سکی، بعد میں یقیناً اس قاتل رہے کہ اس مملاتی سازش کو بے نقاب کر سکتے تھے۔

احترام کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

(ارو پوائنٹ ڈاٹ کام سے اقتباس)

☆☆☆

چڑیا گھر

چڑیا گھر کا پس منظر یا تاریخی حوالہ دیکھیں تو 2009ء میں، مصر میں آثار قدیمہ کی کھدائی سے ماہرین نے یہ دریافت کیا کہ یہاں ہیرکونپولس (Hier Konpolis) میں 3000 سال قبل مسیح یعنی آج سے پانچ ہزار سال پہلے چڑیا گھر تھا۔ دو ہزار سال قبل مسیح میں چین کے بادشاہ تانگی (Tangki) نے ہاؤس آف ڈیئر (House of Deer) کے نام سے چڑیا گھر بنایا تھا۔ دو صدی قبل مسیح بادشاہ وینوفزو (King Wenofzou) نے 1500 ایکڑ پر چڑیا گھر بنایا۔ سکندر اعظم نے یونان میں چڑیا گھر متعارف کروایا جس کے لیے اس کے فوجی دنیا کے مختلف علاقوں سے جانور لائے۔

روم میں بادشاہوں کو شیر، چیتے، ہاتھی، جنگلی بھینے اور گینڈے رکھنے کا شوق تھا اور وہ ان کے تماشے سٹیڈیم میں کرواتے تھے لیکن جب روم میں ظالم ترین بادشاہ، نیرو بادشاہ بنا تو اس نے ظلم کی حد کر دی۔ نیرو نے پانچ ہزار شیر، چیتے، ہاتھی، جنگلی تیل اور بھینے جمع کئے۔ وہ ان درندوں کے سامنے قیدیوں کو ڈال دیتا اور خود امراء کے ساتھ تماشا دیکھتا۔ برطانیہ میں ہنری اول نے جانور جمع کئے جن میں شیر، چیتے اور اونٹ شامل تھے۔ ٹاور آف انگلینڈ کے قریب 1204ء میں بادشاہ جان اول نے چڑیا گھر بنایا جو وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا چلا گیا۔ 16 ویں صدی میں ملکہ الیزبت اول نے چڑیا گھر کو لندن زد میں منتقل کر کے اسے عوام کی تفریح کے لیے کھول دیا اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے دوسرے ملکوں میں عوامی تفریح کے لیے چڑیا

ورنہ ان کی زندگی بھی خوشگوار نہ ہوتی۔

☆☆☆

ایک اچھا انسان

کچھ دن قبل میں نے اپنے ایک دوست کے والد سے پوچھا کہ وہ اپنے بیٹے کو مستقبل میں کیا بنانا پسند کریں گے تو انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ میں اپنے بیٹے کو ایک اچھا انسان بنانے کی کوشش کروں گا۔ ان کے اس جواب سے میرے ذہن میں متعدد سوالات نے جنم لیا۔ میں سوچنے لگ گیا کہ آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ کیا آج ہر باپ اپنے بیٹے کے بارے میں یہی سوچ رہا ہے؟ یقیناً نہیں کیونکہ اس طرف کسی کا خیال ہی نہیں جاتا۔ صرف یہی خیال جاتا ہے کہ وہ افسر بنے، ڈاکٹر بنے یا انجینئر۔ دنیا میں سب سے مشکل کام ایک اچھا انسان بنانا ہے۔ باقی دنیا کے سب کام آسان ہیں۔

ایک اچھا انسان ہی ایک اچھا شہری کہلائے گا اور اپنے معاشرے کے لیے بہترین ثابت ہوگا مگر ہم میں آج پتہ نہیں اچھائی کہاں گم ہو گئی ہے؟ بڑی بڑی نامور ڈگریوں کے باوجود آج ہم شخصیت کی تعلیم سے محروم ہیں۔ مغربی کلچر کے دلدادہ اپنی عظیم ثقافت کو پامال کر چکے ہیں۔ اگر کسی کو اپنی ثقافت کی مثال دیں تو وہ سمجھتا ہے شاید اس سے مذاق کیا ہے۔ ہم آج بناوٹی دنیا کے عادی ہو چکے ہیں۔ مفاد کے لیے خلوص کا پیکر بن جاتے ہیں۔ تنقید کے اوزار لیے دوسروں پر چڑھ دوڑتے ہیں مگر خود اپنی خامیوں پر نگاہ رکھنا پسند نہیں کرتے۔ لوگوں میں امتیاز پیدا کرنا ہمارا شیوہ بن چکا ہے۔ جو بڑا ہے اس کی عزت بھی اتنی بڑی ہے جو چھوٹا ہے اس کی عزت بھی اس کی حیثیت کے مطابق چھوٹی ہے۔ رشتوں کا

رہا ہے۔ آج ہم کا ساس (Cosmos) میں ایک نئی سمت کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ کل تک روایتی علوم کی جن حدوں نے ہمیں جکڑ رکھا تھا آج ہم وہ حدیں توڑ رہے ہیں۔ ہم میں ایک نئی بیداری کروٹ لے رہی ہے۔ ہم حیران کن حقائق کی طرف رواں دواں ہیں جہاں بعید از امکان امکانات نظر آتے ہیں جن کے تحت انسانی ذہن میں ایک عمیق اور عظیم انقلاب آنے والا ہے جس کے زیر اثر انسانی ذہن میں تخلیق کے عظیم راز کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ آئیے ہم سب انسان کے اس نئے جنم کا انتظار کریں۔

(”رام دین“ ممتاز مفتی کی کتاب سے اقتباس)

☆☆☆

آسمانی تحفہ

مرد ساری عمر عورتوں ہی میں گھرا رہتا ہے۔ عورت کبھی ماں، کبھی بہن، کبھی بیوی اور کبھی بیٹی کے روپ میں اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اگر کوئی شخص شادی نہیں کرتا تو بھی اسے مشہور انگریزی شاعر ورڈز ورثہ کی طرح بہن کی رفاقت میں زندگی بسر کرنی پڑے گی یا مشہور فلاسفر برٹ پنر کی طرح اپنے گھر کی نوکرائی کا دست نگر رہنا پڑے گا۔ عورت بہت اچھا آسمانی تحفہ ہے۔

☆☆☆

تین عنایتیں

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر تین عنایتیں کیں:

(1) گندم اور اناج میں کیڑے پیدا کر دیئے ورنہ انسان اسے سونا اور چاندی کی طرح ذخیرہ کر لیتا اور لوگ بھوکے مر جاتے۔

(2) موت کے بعد مردے کے جسم میں بدبو پیدا کر دی ورنہ وہ اپنے پیاروں کو دفن نہ کرتا۔

(3) مصیبت کے بعد لوگوں کو صبر و سکون دیا

ایسا ہے جس سے بچ کر چلے یعنی ”ایوب خاں کے جنسی سکیٹل“ لہذا بیگم ناہید سکندر مرزا اور جنرل ایوب خاں کے ”خوشگوار“ تعلقات کے بارے میں ”شہاب نامہ“ خاموش ہے۔ اس طرح برطانوی وزیر جنگ پروفو مو کو معزول کروانے والی مشہور کال گرل کرشناں کیلر کے ساتھ جنرل ایوب خاں کا ایک سوئمنگ پول میں غسل فرمانے کا واقعہ شہاب صاحب کو بھول گیا جبکہ یہ واقعہ برطانیہ کے وزیر جنگ جان پروفو مو، مینڈی رائس ڈیوس اور کرشناں کیلر کے جنسی سکیٹل کے حوالے سے ایک مدت تک عالمی اخبارات کا موضوع رہا۔ اس دوران پاکستان کا ہر اخبار کرشناں کیلر اور ایوب خاں کے ایک ہی سوئمنگ پول میں اکٹھے نہانے کا معاملہ زیر بحث لایا۔ کرشناں کیلر کا ایک بیان پاکستانی عوام کے لیے بم بلاسٹ ثابت ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ایوب خاں نے سوئمنگ پول میں نہاتے ہوئے کرشناں کیلر کو ٹانگ سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس موقع پر ایوب خاں کے ”زلف“ (وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو) نے یہ بیان دیا کہ اس موقع پر میں خود وہاں موجود تھا اور ایوب خاں صاحب نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ بہر طور، خوب بھد اڑی۔ شہاب صاحب تو اس واقعہ کے یقینی شاہد تھے۔ اب اس باب میں ان کی خاموشی کو کیا نام دیا جائے۔

(ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، لاہور)

☆☆☆

اظہر سبیل کی کتاب

”پیر پگاڑا کی کہانی“ سے اقتباس
سوال: آپ (شاہ مرداں پیر آف پگاڑا) کے نزدیک مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی درست تھی یا نہیں؟

کندھگان یعنی جمیل الدین عالی اور شاہد احمد دہلوی کو کس کی پشت پناہی حاصل تھی؟ صرف اور صرف ایک ہی نام قدرت اللہ شہاب۔

قدرت اللہ شہاب کی 1963ء میں ہالینڈ کے سفر کے طور پر تقرری کے موقع پر شاہد احمد دہلوی کا مکتوب بنام قدرت اللہ شہاب کس قدر شرم ناک ہے، ملاحظہ ہو:

”کل کے اخبار میں آپ کے ہالینڈ جانے کی خبر پڑی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ترقیوں سے نوازے مگر ہمیں تو معلوم ہو رہا ہے کہ ہم یتیم ہو گئے ہیں..... (اگرچہ یہ بڑی خود غرضی کی بات ہے) مستقبل ایک دم تاریک ہو گیا ہے۔“

(مکتوب محررہ: 27 اگست 1963ء مشمولہ ”شہاب نامہ“ صفحہ 797)

تغویر تو اسے چرخ گرداں تقو۔ مشہور زمانہ ادبی مجلہ ”ساقی“ کا مدیر کس درجہ لجاجت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

ایوب خاں کے دور میں چند سازشی عناصر نے شہاب صاحب کی معاونت سے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خلاف ایک خفیہ مہم اس لیے چلائی کہ وہ جنرل محمد ایوب خاں کے خلاف بولتے تھے اور یوں ان لوگوں نے مولوی عبدالحق کو ایک عضو معطل ثابت کر کے انجمن ترقی اردو، پاکستان کا زمام اقتدار سنبھالا۔ اس سازش سے مولوی عبدالحق پوری طرح آگاہ تھے اور از حد رنجیدہ خاطر۔ لہذا جب ان کی وفات سے چند روز قبل قدرت اللہ شہاب ہی کے مشورہ پر جنرل محمد ایوب خاں بیمار پرسی کرنے ہسپتال پہنچے تو بابائے اردو نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

قدرت اللہ شہاب نے ”شہاب نامہ“ میں یوں تو بہت سے عنوانات قائم کر کے لکھا لیکن ایک عنوان

”اسی بھرے بریف کیس سسٹم“ کے تحت پنجاب سے چرائی ہوئی پھینسیس پارلگنے کا کام اپنے ایک دیرینہ دوست (انک کے معروف جاگیردار اور حضرت سراج العظم شیخ محمد بیگ المعروف حضرت جی بابا کے گدی نشین) صاحبزادہ عبدالشکور خاں مرحوم کی دوستی کی آڑ میں کیا۔ جس کا خمیازہ صاحبزادہ عبدالشکور خاں کو ایک رات انک پولیس کی چوکی میں پابند رہ کر ادا کرنا پڑا۔ حضرت جی بابا کے خاندان پر یہ پہلا بدنامی کا بدنام داغ ہے۔

یاد رہے کہ شہاب صاحب کے مدوح جنرل محمد ایوب خاں کے نافذ کردہ مارشل لاء 6 اکتوبر 1958ء کی ذلت سے لتھڑی ہوئی رات نے اردو فیشن کی سب سے اہم شخصیت ہم سے چھین لی۔ خود قدرت اللہ شہاب نے اقرار کیا ہے کہ ”قرۃ العین حیدر کے تحت اشکور نے اس روز، اس لمحے پاکستان سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔“

جنرل محمد ایوب خاں کے مارشل لاء سے آزادی رائے کا گلا گھٹ گیا اور بقول ن۔م راشد ”ملک میں آوازوں کا رزق بند ہو گیا۔“ سنہ شب کا آغاز ہوا اور 1961ء میں پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس جاری ہوا۔ اس نئے قانون کے تحت علاوہ عائد کردہ پابندیوں کے، حکومت نے یہ حق بھی حاصل کر لیا کہ وہ کسی بھی اشاعتی ادارے، جریدے اور چھاپہ خانے کو ضبط کر سکتی ہے۔ نامور صحافیوں، شعراء و ادباء کی بڑی تعداد نظر بند یا پابند سلاسل کر دی گئی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس ضمن میں جنرل صاحب نے قدرت اللہ شہاب سے مشاورت نہ کی ہو۔ اس طرح پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام، پاکستان کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو جنرل صاحب کی جھولی میں ڈالنے کی ایک طے شدہ سوچی سمجھی سکیم تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے تجویز

پھر انہوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟ کاش! شہاب صاحب یہی بتا دیتے کہ وہ ”بڑا“ کون تھا جس کی ہدایت پر بقول قدرت اللہ شہاب ”فرضی قاتل“ (سید اکبر) کو جلسہ گاہ میں گولی مار کر لیاقت علی خاں کے قتل کو اندھا قاتل بنا دیا گیا۔ راولپنڈی کے ایس پی نجف خاں کا نام لے لینے اور یہ بتا دینے سے یہ سازش بے نقاب نہیں ہوتی کہ سید اکبر کو جلسہ گاہ میں گولی مروانے والا ایس پی نجف خاں بہت جلد ڈی آئی جی بنا دیا گیا۔

ڈی آئی جی ہوتا تو ایس پی سے اگلا قدم ہے اور نجف خاں کا ڈی آئی جی بن جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ کیا نجف خاں آؤٹ آف ٹرن ڈی آئی جی بنے اور اگر آؤٹ آف ٹرن ڈی آئی جی بنا دیتا اس قتل کا عوض نہ تھا تو یہ کیسی سازش تھی کہ وزیراعظم کو گولی مار دینے کے فوراً بعد حق اللہ مت بھی ادا کر دیا گیا۔ کیا اس عمل سے سازش بے نقاب ہو جانے کا خطرہ کسی ”بڑے“ نے محسوس کیا؟

”شہاب نامہ“ 25 ویں اور 29 ویں باب کا تجزیہ کرتے ہوئے عرفان احمد خاں نے معروف صحافی ایس کے درانی (سابقہ ایڈیٹر پاکستان ٹائمز) کے حوالے سے بتایا کہ پاکستان میں ”بھرا بریف کیس سسٹم“ چودھری ظہور الہی نے متعارف کروایا۔ یہ الگ قصہ ہے کہ بعد ازاں شریف فیملی نے اسے باقاعدہ ایک فن کی صورت عطا کی۔

قدرت اللہ شہاب کے مدوح محمد ایوب خاں کو چودھری ظہور الہی کی جانب سے بار بار ”بھرا بریف کیس“ پہنچنے رہنے کا حوالہ پڑھ کر ایک حوالہ مجھے بھی یاد آ گیا۔ ایوب خاں کا دور تھا اور گجرات میں پہلی بار رسہ گیری کی ابتداء ہوئی تھی۔ چودھری صاحب نے سرحد میں بڑے گوشت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے انک پل کے ذریعے رات بارہ بجے کے بعد

جواب: فوجی کارروائی درست تھی یا غلط، اس کا فیصلہ تو مورخ کرے گا لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ جس شخص نے پولینڈ کی قرارداد پھاڑ دی اور ملکی مفاد سے روگردانی کی، اس پر غداری کا مقدمہ نہ چلا کر اور اسے نفع بخش ملکی عہدوں پر فائز کر کے یہ بات ثابت کر دی گئی کہ مشرقی پاکستان کی فوجی کارروائی بھی محض ایک شوخی تھی جبکہ بھٹو نے یہ بات بھی پہلے ہی کہہ دی تھی کہ جو لوگ مشرقی پاکستان جا رہے ہیں وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں تھی اور یہ بات پوری ذمہ داری سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ سارا منصوبہ محض پاکستان کو توڑنے کے لیے تھا اور دیگر تمام کارروائیاں اسی کا حصہ تھیں۔ اس منصوبے میں کچھ بڑے جرنیل بھی ملوث تھے کہ انہوں نے ایک غدار کے خلاف مقدمہ چلانے کی بجائے اسے سول چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا دیا۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ اس وقت کی آری اور بھٹو صاحب کی ملی جھگت پاکستان کو توڑنے کا باعث بن گئی اور یہ بھی کہ اصل میں دونوں ایک تھے۔

سوال: آپ کے سیاسی اختلافات بہت سی شخصیات کے ساتھ رہے، آپ ان کے بارے میں فقرے بھی چست کرتے رہے، ان کی جانب سے بھی جوابی کارروائی ہوتی رہی مگر سیاسی اختلافات نے ذاتی عناد کی صورت میں صرف بھٹو کے معاملے میں اختیار کی۔ ساگھر میں بھٹو پر قاتلانہ حملہ گویا صرف آغاز تھا۔ اس کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ بھٹو نے ملک کی قیادت سنبھالتے ہی آپ کو ٹیلیفون کیا اور نمٹ لینے کی دھمکی دی۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

پیر صاحب: ہمارا بھٹو کے ساتھ کوئی ذاتی عناد نہیں تھا البتہ اس نے ہمارے ساتھ ذاتی عناد بنا لیا تھا جسے وہ حسب توفیق ہوا بھی دیتا رہا۔

سوال: اصل معاملہ کیا تھا؟ آپ سے انہیں کیا شکایت تھی؟

پیر صاحب: یہ بات تو اس سے پوچھی جانی چاہیے تھی۔ دراصل وہ ایک ایسا آدمی تھا کہ جس کسی نے بھی اس پر یا اس کے خاندان پر کوئی احسان کیا اس نے اسے ضرور تنگ کیا اور اس کی توہین کرنے میں مسرت محسوس کی۔ وہ طبعاً ایک محسن دشمن آدمی تھا۔

سوال: آپ نے اس پر کون سا احسان کیا تھا؟

پیر صاحب: ہم نے اسے کبھی کبھی خدمت گزاری سے بڑھا کر اقوام متحدہ تک پہنچایا۔ یہ مہربانی کیا کم تھی؟

سوال: آپ بھٹو کو کب سے جانتے تھے؟

پیر صاحب: میں اسے 1952ء سے جانتا تھا۔

سوال: آپ نے لاڑکانہ کی نشست پر بھٹو کا مقابلہ کرنے کا اعلان کیوں کیا؟

پیر صاحب: میرے پاس قاضی فضل اللہ سمیت چند شرفاء آئے کہ اگر آپ بھٹو کے مقابلے میں نہ آئے تو اور کوئی کہیں بھی اس کا مقابلہ نہیں کرے گا۔ اب اگر قاضی فضل اللہ جیسا آدمی بھی یہ بات کہے تو آپ ہی بتائیں کہ کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے یہی سوچ کر کاغذات داخل کروانے کا اعلان کر دیا کہ اگر یہ لوگ بھی سامنے آنے سے گھبرارہے ہیں تو واقعی اور کوئی بھی نہیں آئے گا۔

سوال: تب بھٹو نے کہا تھا کہ میرا مقابلہ کرنے والا سندھی کی اولاد نہیں ہو سکتا اور اس کا جواب جی ایم سید نے دیا تھا کہ بھٹو خود سندھی کی اولاد نہیں؟

پیر صاحب: ہمارے اجداد عربستان سے آئے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ سندھ کے اصل باسی تو کول، دراوڑ یا بھیل بھی نہیں بلکہ اچھوت ہی تھے۔

سوال: اس ملک کی ترقی اور بہبود کے لیے آپ کے ذہن میں کیا خاکہ ہے؟
پیر صاحب:..... کیسی ترقی؟ ترقی کے اسباب تو ختم کر دیئے گئے یا باہر لے جا چکے۔

☆☆☆

کلام علامہ اقبال

عجب واعظ کی دینداری ہے
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
کوئی اب تک یہ نہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے
وہیں سے رات کو عظمت ملی ہے
چمک تارے نے پائی جہاں سے
ہم اپنی درومندی کا فسانہ
سنا کرتے ہیں اپنے رازداں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذال سے

☆☆☆

ایٹم بم

اچھے ملکوں، اچھے شہروں کی پہچان یہ بھی ہوتی
ہے کہ دنیا کے کونے کونے سے غیر ملکی سیاح وہاں
سیاحت کی غرض سے گھومنے آتے ہیں۔ ہمارے
ہاں کوئی نہیں آتا۔ عزت و ناموس سے بڑھ کر کچھ
نہیں ہوتا۔ ایٹم بموں سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب
سوویت یونین ٹوٹا تب اس کے پاس امریکہ سے
زیادہ مہلک ایٹمی ہتھیار اور بم تھے۔ آپ ایٹم بموں
سے پیٹ نہیں بھر سکتے۔ مفلسی دور نہیں کر سکتے۔ تعلیم
یافتہ قوم نہیں بنا سکتے۔ ہمارے ہاں تو اب کوئی
کرکٹ کھج بھی کھیلے نہیں آتا۔

☆☆☆

ریلوے کا تحفہ

انگریز غاصب تھا۔ استعمار تھا لیکن اس کا انکار

باقی سب یا تو مہاجر ہیں یا پناہ گزین۔ کوئی ڈنڈا لے
کر آیا، کوئی دسے لے کر آیا، کوئی ترازو ساتھ لایا۔ ہم تو
باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ کوئی پہلے آیا کوئی بعد
میں۔ ہمارے اجداد پانچ سو کچھ ہجری میں آئے تھے
جبکہ بھٹو صاحب کے اٹھارہ سو کچھ عیسوی میں آئے۔

سوال: اچھا یہ بتائیں کہ پی این اے میں کیا
اختلافات تھے؟

پیر صاحب:..... پی این اے مختلف لیڈروں کا
نام تھا۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو اپنے پاؤں پر
بھی کھڑے نہ ہو سکتے تھے مگر قومی سطح کے لیڈر بنے
بٹھتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے کہ جن کی کوئی خاص
پالیسی ہی نہیں تھی مگر ایک بات پر سب متفق تھے اور
وہ یہ کہ مسلم لیگ کو آگے نہیں بڑھنے دینا۔ بعد میں
مجھ پر دفعہ 144 نافذ کر دی گئی کہ آپ کوئی بیان
نہیں دیں گے، کوئی بات نہیں کریں گے۔ جب اس
کام کے لیے اصرار خان کو مقرر کیا گیا جو روز بیان
دیتے یہ الگ بات ہے کہ ان کی بات کسی کے پلے کم
پڑتی تھی۔

سوال: آپ نے مسلم لیگ کیوں چھوڑی؟
پیر صاحب:..... ہم نے نہیں چھوڑی۔ یہ تو
غیر سیاسی، غیر جماعتی، غیر نظریاتی اراکین نے ہم
سے چھڑوا دی بلکہ دفن کر وا دی۔

سوال: یہ بتائیں کہ آئندہ کے لیے ملک کا کیا
نقشہ ہونا چاہیے اور یہ بھی کہ کیا سیاست میں فوج کا
کوئی کردار ہونا یا رہنا چاہیے؟

پیر صاحب:..... آئندہ کی بات تو میں تب
کروں گا جب میری پچھلی پشین گوئیاں جو باقی رہتی
ہیں پوری ہو جائیں گی۔ رہا فوج کا سیاست میں
کردار تو جمہوری سیاست میں ”نہیں“ ویسے اب
ہماری فوج بھی سیاسی بن چکی ہے اور جنرل کا
مطلب ہے ”یاستدان“۔

خدا نے ایک خاص مذہب جاری کیا اور وہی مذہب برحق ہے اور اس سے انکار کرنے والا کافر ہے تو ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا جن تک وہ پیغام پہنچا ہی نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ خدائی مذہب کے طرف دار ایک حد تک ان اعتراضات کا جواب دلیل اور منطق سے دیتے ہیں کہ احکام الہی میں چوں چرا کی گنجائش نہیں۔ مذہب ادراک انسانی سے بالاتر ہے۔ عقل انسانی محدود ہے اور رموز الہی کے سمجھنے سے قاصر۔ یہ وہ کوچہ ہے جس میں اطاعت اور خاموشی کے سوا دم مارنے کی گنجائش نہیں۔

مگر ایک دقت پھر بھی باقی رہتی ہے۔ اگر ان بزرگوں کے فرمان کے مطابق مذہب کو خدا داد مان لیا جائے اور انجیل اور قرآن پاک کو کلام الہی سمجھا جائے تو بھی کلام الہی کے معنی اور مطلب سمجھنے کے لیے انسان کے پاس سوائے اس محدود اور ناقص عقل و فہم کے اور کوئی ذریعہ نہیں۔ کلام الہی تو نازل ہوا مگر اس کے ساتھ اس کی شرح تو نازل نہیں ہوئی اور اگر ہوئی بھی ہے تو جو دقت کلام الہی کے سمجھنے میں پیش آ رہی ہے وہی اس کی شرح کے سمجھنے میں پیش آئی۔ انجیل اور قرآن پاک کلام الہی ہوں مگر انجیل کے کسی باب کے کیا معنی ہیں اور قرآن کی کسی آیت کا کیا مطلب ہے، یہ کون بتائے گا؟ شاید اس دقت کو دور کرنے کے لیے عیسائیوں کے رومن کیتھولک گروہ نے یہ آئین قائم کیا کہ انجیل کے معنی اور مطلب سمجھنا ہر انسان کا کام نہیں۔ جو معنی چرچ یا یوں کہیں کہ پاپائے روم کی طرف سے بتائے جائیں وہی مستند ہیں اور ان کو ماننا لازم ہے لیکن اصل دقت اس سے بھی رفع نہ ہوئی۔ پوپ بھی انسان ہے۔ اس واسطے ان کے احکام میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب کے پیرو فریق اور گروہ در گروہ پشیمان و پریشان نظر آتے ہیں۔

عوام کے لیے لازم ہے کہ اگر زندگی میں اس سے خوف کھاتے تھے اور اس کی خدمت کرتے تھے تو مرنے کے بعد اس روح کو پوچھیں۔ اس خیال سے رفتہ رفتہ ایک ایسی پر ہیبت اور پرشکوہ روح کا تصور پیدا ہوگا جو سارے عالم پر محیط ہے اور کل نظام دنیا جس کے قبضہ میں ہے۔ اس قسم کے خیالات تو ان لوگوں کے ہیں جو مذہب کو بھی انسان کے دل و دماغ کا ایک کرشمہ خیال کرتے ہیں۔ جس طرح سوسائٹی کے قواعد ترتیب دیئے گئے، قانون بنائے گئے، حکومت کے دستور قائم ہوئے اسی طرح مختلف زمانوں میں، مختلف ملکوں میں، مختلف مذاہب پیدا ہوئے۔ کہا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی حمیہ کے مطابق بنایا۔ ان حکیموں کا خیال ہے کہ انسان اپنے معبود کو اپنے خیال کے مطابق خلق کرتا ہے۔ جس گروہ کی تہذیب اور تحقیق جس درجہ پر ہوگی، جس طرح کے اس کے رسم و رواج ہوں گے، جن خوبیوں کی اس میں قدر و منزلت ہوگی، اسی طرح کا معبود اس کا دماغ خلق کرے گا۔

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ نہیں، مذہب ایک خدا داد شے ہے۔ انسان کے فہم اور دماغ سے بالاتر۔ خداوند ازل نے مختلف زمانوں میں مختلف قوموں میں ایسے پیغمبر بھیجے جن کو الہام کے ذریعے رموز الہی کا علم بخشا گیا اور انہوں نے اپنے پیام دنیا کو سنائے۔ مذہب کے حقائق فراست انسانی کے اخذ کئے ہوئے نہیں ہیں اور اسی وجہ سے انسانی آئین یا دستور کی کیا ضرورت تھی؟ ایک مذہب جاری ہوا، پھر حکم الہی سے وہ منسوخ ہو کر اس کی جگہ دوسرا مذہب جاری کیا گیا۔ یہ کیوں؟ ہمیں کیا ثبوت ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر گروہ انسان میں پیغمبر بھیجے گئے؟ اگر یہ کہا جائے کہ خاص زمانہ میں

کون کر سکتا ہے کہ برصغیر کے کھوئی سوار یا پیدل عوام کو ریلوے کی باعزت اور سستی ترین سواری کا انتہائی وسیع و عریض عالیشان نیٹ ورک دے گیا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ جب انگریز برصغیر میں ریلوے ٹریک بچھا رہے تھے تو یہاں کے غیور اور باشعور عوام میں یہ افواہ زبان زد عام تھی کہ فرنگی لوہے کے پٹے ڈال کر ہندوستان کو ٹھیک کر اپنے ملک لے جانا چاہتے ہیں۔ اس سازشی تھیوری کے باوجود انگریز نے کام جاری رکھا اور عوام کو ریلوے کا تحفہ دے دیا لیکن آج اس آزاد قوم کے ”غیر غاصب“ اور ”غیر استعمار“ بلکہ جمہوری حکمرانوں کی موجودگی میں ریلوے یوں پھل رہا ہے جیسے جون جولائی میں پتی ریت پر بڑی قلفی یا آئس کریم..... یہاں ان کی بھی کمی نہیں جو ریلوے کے انجن ہی پکھلا کر پی گئے۔ کوئی اس کی پٹریاں کھا گیا، کسی نے اس کی لاوارث زمینوں پر قبضہ کر لیا۔

واہ آزادی واہ..... آہ بربادی آہ!!

☆☆☆

مذہب

مذہب عالمگیر ہے اور اس کی سینکڑوں قسمیں ہیں۔ مشرق کے حکیم اور مغرب کے فلسفی اس کی تعریف مختلف الفاظ میں کرتے ہیں اور اپنے بیانات میں بڑی بڑی باریکیاں پیدا کرتے ہیں۔ میرے نزدیک ان باریکیوں میں پڑنا اور ان کی موٹا گافیاں کرنا عبث ہے۔ سیدھے سادے طور پر یوں کہیے کہ مذہب کے معنی ہیں احساس ہونا ایسی قوت یا قوتوں کا جو انسان سے بالاتر ہیں۔ جو اس کو نفع اور ضرر پہنچا سکتی ہیں اور جن سے نفع حاصل کرنے کے لیے ان کو خوش رکھنا، ضرر سے بچنے کے لیے کوئی ایسا فعل نہ کرنا جس سے وہ ناخوش ہوں، اس کے واسطے لازم ہے۔

تاریخ و تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب نے دنیا میں طرح طرح کی صورتیں اختیار کی ہیں۔ کسی زمانے میں کچھ تھا اور کسی زمانے میں کچھ۔ ایک ملک میں اس کی ایک ہیئت ہے اور دوسرے ملک میں دوسری۔ کہیں چاند، سورج، سیاروں اور ستاروں کی پرستش ہوتی ہے کہیں بت اور تصویریں پوجی جاتی ہیں۔ کوئی گروہ پہاڑوں اور دریاؤں کو متبرک خیال کرتا ہے کوئی قبروں پر چڑھاوے چڑھاتا ہے۔ کوئی تثلیث کو مانتا ہے کوئی توحید کا قائل ہے۔ کیا عجب ہے کہ پہلے پہل آفتاب کی جہانگیر روشنی اور گرمی، چاندنی کی ٹھنڈک اور سرور، تاروں میں رات کے دلکش منظر، بجلی کی چمک اور بادل کی گرج سے متاثر ہو کر انسان نے اجسام فکلی کو مثل اپنے جاندار اور اپنے پوقی تر سمجھ کر ان سے نفع حاصل کرنے اور ان کی ضرر سے بچنے کے لیے ان کی پرستش شروع کی ہو۔ ایک فرنگی حکیم کی رائے ہے کہ مذہب کی ابتدا خواب سے ہوئی۔ خواب کی حالت میں خواب دیکھنے والا اپنے مقام سے دور دور ہو آیا، جب جاگا اس نے اپنے ساتھیوں سے خواب کا حال بیان کیا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے بتایا کہ اس کا جسم جہاں وہ سویا تھا وہیں موجود تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ جسم کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے جو خواب کی حالت میں جسم سے باہر نکل کر جاتی ہے اور گھوم پھر کر جسم میں واپس آ جاتی ہے۔ اس چیز کا نام روح رکھا گیا ہے۔ جب روح ہمیشہ کے واسطے جسم سے الگ ہو جائے اور پھر واپس نہ آئے تو اس حالت کا نام موت ہے۔ سوسائٹی کے نظام کی مناسبت سے روحوں میں بھی مدارج قائم کئے گئے۔ جس سردار یا بادشاہ سے تابعین خوف کھاتے ہیں اس کی روح بھی ان کی روحوں سے زیادہ طاقتور ہوگی۔ اس میں فائدہ اور نقصان پہنچانے کی اہلیت بھی زیادہ ہوگی لہذا

قرآن پاک ایک ہے مگر خنزیر بھگڑوں سے اسلامی تاریخ کا کون پڑھنے والا واقف نہیں؟ شیعہ اور سنی کا اختلاف آج بھی موجود ہے۔ کوئی مقلد ہے کوئی غیر مقلد، کوئی آغا خانی ہے اور کوئی اثنا عشری۔ اسلام ایک ہے مگر اس میں بہتر فرقے ہیں اور اب اس سے بھی کچھ زیادہ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تلقین انجیل سے واضح ہے مگر انجیل کو کلام الہی ماننے والے عیسائیوں کے سینکڑوں گروہ ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر مذہب کا ہر گروہ اپنے تئیں رازِ الہی کا امین سمجھتا ہے اور اپنے سوا سب کو گمراہ جانتا ہے۔

”بھگت کبیر“ ڈاکٹر عبدالحفیظ کی کتاب سے اقتباس)

☆☆☆

زلزلے

جب میں زلزلے سے متاثرہ علاقے کا دورہ کر رہا تھا یا شاید وہاں جانے سے ایک آدھ روز پہلے مجھے گاندھی جی کا یہ بیان پڑھ کر سخت صدمہ ہوا تھا کہ زلزلہ چھوٹ چھات کی سزا ہے۔ انہوں نے یہ بات کہی کہ آدمی سر پکڑ کر بیٹھ جائے۔ راہنڈر ناتھ ٹیگور نے اس کا جو جواب دیا وہ مجھے بہت پسند آیا اور میں اس سے لفظ بہ لفظ متفق ہوں۔ سائنس کے نقطہ نظر سے یہ بات اس قدر بعید تھی کہ اس سے بعید تر کوئی چیز تصور میں نہیں آ سکتی۔ یہ مانا کہ جذباتی کیفیات یا نفسی واردات کا جو اثر مادے پر پڑتا ہے اس کے متعلق سائنس صحیح حکم لگانے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے کہ دماغی صدمے کے اثر سے انسان کو بدبھمی ہو جائے یا اس کے جسم پر اس سے بھی زیادہ اثر پڑے لیکن یہ کہنا انسانی رسوم یا کوتاہیوں کے کوئی اثرات سطح ارضی کی حرکت پر پڑیں گے سخت حیرت ناک ہے۔ گناہ غضب الہی اور نظام کائنات میں انسان کی اہمیت کا تحلیل ہم کو چند صدی پیچھے دھکیل کر

اس زمانے میں لے جاتا ہے جب پورے یورپ میں کلیسا کے احساب کا دور دورہ تھا۔ گیورڈانو برونو عملی تحقیقات کے جرم میں محکوم قرار دے کر جلا دیا گیا اور بہت سی عورتیں سحر کے الزام میں آگ میں جھونک دی جاتی تھیں۔ امریکہ میں اٹھارہویں صدی میں بھی بوسٹن کے سربراہان پادریوں نے میساچوسٹس کے زلزلے کا سبب اس بدعت کو ٹھہرایا کہ عمارتوں پر برق رپا سلاخیں نصب کی گئی تھیں۔

اگر زلزلے کو عذاب الہی تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ ہم کو کیسے معلوم ہو کہ ہمارے کس گناہ کی سزا ہم کو دی جا رہی ہے کیونکہ افسوس! ہمارے گناہ لا تعداد ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی توجیہ کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سزا ہم کو اس لیے دی گئی ہو کہ ہم ایک غیر ملکی حکومت کی غلامی پر راضی ہیں یا اس لیے کہ ہم ایک ظالمانہ سماجی نظام کو برداشت کر رہے ہیں۔ مہاراجہ درجنگ جو ایک بہت بڑے زمیندار ہیں، مالی حیثیت سے زلزلے کی وجہ سے انہیں بہت نقصان پہنچا۔ اس لیے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظام زمینداری کے لیے تازیانہ عبرت ہے۔ یہ اس سے زیادہ قرین قیاس ہے کہ بہار کے کم و بیش بے گناہ لوگوں کو جنوبی ہندو لوگوں کی چھوٹ چھات کے گناہ کی سزا ملے۔ یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ آخر خود چھوٹ چھات کی سر زمین پر زلزلہ کیوں نہیں آیا؟ حکومت برطانیہ کہہ سکتی ہے کہ یہ عذاب سول نافرمانی کی وجہ سے نازل ہوا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ شمالی بہار نے جسے زلزلے سے زیادہ نقصان پہنچا آزادی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

غرضیکہ ہم اس طرح کی بے شمار قیاس آرائیاں کر سکتے ہیں لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم قضاء و قدر کے کاموں میں دخل ہی کیوں دیں اور اپنی انسانی جدوجہد سے عذاب الہی کے نتائج کو ہلکا

☆☆☆

”افکار پریشان“

(جشن ایم آر کیانی کی کتاب سے اقتباس)

میں اپنا تعارف خود کرنا مناسب سمجھتا ہوں..... ایک نویں جماعت کے طالب علم نے مجھے خط لکھا کہ جب بھی آپ کی تقریر اخبار میں آتی ہے تو ہمارے گھر میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ آپ کا اصلی نام کیا ہے؟ یہ ایم آر کیانی تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کبھی ہم محمد رمضان سمجھتے ہیں کبھی ملک رحمت۔ آپ اپنے ہاتھ سے لکھیں، آپ کا اصلی نام کیا ہے؟ تاکہ آئندہ ہمارے گھر میں جھگڑا نہ ہو۔ میں نے جواب دیا کہ یہ خط میں اپنے ہاتھ سے لکھ رہا ہوں اور میرا نام محمد رستم ہے نیز چونکہ اس کا احتمال ہے کہ اس کے بعد آپ کے گھر میں میرے قد و قامت پر جھگڑا اٹھے تو واضح ہو کہ میں خود تو بال سے زیادہ باریک ہوں مگر میری ہڈیاں تلوار سے زیادہ تیز ہیں، جن پر دوغلی باتوں کے ٹرک نہیں گزر سکتے۔

اس لڑکے کی بات کہ محض ایم آر کیانی کچھ معنی نہیں رکھتا ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ سچی ثابت ہوئی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ (who is who) کے کام سے بعض پبلشرز ایک ڈائریکٹری چھاپتے ہیں جس میں بقول ان کے مشہور لوگوں کے نام ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بات مسلمہ ہے کہ وزیر تو مشہور ہوتے ہیں ہی بی جے پی بھی مشاہیر میں سے ہیں اور اگر وہ تصویر کے ساتھ روپے بھی بھیج دیں تو مزید شہرت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ پچھلے ہفتے اپنی ہسٹری شیٹ کی تصحیح کے لیے میرے پاس انگلستان سے ایک خط آیا۔ ہسٹری شیٹ میں میرا نام ملک الرحمن کیانی درج تھا جو میرے بڑے بھائی کا نام ہے۔ وہ بھی ایم آر کیانی ہیں ان کے دو لڑکے بھی ایم آر کیانی ہیں۔ ہسٹری شیٹ میں میری سیاسی

کرنے کی کوشش کیوں کریں؟ پھر ہم اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ قدرت نے ستم ظریفی ہمارے ساتھ کیوں روا رکھی ہے۔ ہمیں کمزور اور خطا کار بنایا، ہماری راہ میں قدم قدم پر پھندے لگا دیئے۔ دنیا کو مصیبت اور ظلم سے معمور کر دیا۔ شیر اور بھیڑ کو پیدا کیا اور پھر ہمیں سزا بھی دیتی ہے۔

(”میری کہانی“ آپ بیتی جواہر لعل نہرو سے اقتباس)

☆☆☆

”کیا کھویا، کیا پایا؟“

قلم آئی، علم کیا۔

فیض آیا، حیا گئی۔

سینما آیا، مدرسہ گیا۔

دولت آئی، مدرسہ گیا۔

ویڈیو آئی، ہدایت گئی۔

رواج آیا، سنت گئی۔

کرکٹ آئی، کام گیا۔

ہوس آئی، سکون گیا۔

رشوت آئی، حلال گیا۔

راگ آیا، عبادت گئی۔

پینک آیا، برکت گئی۔

ٹی وی آیا، نیند گئی۔

گانا آیا، تلاوت گئی۔

ڈش آئی، wish گئی۔

☆☆☆

انسان کا بیج

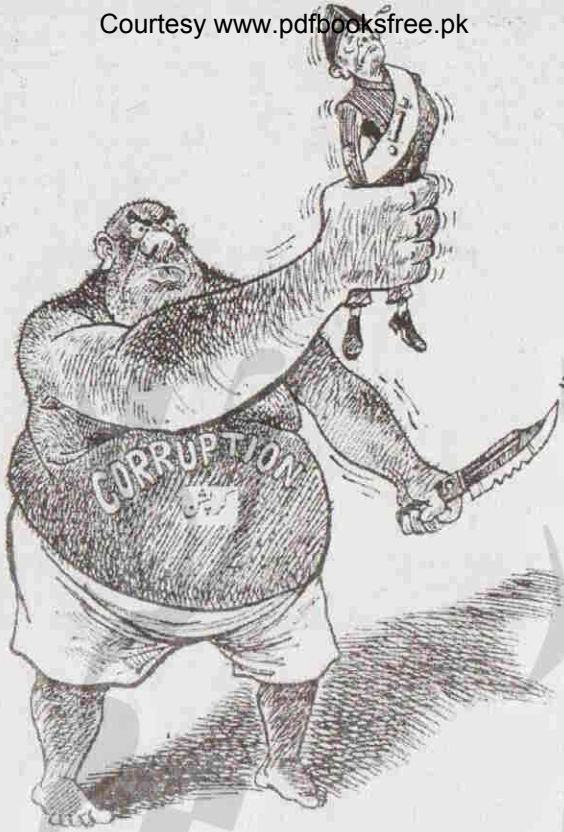
مرد اور عورت کا ملاپ، جس کے نتیجے میں انسان کا بیج پھوٹتا ہے، کبھی تو گھٹاؤ نا جرم ہے، بدکاری ہے، زنا ہے، قابل سنگ زنی ہے اور بھی یہ فعل بے پناہ طور سے مقدس، سہانا، عظمتوں سے بوجھل، کبھی اس کی ذرا سی تمنا کرے تو گردن کاٹی جائے اور کبھی یہ سماج کی عین منشا بن جائے۔

میرے ایک دوست کی بیوی نے اپنے مہمانوں سے میرا تعارف اس طرح کرایا کہ میرے شوہران کا ہمیشہ ذکر کرتے تھے۔ مدت کے بعد جب میں نے ان کو پہلی بار دیکھا تو اپنے شوہر سے پوچھا کہ کیا یہی ہیں آپ کے رستم؟ جس سے میں نے قیاس کر لیا کہ ان کے شوہر نے ضرور کوئی رستی کی بات کی ہوگی۔

بات یہ ہے کہ میرا اصلی نام جلدھر خاں تھا (آپ کے فائدہ کے لیے یہ بات کہتا ہوں کہ پشاور کے مشہور ڈاکو کا نام ملتان خاں تھا) جب پانچ چھ سال کی عمر تھی تو عید کے موقع پر والد مرحوم نے ہم تینوں بھائیوں کے لیے بوٹ منگوائے لیکن ہمیں تسے باندھنے نہیں آتے تھے۔ والدہ نے سفارشا والد سے کہا کہ بچوں کو تسے باندھنے سکھائیے۔ انہوں

سرگرمیوں کا ذکر کرتا اور یہ بھی کہ فلاں سال میں صوبہ سرحد میں وزیر صحت ہوا جس سے صحت اچھی ہوگئی مگر 50ء میں وزیر مواصلات ہوا اور پھر سارے ویلے ٹوٹ گئے اور 58ء میں سیاست سے بیزار ہو کر میں چیف جسٹس ہو گیا۔ قصہ سوائے آخری گناہ کے باقی سارے سیاسی گناہ میرے بھائی کے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ میرا ایڈریس سپریم کورٹ آف پاکستان لکھا تھا جہاں میرے سائے کا بھی سانس پھولنے لگتا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ اے لوگو! جو اچھے بھلے نام چھوڑ کر حرف استعمال کرتے ہو، عبرت حاصل کرو!

دوسرا قصہ زیادہ نازک ہے یعنی میرا نام رستم کیوں رکھا گیا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھ سے پہلے بھی ایک رنگی کا نام کا فورہ چکا ہے۔



کرپشن، اور لوٹ مار ہمارا کلچر ٹھہرا

معاشرے میں بڑھتی ہوئی اخلاقی برائیوں کے حوالے سے خصوصی فیچر جو ہمارے ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہیں!



عارف محمود اہل

کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ جس پر ان صاحب نے کہا کہ وہ بذریعہ ٹرین لاہور سے باہر جا رہے ہیں۔ انہوں نے موٹر سائیکل ریلوے سٹینڈ پر کھڑی کرنی ہے جہاں خود موٹر سائیکل سٹینڈ والے پٹرول نکال لیتے ہیں لہذا یہ پٹرول میں بوتل میں ڈال کر

ریلوے سٹیشن کے قریب کچھ ہی فاصلے پر ایک دیوار کے ساتھ موٹر سائیکل کھڑی تھی اور موٹر سائیکل کا مالک اس کی ٹینکی سے پٹرول نکال کر بوتل میں ڈال رہا تھا۔ میں نے دیے ہی قریب سے گزرتے موصوف سے انتہائی معذرت کے ساتھ دریافت کیا

نے بہتیرا شور مچایا مگر پٹھان نہ جاگا۔ جاگتا بھی تو چادر سے سر نکال کر اور آنکھیں مل کر پھر سو جاتا۔ ڈاکو خود دار آدمی تھے۔ ان سے یہ ہتک برداشت نہ ہو سکی کہ سیٹھ کا محافظ اس طرح سوتا رہے جیسے ان کا عدم وجود برابر ہو۔ اس لیے انہوں نے جا کر پٹھان کی چادر کھینچی۔ اس پر وہ سوتا رہا۔ پھر اس کی آنکھیں زور سے کھولیں۔ اس پر بھی وہ سوتا رہا۔ اب ڈاکوؤں کی خودداری کا پتا نہ لبریز ہو چکا تھا۔ پٹھان کی نوار کا ڈبہ پاس پڑا تھا۔ پشاوری نوار جسے صاد سے لکھتے ہیں ”عجب تصویر خوش رنگ است واعلیٰ“ ڈاکوؤں نے پٹھان کے جسم کے دوسرے نصف حصے سے کپڑا اُتارا اور وہی نوار چھڑک دی۔ تب پٹھان جاگا۔ تب پٹھان کو غصہ آیا۔ تب پٹھان نے اپنا ڈنڈا لیا اور مست ہانسی کی طرح گرج کر ایسا حملہ آور ہوا کہ ڈاکو لوٹ کے روپے چھوڑ کر بھاگ گئے اور پٹھان نے کہا کہ چلو سیٹھ اٹھاؤ اگرانی اور سیٹھ، پٹھان اور روپے تینوں خیریت سے گھر پہنچ گئے۔ اگلے دن سیٹھ نے پٹھان کی تحوہ کا حساب کر کے اس کو فارغ کر دیا۔ پٹھان حیران ہوا اور کہا کہ کل ہی تو میں نے جان اور نوار پر کھیل کر تمہارے مال کو بچایا ہے اور آج مجھے نوکری سے الگ کر رہے ہو۔ سیٹھ نے کہا، میں تمہارا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا کہ تم نے بہت دلیرانہ حملہ کر کے میری اگرانی بچائی۔ مگر ایسا کرنے کے لیے چاہیے کہ پہلے تمہاری چادر اُتاری جائے پھر تمہاری ٹانگ کھینچی جائے پھر تمہاری آنکھوں کو کھڑکیوں کی طرح کھولا جائے پھر تمہارے جسم کے نصف حصے کو بے لباس کیا جائے پھر نوار چھڑکی جائے تاکہ تمہاری غیرت کو ٹھیس پہنچے۔ تب تمہیں غصہ آتا ہے۔ تب تم خون بہانے کو تیار ہوتے ہو۔ اتنی محنت کون کرے!

نے مذاق کرتے ہوئے کہا، اگر میں تمہارے لیے دوسری ماں لاؤں تو تم اس کو سلام کرو گے؟ بڑے بھائی نے کہا ”ہاں“ اور والد مرحوم نے ان کے تھے باندھ دیے۔ میری باری آئی تو میں چپ ہو گیا۔ والد نے پھر سوال کیا۔ میرے بھائی نے کان میں کہا کہ کہہ دو نا، اس میں کیا ہے؟ تمہارے سلام سے بچ بچ سوتلی ماں تو نہیں آجائے گی۔ میں نے کہا کہ اگر آگئی تو؟ تیسری بار جب والد نے سوال کیا تو میں نے کہا کہ سلام تو میں نہیں کروں گا۔ میرے تھے کھلے ہی رہ گئے۔ اور میں غصے سے باہر نکل آیا اور رونے لگا۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا۔ والد مرحوم میرے نکلنے کے بعد ٹھکڑا کر بنے اور کہنے لگے کہ یہ بھی بڑا رستم بنا پھرتا ہے۔ اپنے باپ کو دوسری شادی کی اجازت تک نہیں دیتا۔ اس دن سے جلدھر خاں کی بجائے میں رستم خاں ہو گیا اور جب ذرا مہذب ہوا تو نام کے ساتھ محمد لگا لیا اور خاں کاٹ دیا مگر ”میرے بوٹوں کے تھے ابھی تک کھلے ہیں۔“

مجھے ایک پٹھان کا قصہ یاد آ رہا ہے۔ کیا کروں کہ اب کچھ چلے گئے ہیں تو پٹھان ہی رہ گئے ہیں مگر اس دفعہ بھئی کا سیٹھ بھی قصے میں شامل ہے۔ یہ سیٹھ دیہاتیوں کو قرضہ دیا کرتا تھا اور سال میں دو دفعہ اصل زر یا سود لینے کے لیے نکلتا تھا۔ اس عمل کو اگرانی کہتے ہیں یعنی روپے جمع کرنا۔ اگرانی کے لیے ضروری ہے کہ ایک باڈی گاڑ بھی ساتھ ہو چنانچہ ایک پٹھان کو ساتھ لے کر سیٹھ اگرانی کے لیے نکلا۔ واپسی میں دھوپ کی شدت تھی۔ دونوں ایک سایہ دار درخت کے نیچے دو گھڑی آرام کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ پٹھان چادر اوڑھ کر ایک طرف سو گیا۔ اتنے میں ڈاکو آئے اور سیٹھ کو لوٹ لیا۔ سیٹھ

اور بوتل بیک میں رکھ کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور واپسی پر دوبارہ پٹرول ٹینکی میں ڈالوں گا۔

ان صاحب کی معلومات پر مبنی جواب سن کر حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوا کہ ہم اخلاقی اعتبار سے اس قدر گراؤ کا شکار ہیں کہ کسی کی موٹر سائیکل اور گاڑی میں پٹرول تک نہیں چھوڑتے اور چند سکوں کی خاطر اپنا ایمان خراب کر لیتے ہیں۔

قارئین یہ تو فقط ایک واقعہ ہے جو ہم نے آپ کے گوش گزار کر دیا ہے مگر نہ یہاں اسی نوعیت کے اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ مثلاً اللہ کے کسی نیک بندے نے لب مزک پانی کی سمیل لگوا رکھی ہوتی ہے جس کے اوپر لکھا ہوتا ہے برائے ایصال ثواب والدہ ماجدہ۔ اس سمیل کا پانی پینے کے لیے سلور کے دو گلاس بھی زنجیر سے بندھے ہوتے ہیں۔ اگرچہ گلاس کوئی جاندار شے تو نہیں مگر سمیل لگانے والے کو پتہ ہے کہ اگر یہ معمولی گلاس بغیر زنجیر کے ہوئے تو پانی پینے والے اسے جاتے جاتے ساتھ لے جائیں گے۔

گویا ہمارے اخلاقی کردار کا یہ معیار ہو چکا ہے کہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کر ڈالتے ہیں اور جس برتن میں پیتے ہیں اسے ہی ساتھ لے جاتے ہیں۔

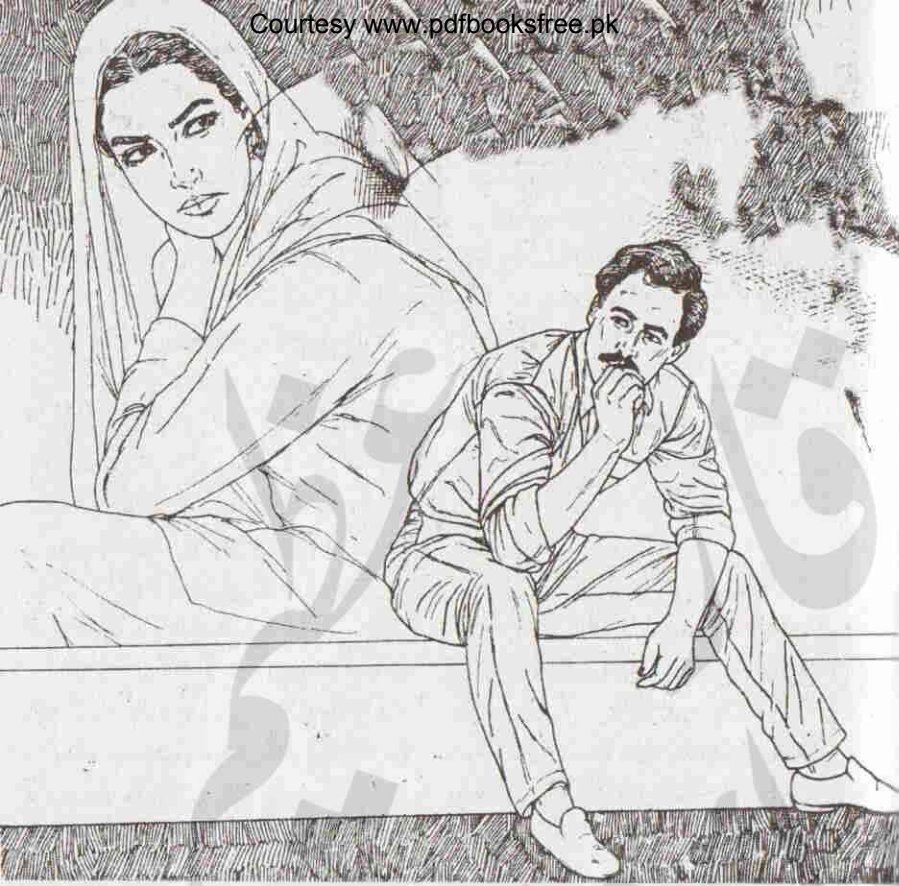
کافی عرصہ قبل شہر لاہور میں عوام کی سہولت کے لیے ٹیلی بوتھ لگائے گئے تھے جس میں کسٹمرز سیلو کارڈ ڈال کر فون کیا کرتے تھے۔ یہ ٹیلی فون دیکھ کر دو نمبر کام کرنے والوں کی رال پکڑنے لگی اور انہوں نے دو نمبر کارڈ بنا کر ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی مگر جب ساری تدابیر ناکام ہو گئیں تو یہ مافیا انتظامی طور پر ٹیلی فون بوتھ کے لوہے کے بھاری ریسیور کاٹ کر لے گیا۔

اسی عرصہ میں ہوٹل کے ڈھکنوں کا ذکر کرتا

چاہیں گے جنہیں چور رات کے اندھیرے میں اٹھا کر لے جایا کرتے تھے تاکہ ڈھکنے کا لوہا بچ کر نشہ پانی کر سکیں۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے مین ہوٹل کے ڈھکنے لوہے کے بجائے بجری، سینٹ اور ریت سے بنائے جانے لگے ہیں تاہم جہاں کہیں بھی لوہے کے ڈھکن ہیں ان کو زنجیر ڈال کر ساتھ تالا لگایا جاتا ہے تاکہ ڈھکنا چور ڈھکنا نہ لے جا سکے مگر وارداتیں کرنے والے اتنے ہوشیار ہیں کہ اب مین ہول کے ڈھکن کو زنجیر سمیت کاٹ کر لے جاتے ہیں۔ اسی طرح کے بے شمار واقعات ہیں جن پر صرف افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

ایک شخص نے بتایا کہ امریکہ اور برطانیہ میں جب دودھ والا آتا ہے تو گھروں کے باہر دودھ کی بوتلیں رکھ کر چلا جاتا ہے مگر کسی کی کیا مجال کہ وہ بوتل اٹھا کر لے جائے لیکن اگر یہ پریکٹس پاکستان میں کی جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا صورتحال ہوگی۔

ایک بار کراچی کی ایک بس کمپنی نے فیصلہ کیا کہ بس کو کنڈیکٹر کے بغیر چلایا جائے۔ بس کے اندر ایک شیشے کا بکس رکھ دیا گیا تھا جس میں مسافروں کو اپنی ایمانداری اور اپنی صوابدید پر کرایہ کی رقم ڈالنا تھی چنانچہ اس نئے اور انوکھے تجربے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سیلف سروس بس میں شام تک صرف سو روپے برآمد ہوئے جبکہ اگر ایمانداری سے مسافر اس میں کرایہ ڈالتے تو کم از کم دو ہزار روپے موصول ہوتے۔ یہ تو چند مثالیں ہیں ہمارے اخلاقی کردار کی جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں زندگی کے ہر شعبے میں کرپشن اور لوٹ مار کا یہی حال ہے۔ جہاں کسی کا داؤ چلتا ہے وہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اگر ملاوٹ کو دیکھیں تو ہمارے ہاں کھانے پینے والی کوئی چیز ایسی نہیں جو اس برائی سے



سلی کون انجکشن سے حاصل ہونے والا دودھ پینے والی بچیاں وقت سے پہلے سن بلوغت کو پہنچ جاتی ہیں۔ الغرض یہ کہ ”سینفل کچھ نہ پھول“ والا معاملہ ہے جس چیز کو بھی ہاتھ لگاؤ اسی میں ہی کھلے نکلے ہیں مگر افسوس کہ ہمارے ہاں کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں ہے بلکہ جس اتھارٹی کو بھی ایسے مافیا کے اوپر تعینات کیا جاتا ہے وہ خود اسی کا حصہ بن جاتی ہے۔ چور پہلے ہی موجود ہیں مگر اب چوروں کو مور والا معاملہ ہو گیا ہے۔ ہر طرف لوٹ مار، افراتفری اور کرپشن کا دور دورہ ہے۔ مسافروں کی موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں سے پٹرول چوری کرنا، پانی کی ٹینل سے گلاس اٹھا کر لے جانا اور میں ہولز کے ڈھکن چوری کر لینا، یہ سب اس امر کی غماز ہیں کہ ہمارے ہاں زندگی کے ہر شعبے میں چوری، لوٹ مار اور کرپشن پائی جاتی ہے جس کے خاتمے کے لیے اسی لیے ہمارے ارباب بست و کشا نہیں سوچتے کیونکہ ہم خود اس کرپشن اور لوٹ مار کا حصہ ہیں۔

پاک ہو۔ ایک بار اکبری منڈی میں سرخ پس مرچیں رکھی تھیں جنہیں وہاں سے گزرتا ہوا ایک گدھا کھا گیا جس سے ثابت ہوا کہ مرچوں میں پھک ملی ہوئی ہے۔ اشیائے خورد و نوش اور ادویات میں ملاوٹ تو سمجھ آتی ہے مگر اب تو خربوزے اور گراما کو سکرین کا ٹیکہ لگا کر شہد سے مٹھا کر دیا جاتا ہے اور دودھ کو گاڑھا کرنے کے لیے جس قسم کے اجزا کی ملاوٹ اس میں کی جاتی ہے اگر ان اجزا کا نام لیا جائے تو شاید ابھی آپ کی طبیعت ناساز ہو جائے۔ اسی طرح گوشت کی مثال لے لیں۔ کبھی کسی نے یہ نہیں سنا تھا کہ پانی والا گوشت بھی ہوتا ہے مگر اب دکانوں پر لکھا ہوتا ہے کہ خالص گوشت 500 روپے کلو اور پانی والا گوشت 400 روپے فی کلو۔ گوشت کا ذکر آیا تو بھینس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ گوالے بھینسوں سے زیادہ سے زیادہ دودھ لینے کے لیے انہیں سلی کون انجکشن لگاتے ہیں مگر اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ

عارفہ صبح خان کا پہلا عالمی اعزاز اور گولڈ میڈلز میں ڈبل ہیٹ ٹرک کاریکارڈ



ممتاز صحافی، ادیبہ، شاعرہ، ڈرامہ رائٹر عارفہ صبح خان نے 2011ء میں فروغ تعلیم پنجاب سے مسلسل تین گولڈ میڈلز حاصل کر کے ہیٹ ٹرک کی ہے جبکہ اسی سال جسٹس ہیومن رائٹس کی طرف سے شاعری پر، عظیم آراء فاؤنڈیشن اور رائٹرز گلڈ نے ادبی خدمات پر گولڈ میڈلز دیے۔ خواجہ فرید سنگت پاکستان نے اسی سال انہیں ان کی بے پایاں علمی، ادبی اور صحافتی خدمات پر گولڈ میڈلز کے لیے نامزد کیا ہے۔ عارفہ صبح خان کو فروغ تعلیم پنجاب سے بہترین کارکردگی پر تین گولڈ میڈلز اور تین شیلڈز دی گئیں جو ابھی تک ان کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوئیں۔ انہوں نے دس سال کے قلیل عرصے میں دس مشہور زمانہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔

کھجلی

آصف فرخی

ایک شخص کی کتاب ہے ”میرم خورہ“ آکٹاؤن سے خاص دلچسپی تھی

اس نے چاقو اٹھایا اور کھیلانے والی انگلیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ جہاں جہاں سے کھجلی نہیں تھمتی تھی وہاں سے خون بہنے لگا۔ کچی سبزی کی طرح کٹ جانے والی انگلیاں اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے سمیٹ کر اس چھوٹے ہاتھ کی پیالہ بنی ہوئی تھیلی پر رکھ دیں۔

عیب دار لوگوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ اکثر وہ ان کو لے کر بیٹھتا تھا۔ رات گئے یا شام پڑے، دن کے ان خالی آکٹائے ہوئے اور بے مصرف لحوں میں، شدید مصروفیت سے چرائے ہوئے بیش

جن لوگوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے ہوں، ان کو غور سے دیکھنا اور ان کے نقص کی تفصیلات ذہن نشین کرنا اس کی خاص عادت بن چکی تھی۔ ٹنڈے لٹے لوٹے لنگڑے۔ اب تو اس نے

شام ہوگی اور دل کے مہمان آئیں گے۔ اس کی تیاری پوری رہتی۔ ایک ایک کر چلے ہوئے ایک ٹانگ کے بل، یا مٹھنے ہوئے، قیصر کی ایک خالی آستین کو پیچنے کے پیچھے چھپاتے ہوئے، حسین نکالے ہوئے، سیلے اور دھکارے ہوئے، در بدر اور

بہت ڈھونڈا مگر وہ سبھی دوبارہ دکھائی نہیں دیا۔ اس کی انگلیوں کے پتھلی کی طرف والے اندرونی حصے پر لال لال چٹیاں پڑنے لگیں۔

وہ سبھی اپنے چہرے کی تازگی کی وجہ سے یاد رہ گیا، نقص کی وجہ سے نہیں۔ اس اپنا تک احساس نے سن کر دیا۔ شدید گھن کا ایک احساس دل کی گہرائیوں سے اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ تھک چکا ہے وہ ان کی دست و پا بریدہ زندگیوں سے۔ زندگی کا سارا رس اس کے اندر کھھا ڈالا ہے ان ٹنڈ منڈ وجودوں نے۔ میں کوئی مجسمہ آزادی ہوں جو ان کے لیے مشعل اٹھائے کھڑا رہوں کہ اپنے تھکے ہارے اور در ماندہ وجود میرے سپرد کر دو..... اور خود کھڑے کھڑے پتھرا جاؤں۔ جتنے چہرے اس کے دامن میں تھے ان سب کے لیے خاصیت سے بھر گیا وہ۔

آج نیا چہرہ چاہیے مجھے، اس نے طے کیا۔ اور اس تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کوئی شاداب چہرہ، صحت مند بدن جس سے آنکھوں کو طراوت اور دل کو طمانیت ملے۔

یوں ہی چکر کاٹتا رہا کافی دیر تک وہ۔ حیدری، زمری، طارق روڈ، انٹیشن اسٹریٹ، پھر تین تنواروں کی چورنگی سے گزر کر کلفٹن چلا گیا کہ شہر کے اُبلے اُبلے چہرے یہاں دلکش اور آوارہ ملیں گے۔

دن بھر کے جس کے بعد شام ہوئی تھی اور سمندر کے رُخ سے بھیگی ہوئی، ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ دکانوں میں بتیاں ابھی جلی نہیں تھیں۔ بڑی سڑک کے متوازی سروس لینز میں پارک کی ہوئی گاڑیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ ایک خوش باش اور آسودگی سے سرشار ہجوم تھا جو دکانوں میں بچے ہوئے سامان کے سامنے سے گزر رہا تھا، فاسٹ فوڈ کی کرسی میزوں پر رک رہا تھا۔ وہ سب اسے کس قدر نوجوان، پر جوش نظر آ رہے تھے اور ثابت و سالم۔

اپنے بدن میں مکمل، ہاتھ پاؤں کے پورے.....! اسی ہجوم میں وہ لڑکی بھی نظر آئی تھی۔ اس کا چہرہ بھڑک دار نہ تھا مگر شاداب تھا۔ ایک دکان سے نکل کر دوسری دکان میں جاتی ہوئی نظر آئی۔ ہاتھ پر گرنے والے کپلے بالوں کو اُلٹے ہاتھ سے اس نے پیچھے کیا تو تلاش کرتے ہوئے قدم جیسے وہیں جم گئے، پھر اسی لڑکی کے جلوہ میں چل دیئے۔ اس کا رنگ نہ زیادہ صاف تھا نہ گہرا۔ نوعمری کی مچی مچی تازگی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر کھیل رہی تھی۔ دونوں گالوں کے کنارے تک ہلکا ہلکا رواں اُگا ہوا تھا۔ آنکھوں میں ایک دھیمی سی مسکراتی ہوئی روشنی تھی۔ اس کے ساتھ اور بھی لڑکیاں تھیں جو آئس کریم کی دکان کے سامنے رک گئیں۔ دکان والے نے فوراً ہی مسکٹ کا بنا ہوا سانچا مشین کے سامنے کر دیا اور مشین کے منہ سے گاڑھے دودھ ایسی لہریں دار آئس کریم نکلنے لگی۔ لڑکی نے باریک جھلی ایسے نیپکن میں لپیٹ کر بڑی نفاست سے آئس کریم کو سنبھالا اور ہونٹ ہٹکے سے وا کر کے کھانے لگی۔ وہ اپنی نگاہیں وہاں سے ہٹا نہ سکا۔ ہلکی سی الجھن بھی ہوئی کہ آئس کریم ہاتھ میں کیوں پکڑے ہوئے ہے، مگر وہ اس پر نظر جمائے رہا کہ کریم کی سفید تہہ اس کے ہونٹوں پر جم جاتی اور وہ ننھی سی زبان نکال کر اسے صاف کر ڈالتی۔ شاید اپنے اوپر جی ہوئی نندی آنکھوں کا احساس ہونے لگا تھا اسے، جو وہ بار بار ادھر دیکھ رہی تھی۔ اپنے ساتھ والی لڑکیوں سے کچھ کہہ رہی تھی اور پرس اٹھا کر چلنے لگی تو آئس کریم کو نہیں لگی اور سفید کون بکھرنے ہی والا تھا کہ لڑکی نے دوسرے ہاتھ سے اسے سنبھال لیا۔ ایک لمبے میں اس نے دیکھ لیا کہ لڑکی اُلٹے ہاتھ سے سارے کام کیوں کر رہی ہے اس ہاتھ کو پیچھے کیوں رکھا ہوا ہے۔ آئس کریم اُلٹے

کھال نکل آتی جس میں مرچیں لگتیں اور کھلی ہوئے جاتی، بے پناہ کھلی..... نہ رکنے والی کھلی۔ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو کھجا کر شل ہو جاتا۔ انگلیاں بڑھال ہوئے جاتیں مگر کھال کی پختی ہوئی بے چینی کم نہ ہوتی جیسے ان کے اندر آگ بھڑک رہی ہو۔

دوائیں بھی بہت استعمال کر کے دیکھ لی تھیں۔ ”ایکویما کی ایک قسم ہے یہ“ ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا ”یہ ٹیوب والا مرہم لگاتے رہے، آرام آجائے گا۔“ پہلے دو چار دن تو ذرا دیر مرہم لگانے سے رکی رہی لیکن پھر لوٹ آئی یہ کھلی، اور کھال کے اندر آگ سی لگائے رہتی، نوچ نوچ کر وہ دیوانہ ہوا جا رہا تھا اور ناخنوں کی خراش سے زخم پڑ رہے تھے انگلیوں پر۔

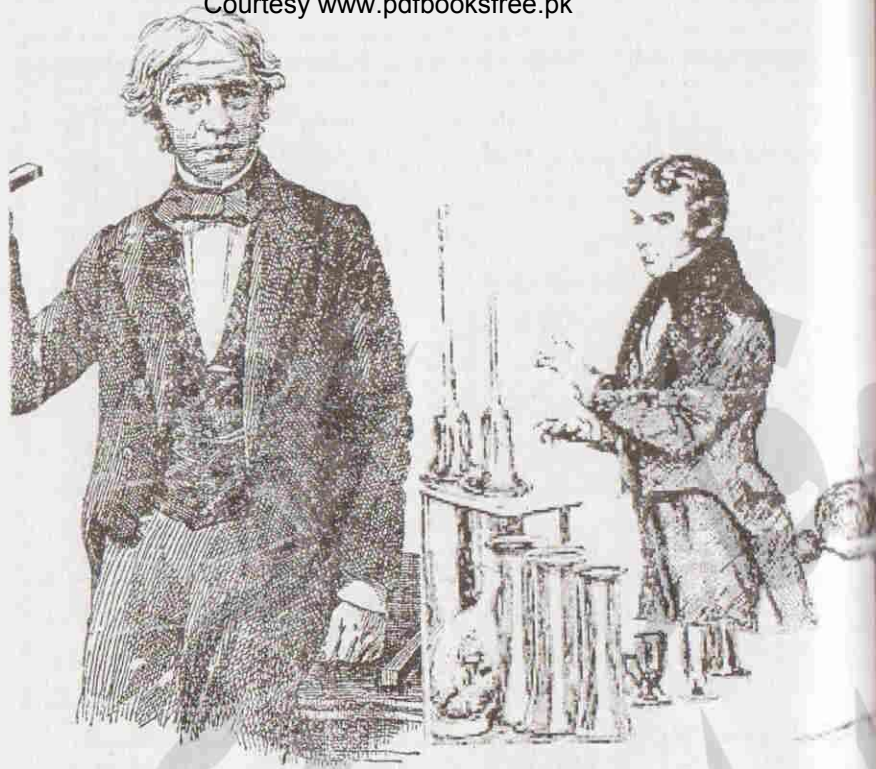
خراشیں ڈالتے ڈالتے شام ہو گئی، کھلی کی شام، آج وہ مہمانوں کی مدارات کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دل کا دروازہ بند تھا اور آنکھوں پر قفل لٹک رہا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کہاں سے آگئی وہ۔ دوپٹے میں لپیٹ کر چھوٹا ہاتھ چھپائے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے پیشانی پر گرنے والے بال سنبھالتی ہوئی باریک، سفید نیپکین سے اپنے نازک ہونٹ پونچھتی ہوئی، لہرائی ہوئی اس کے سامنے آن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ کہا نہ اس کے چہرے پر ہنسی ہوئی نظروں کو نیچے کیا بلکہ عین اس کے سامنے پہنچ کر بازو پر لیٹے ہوئے دوپٹے کو کھولنے لگی جیسے کسی تقریب میں پہنچ کر مہمان کو دیا ہوا تحفہ کھولا جاتا ہے۔ یہ اس کا وہی ہاتھ تھا جو بڑھنے سے رہ گیا تھا۔ وہ ہاتھ زندہ اور سانس لیتا ہوا وجود تھا۔ کہنی کے سامنے والے حصے میں گڑھا سا تھا جس میں نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ اوپر والا حصہ ہموار تھا۔ بالوں سے عاری اور کہیں کہیں سے ابھری

ہاتھ میں لے کر لڑکی نے سیدھا ہاتھ پیچھے کر لیا اور وہاں سے چل پڑی۔ مگر وہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہا۔ یہ نہیں کہ اس لڑکی کا ہاتھ نہیں تھا یا اس کے ہاتھ میں کسی حصے کی کمی تھی۔ ساخت کے اعتبار سے وہ ہاتھ پورا تھا مگر چھوٹا تھا۔ ایسا ہاتھ پیدائشی طور پر پورا نہیں بڑھ سکتا۔ اس کے پورے جسم کے تناسب سے چھوٹا رہ گیا تھا وہ ہاتھ اور کچھ شرمندہ شرمندہ سا لڑکا ہوا تھا۔ اس کے کندھے سے وہ مجھول اور رکا ہوا ہاتھ۔ دوپٹے کے کندھے سے لٹکا کر لڑکی نے اس ہاتھ کو یوں اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا کہ اس کا نقص فوراً نظر نہیں آتا تھا۔ ایک ناکارہ ہاتھ اور شاداب بدن والی لڑکی کو دور ہوتے ہوئے جھوم میں گم ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔

کیا اس ہاتھ میں لمس کا احساس ہوتا ہوگا؟ کیا اس نے اپنے آپ کو عادی بنا لیا ہوگا کہ دونوں ہاتھوں کی پہنچ برابر نہیں ہے؟ اس کے باقی جسم کے مقابلے میں اس کے ہاتھ کی ساخت کی کیا عمر ہو گی؟ عمر کی کس منزل پر پہنچ کر اس کی بڑھوتری رک گئی ہوگی اور کیوں؟ وہ ان سارے سوالوں سے چوٹکا تو احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں کھلی ہوئے جا رہی ہے۔

اس نے دوسرے ہاتھ کے ناخنوں سے کھجایا اور کھلی والے ہاتھ کا رنگ سرخ ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کھجائے کھجائے مرچیں جو لگ رہی تھیں۔ وہاں سے خون نکل آیا مگر کھلی میں کمی نہیں ہوئی۔

ہتھیلی کے زرخ پر، انگلیوں کا اندرونی حصہ، جہاں سے وہ پانچوں شاخ کی طرح ہتھیلی سے جڑی ہوئی تھیں، وہاں سے کھال موٹی پڑ گئی جیسے بار بار چھل چھلی ہو۔ اس میں سے پانی نکلنے لگا اور درخت کی چٹی چھال جیسی سفید پڑی اترنے لگتی، اندر سے پچھی اور لال لال، ادھ بنی سی



کامران احمد خان

مائیکل فرایڈے

برقی مقناطیسیت سے متعلق ہمارے نظریات میں فرایڈے کا قانون بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اگرچہ آج کے دور میں جدید برقی جزیر ہمارے شہروں اور کارخانوں میں برقی توانائی مہیا کرتے ہیں اور فرایڈے کے آلے سے کہیں زیادہ موثر اور تھیں ہیں مگر ان کی بنیاد ہی فرایڈے کا برقی مقناطیسی آلہ ہے۔

جدید جزیرہ زور اور برقی موثر کے موجد عظیم سائنسدان کی داستان حیات

برقیات کا استعمال سرایت کر چکا ہے۔ برقیات پر کنٹرول حاصل کرنے میں بہت سے افراد کی بے انتہا کوششوں کا عمل دخل ہے، چارلس آگسٹن، ڈی کولمب، کاؤنٹ ایسڈرو دونائ، آندریس ماریا وغیرہ نے اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے مگر

یہ برقیات کا دور ہے، اگرچہ اسے خلائی اور ایسی دور بھی کہا جاتا ہے لیکن اگر ہم اپنی روزمرہ زندگی پر نظر دوڑائیں تو جس قدر برقیات کا اثر ملتا ہے وہ کسی اور چیز کا نہیں۔ ٹیکنالوجی کا عنصر اس حد تک جدید دنیا میں سرایت نہیں کر پایا جس حد تک

وہی کھلی!

اس نے گھبرا کر انگلیوں کی طرف دیکھا۔ جہاں سے اس نے انہیں کٹا دیا تھا وہاں ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں جیسی انگلیوں پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اور تمام انگلیوں کو پٹیتی ہوئی ایک بڑی سی پٹی ہاتھ تک بندھی ہوئی تھی۔ ہاتھ ایک جگہ ساکت تھا اور اس کا اتنا بوجھ تھا کہ اسے جنبش بھی دینا مشکل تھا۔

جس جگہ انگلیاں سرے سے رہ ہی نہیں گئیں، وہاں حرکت کا احساس کیوں ہو رہا ہے؟ اس نے سفید کوٹ پہنے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا جو لوہے کے اس پانگ کے پائنتی کھڑا ہوا تھا۔

”ایسا ہو جاتا ہے“ ڈاکٹر نے اسے تسلی دینا چاہی۔ ”اسے Phantom reflex کہتے ہیں۔ کٹے ہوئے حصے کی جگہ جسم میں ایک احساس کچھ مدت تک باقی رہتا ہے۔ اصل میں، آپ amputation کے جس صدمے سے گزر رہے ہیں، اس کی وجہ سے.....“

ڈاکٹر کی آواز کھوکھلی پڑنے لگی۔ بندھا ہوا اور بھاری ہاتھ اس تک پہنچنے کے قابل نہیں تھا اور وہاں بے تحاشا کھلی ہوئے جا رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اب نہیں کھایا تو کھال پھٹ پڑے گی۔

”جب میری انگلیاں کٹ چکی ہیں تو ان میں کھلی کیوں ہوئی چلی جا رہی ہے؟“ اس نے چیخ کر کہا۔ ڈاکٹر اس کے بستر کے سامنے، سفید کوٹ کی بیسیوں میں ہاتھ ڈالے چپ چاپ کھڑا تھا۔ ڈاکٹر کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے عینکے میں منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ہوئی رگوں کی گزرگاہ۔ پٹیلی کا پیالہ سا بنا ہوا تھا اور انگلیاں پوری تھیں۔ پلاسٹک کی گڑیا کے ہاتھ کی طرح ایک خاص انداز میں ٹھہری ہوئی تھیں وہ انگلیاں، جیسے کچھ پکڑنے کے لیے کھلی ہوئی ہوں۔ دوپٹے میں لپیٹا وہ ہاتھ اب اس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔

تب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ انگلیاں کیا پکڑنے کے لیے اٹھی ہوئی ہیں۔ وہ ہاتھ پورا ہوتے ہوئے بھی کیوں چھوٹا رہ گیا۔ اس کی کھلی کا علاج کیا ہے۔

اپنی ہوئی اور کرنی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے چاقو اٹھایا اور کھیلانے والی انگلیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔

جہاں جہاں سے کھلی نہیں تھمتی تھی وہاں سے خون بہنے لگا۔ مٹی بزی کی طرح کٹ جانے والی انگلیاں اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے سمیٹ کر اس چھوٹے ہاتھ کی پیالہ بنی ہوئی پٹیلی پر رکھ دیں۔ وہ دوسرے ہاتھ سے دیوار کا سہارا لینے لگا مگر دیوار ہاتھ کی گرفت سے پھسل گئی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

اس کے بعد اس کے ساتھ کیا گزری ہوگی، یہ اسے معلوم نہیں۔ آنکھ کھلی تو دیکھا تانائوس دیواریں چاروں طرف ہیں، وہ بستر میں پڑا ہوا ہے، اس کے پکڑے اترنا کر دھاری دار اور ڈھیلا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ پانگ لوہے کا ہے اور اس کے برابر اسی طرح کی چھوٹی سی الماری ہے جس پر دواؤں کی شیشیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اسے کسی نے ہسپتال پہنچا دیا ہوگا۔ مگر میں تو اس وقت شاید کوئی اور نہیں تھا، یہاں لانے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ کہیں وہی لڑکی تو نہیں جس کا ہاتھ..... اور پھر وہی بہت جانی بچانی اور سہا دینے والی آگ..... پھر

ان سے کہیں زیادہ اہمیت مائیکل فراڈے کے کام کو حاصل ہے۔

مائیکل فراڈے نیوٹنٹن سرے، انگلستان میں 22 ستمبر 1791ء کو پیدا ہوا۔ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ مائیکل فراڈے کا باپ جیمز فراڈے اور ماں مارگریٹ چھوٹے چھوٹے محنت مزدوری کے کام کر کے گزارا کیا کرتے تھے۔ مائیکل نے اپنی ذاتی کمائی سے ابتدائی تعلیم مکمل کی اور 13 سال کی عمر تک گھر گھر اخبار پھیلنے کا کام کرتا رہا۔ چودہ برس کی عمر میں وہ چارج رائی بان نامی جلد ساز اور کتب فروش کے ساتھ کام کرتا اور جلد بندی کے لیے آنے والی تمام سائنسی کتب کا بھرپور مطالعہ کرتا رہا۔ بچپن میں اس نے ایک انسائیکلو پیڈیا کا مطالعہ کیا جس سے سائنس خصوصاً برقیات کے متعلق اس کی دلچسپی میں بے حد اضافہ ہوا۔

فراڈے نے شام کے وقت سائنس کے لیکچر لینے بھی شروع کر دیے۔ وہ ان لیکچرز کے احتیاط سے نوٹس بناتا اور دکان پر ان کی جلد بندی کر لیتا۔ ایک روز اسے مشہور برطانوی سائنسدان ہمفری ڈیوی کے لیکچرز کے کورس کے پاسز مل گئے۔ فراڈے نے ڈیوی کے لیکچرز سننے اور ان کے بھی احتیاط سے نوٹس تیار کر لیے۔ بعد ازاں اس نے ان نوٹس کی جلد بندی کر کے انہیں ایک کتاب کی صورت دی اور اسے پروفیسر ڈیوی کو ارسال کر کے ان کے معاون کے طور پر ملازمت کی درخواست کر ڈالی۔ ڈیوی لڑکے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گلن دیکھ کر بے حد متاثر ہوا اور اس نے فراڈے کو اپنے پاس لیبارٹری اسٹنٹ کے طور پر ملازم رکھ لیا۔ اسے لیبارٹری کی بالائی منزل پر رہائش بھی مل گئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد ڈیوی اسے اپنے ساتھ سائنسی دورے پر لے گیا، اس دورے میں فراڈے کو جیڑس، ٹاکس،

ٹیورینون، روم اور نیپلز جیسے شہر دیکھنے اور نامور سائنسدانوں سے مل کر بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اس دورے سے اس کے اندر علم اور سائنسی دریافتوں کی پیاس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ایک بار جب عظیم سائنسدان ہمفری ڈیوی سے پوچھا گیا کہ اس کی سب سے اہم ترین دریافت کون سی ہے تو اس کا جواب تھا ”مائیکل فراڈے۔“

فراڈے نے ڈیوی کے معاون کے طور پر سائنسی علوم سیکھنے میں انتہائی محنت کی، اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنا بقیہ وقت انگریزی گرامر، ڈرائنگ اور خطابت کے فنون کا مطالعہ کرتے گزارتا۔ چند سالوں میں ہی فراڈے نے اپنے طور پر اہم دریافتیں کیں۔ اگرچہ اسے ریاضیات میں اچھی شہدہ حاصل نہ تھی لیکن ایک تجرباتی طبیعیات دان کے طور پر اس کی اہلیت غیر معمولی تھی۔

برقیات کے شعبے میں فراڈے نے اپنی پہلی ایجاد 1821ء میں کی۔ دو برس قبل اورسٹڈ نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ ایک معمولی مقناطیسی قطب نما کی سوئی اس وقت مڑ جاتی ہے اگر اس کے قریب کسی تار میں سے برقی کرنٹ گزرے۔ اس پر مزید تحقیقات سے فراڈے اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر مقناطیس کو ایک جگہ جما کر رکھ دیا جائے تو اس طرح اس تار کو اس کے گرد گرد گھمایا جاسکتا ہے۔ وہ اس اصول پر کام کرتا رہا اور بالآخر ایک انوکھی ایجاد کرنے میں کامیاب ہوا۔ جس کے تحت ایک تار، جب تک کہ اس میں برقی لہر دوڑتی رہتی، مقناطیس کے گرد متاثر حلقے میں مسلسل گھومتی رہتی تھی۔ درحقیقت فراڈے نے جو شے بنائی تھی وہ پہلی برقی موٹر تھی۔ فراڈے کی ایجاد آج دنیا میں موجود تمام برقی موٹروں کے مبداء کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔

میں طاقت کے مقناطیسی خطوط اور طاقت کے برقیاتی خطوط جیسے تصورات کو متعارف کروایا۔ 1846ء میں روشنی کی نوعیت پر کام کرتے ہوئے اس نے برقی مقناطیسی نظریہ کی بنیاد رکھی۔ اس نے روشنی اور مقناطیسی کشش کے باہمی تعلق پر تحقیق کر کے برقی مقناطیسیات کے شعبے کے جدید نظریات کی بنیاد رکھی۔ فراڈے نے یہ بھی دریافت کیا کہ اگر قطب شدہ روشنی کو ایک مقناطیسی حلقے میں سے گزارا جائے تو اس کی سمت بدل جائے گی۔ یہ دریافت بھی بے حد اہم تھی کیونکہ یہ اس حقیقت کی طرف اولین اشارہ تھا کہ روشنی اور مقناطیسیات کے درمیان تعلق موجود ہے۔

فراڈے کے نظریات اور دریافتوں پر بعد ازاں ایلبرٹ آئن سٹائن نے کام کیا۔ مزید یہ کہ فراڈے اور میکس ویل کے کام نے ریڈیو کی ایجاد کے لیے بھی راہ ہموار کی۔ فراڈے ایک تجرباتی طبیعیات دان ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم قدرتی فلاسفر بھی تھا۔ اس کے تجربات اور دریافتوں کا سلسلہ بے حد وسیع ہے۔ وہ سائنسی دریافتوں کے حوالے سے ایک اچھا خطیب بھی تھا۔ اسے بے شمار اعزازات اور انعامات کی پیشکش کی گئی مگر وہ سادہ اور سیدھی زندگی بسر کرتا چاہتا تھا۔ اس نے برطانوی حکومت کی طرف سے نواب بننے کے موقع کو مسترد کر دیا اور ”برٹش رائل سوسائٹی“ کی صدارت کے عہدہ کی پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا۔ اس کی طویل ازدواجی زندگی بے حد خوشگوار تھی مگر وہ لاولد ہی رہا۔ 25 اگست 1867ء کو اس عظیم ترین سائنسدان نے ہینرٹ کورٹ سرے میں اپنی آخری سانسیں لیں اور وہیں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

یہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا تاہم اس کا عملی اطلاق محدود تھا۔ فراڈے کو یقین تھا کہ کوئی ایسا طریقہ وضع کیا جاسکتا ہے جس سے مقناطیسیات کو برقی لہر پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ وہ ایسے طریقہ کار کی تلاش میں سرگرم ہو گیا۔ اس دوران فراڈے نے اپنے استاد پروفیسر ڈیوی کی کان کھونے میں استعمال ہونے والا خالص لیپ ایجاد کرنے میں معاونت کی۔ اس لیپ کو ”ڈیوی لیپ“ کے طور پر جانا جاتا ہے۔

جون 1821ء میں فراڈے نے سلور سمٹھ کی خوبصورت بیٹی سارہ برنارڈ سے شادی کر لی، دونوں کی ازدواجی زندگی انتہائی خوشگوار ثابت ہوئی۔ 1831ء میں فراڈے نے دریافت کیا کہ اگر مقناطیس کو دو متوازی تاروں کے بیچ خلا میں سے گزارا جائے تو جب تک برقی لہر وہاں سے گزرتی رہے گی مقناطیس بھی متحرک رہے گا۔ اس عمل کو برقی مقناطیسیات (Induction) کہتے ہیں۔ اس قانون کو ”فراڈے کا قانون“ قرار دیا گیا اور یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔

برقی مقناطیسیات سے متعلق ہمارے نظریات میں فراڈے کا قانون بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اگرچہ آج کے دور میں جدید برقی جزیئر ہمارے شہروں اور کارخانوں میں برقی توانائی مہیا کرتے ہیں اور فراڈے کے آلے سے کہیں زیادہ موثر اور نفیس ہیں مگر ان کی بنیاد وہی فراڈے کا برقی مقناطیسی آلہ ہے۔

فراڈے نے کیمیا کے شعبے میں بھی گراں قدر اضافے کیے۔ اس نے گیوس کو مانع حالت میں ڈھالنے کا طریقہ دریافت کیا اور ”بینزین (Benzene)“ سمیت متعدد کیمیائی عناصر دریافت کیے۔ یہ فراڈے ہی تھا جس نے طبیعیات



پروفیسر محمد ظریف خان

بدو سے بچو

ایک روز اسے جرأت کے جھوٹ کا پول کھولنے کا موقع مل گیا۔ جرأت نے اسی انگیز سے ”آفتاب“ (ڈھکن دار لوٹا) مانگا جو کچھ فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ جواباً کثیر نے کہا میں یہاں تو کوئی آفتاب نہیں ہے۔ اس پر جرأت ناراض ہو کر بولے ”اوری غیبانی!..... دیتی کیوں نہیں؟..... وہ سامنے تو دھرا ہے۔“

عبرت انگیز واقعات: جب ظالموں نے خدا کے قہر کو آزمادی

ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان بُرے وقت میں اللہ سے ضرور مدد طلب کرتا ہے یا ظلم و ستم کے خلاف فریاد بھی کرتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر موجودہ دور تک عام انسان تو کچا کچی پیچیدہوں، انبیاء کرام اور اولیائے عظام تک نے زندگی میں بھی

دعا کے معنی ہیں ”مانگنا، پکارنا، آواز دینا یا التجا کرنا۔“ شرعی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کو پکارنے یا اس سے کچھ مانگنے کو ”دعا“ کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کسی کے ظلم و ستم، نا انصافی یا زور زبردستی پر اللہ کو پکارنے، دہائی دینے یا فریاد کرنے کو بددعا کہا جاتا

”خدا کرے والی کو ان اناروں کا رس نصیب نہ ہو۔“

یہ بات سن کر ایک سپاہی نے باغبان کو سخت زد و کوب کیا اور پھر حکمران سے اس کی شکایت بھی لگا دی۔ والی کے کانوں تک جب باغبان کی یہ بددعا پہنچی تو اس نے غصہ میں آگ بگولا ہو کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ باغبان کو گرفتار کر کے اس کے حضور پیش کیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور باغبان کو زنجیروں میں جکڑ کر حکمران کے سامنے لایا گیا۔ اس وقت تک والی انار کے رس سے بھرا ہوا پیالہ اپنے سامنے رکھ چکا تھا۔ اس نے پہلے تو باغبان کو ایک چھڑی سے خوب مارا۔ حتیٰ کہ وہ ہلہلہان ہو گیا۔ پھر بولا:

”یہ دیکھ! یہ ہے انار کا شربت..... اور یہ میں..... میں تیرے سامنے یہ شربت پٹوں گا اور اس کے بعد تیرا سر بھی قلم کر دیا جائے گا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے وہ بڑا سا پیالہ اٹھا کر اپنے منہ سے لگا لیا لیکن ابھی پیالے کے کناروں نے ہی اس کے لبوں کو چھوا تھا کہ اس کے قلب پر شدید دورہ کا حملہ ہوا اور آن واحد میں بددعا کے اثر سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ انار کے شربت سے بھرا ہوا پورا پیالہ تو درکنار اس کے حلق سے ایک قطرہ بھی نہ اتر سکا۔

یوں تو اس حوالے سے واقعات بے شمار ہیں مگر میرا خیال ہے کہ صرف ان دو سچی کہانیوں ہی سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بددعا سے محفوظ رکھے۔ ہم کسی پر ظلم و زیادتی یا حق تلفی کر کے برے کلمات کے مستحق نہ بنیں (آمین)

کرو نیکیاں، بددعا سے بچو
میرے بھائی! قہر خدا سے بچو



موصوف کو بادشاہ کی حسین بیگمات کا دیدار بھی ہو جایا کرتا۔ ان کی بعض حرکات و سکنات ایک کینز کی نظر میں مشکوک تھیں۔ اس ذہین لڑکی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شخص اندھا نہیں بلکہ ناپائیدار پن کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ ایک روز اسے جرأت کے جھوٹ کا پول کھولنے کا موقع مل گیا۔

ہوا کچھ یوں کہ جرأت نے اسی کینز سے ”آفتابہ“ (ذہکن دار لونا) مانگا جو کچھ فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ جواباً کینز نے کہا میاں یہاں تو کوئی آفتابہ نہیں ہے۔ اس پر جرأت ناراض ہو کر بولے ”اری غیبیانی!..... دیتی کیوں نہیں؟..... وہ سامنے تو دھرا ہے۔“

بس پھر کیا تھا؟ کینز نے شور مچا چا کر بیگمات، شہزاد یوں اور کینزوں کو جمع کر لیا اور انہیں بتایا کہ اس ”مردوئے“ کو تو سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ اس نے جرأت کو بددعا دیتے ہوئے کہا ”اللہ کرے تیرے دیدے پنم ہو جائیں۔“ اور یہی ہوا۔ چند روز بعد جرأت کو نہ صرف دربار سے نکال دیا گیا بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے آنکھوں کا نور بھی کھو بیٹھے۔

دوسرا واقعہ ایران کے صوبہ خراسان کے والی مظفر الملک سے متعلق ہے جو سولہویں صدی کے وسط میں وہاں کا حکمران تھا۔ اس میں چند ذاتی خوبیاں بھی تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے صوبے کے عوام کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ اس کی نظر ایک غریب کسان کے باغ پر پڑی جہاں انار کے درخت سرخ سرخ رس دار پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ اس نے چند سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اس باغ سے تمام پختہ انار توڑ کر لے آئیں۔ سپاہیوں نے گورنر کے حکم کی تعمیل کی اور تمام درخت نوج ڈالے۔ غریب باغبان وہیں کھڑا آنسو بہاتا رہا۔ اس وقت اس کے منہ سے با آواز بلند یہ بددعا نکلی:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
اسی بددعا کے حوالے سے دو عبرت انگیز واقعات ہدیہ قارئین ہیں۔

اردو کے ممتاز شاعر شیخ قنندر بخش جرات، مغل بادشاہ، شاہ عالم کے درباری شاعر اور مصاحب تھے۔ شاعر ہونے کے ناطے وہ بڑے حسن پرست اور دل پھینک بھی تھے۔ انہوں نے محل کے اندر آنے جانے اور کینزوں کے ساتھ شہزاد یوں پر نظر رکھنے کا ایک خوب طریقہ نکالا۔ انہوں نے اپنے مصنوعی ناپائیدار پن کی تشہیر کی اور درباری حکیم کو بھی اپنی مٹھی میں لے لیا جس نے ان کے ناپائیدار پن پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ جب شاہ عالم انہیں اپنے ہمراہ کمرۂ خاص میں بھی لے جایا کرتے۔ اس طرح

نہ کبھی کسی ظالم یا حق تلفی کرنے والے کو بددعا دی ہے۔ البتہ ہمارے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ایسے عظیم المرتبت پیغمبر اور انسان کامل ہیں جنہوں نے کفار مکہ تک کو بددعا نہ دی حالانکہ انہوں نے آپ ﷺ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیئے تھے۔ آپ ﷺ کے اسی وصف اور شان رحیمی و کرمی کو مولا نا مہار القادری نے کچھ اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دشگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بھوکے پیاسوں کو قانس دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں
اللہ تعالیٰ مظلوم کی بددعا یا فریاد سنتا اور ظالم کو سزا ضرور دیتا ہے کیونکہ

کراچی میں سیارہ ڈائجسٹ کے سول ایجنٹ

تازہ شماروں، خاص اسلامی نمبروں اور
دیگر کتابوں کی خریداری کے لئے براہ کرم

گلستان میوزیم

فریر مارکیٹ۔ فریر روڈ کراچی سے رابطہ کریں۔ 733755, 7762443

Email: sayyaradigest@gmail.com

240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن۔ 042-7245412

میرے ابتدائی چند افسانے شائع ہونے تک
جسم میں ہائی سکول کے دور کی چستی اور پھر تیل پین
ابھی موجود تھا۔ خدا معلوم محکمہ تعلیم کی کوئی مجبوری تھی
یا ہماری بد چستی کہ جو فریکل ٹریننگ انسٹرکٹر ہمارے
سکول میں پوسٹ ہوئے وہ سابق فوجی تھے۔ اس

کر لے۔ نظری عینک گلنے کے سبب میں بغیر ایم بی ایس کے کچھ ڈاکٹر ڈاکٹر سا گلنے لگا تھا۔ بد قسمتی سے چہرے پر چونکہ لڑکپن جھلکتا تھا اس لیے پی ایچ ڈی ڈاکٹر گلنے کی خواہش شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتی تھی۔ حالانکہ کلین شیو کی بجائے اب ذرا ہماری اور اور سائز (Over size) مونچھیں بھی رکھ لی تھیں۔ بال قدرے الجھائے رکھتا اور لباس کے معاملے میں بھی کچھ اس طرح کی لاپرواہی برتنا شروع کر دی کہ گریبان کے اوپر والے دونوں بٹن اور خصوصاً آستین کٹے چھوڑ دیئے جاتے۔ اپنی شخصیت میں فلسفیانہ رنگ بھرنے کے لیے سوئنگ جیسی بہت بڑی کمی کو بھی جلد رفع کر لیا۔ شروع میں مشکل پیش آئی۔ سگریٹ نوش جان کرتے ہوئے چکر آتے۔ آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ منہ میں کچا کچا سا پانی بھر جاتا اور راکھ خصوصاً نیکیائی پر ضرور گرتی اور اس کی عدم موجودگی میں لباس کے باقی حصوں پر مار کرتی۔ تاہم میرے عزم مصمم کے مقابل یہ سب رکاوٹیں بچھ نہیں۔ اب میں خود کو مکمل طور پر ایک سنجیدہ پُر خیال اور وسیع تر امکانات کا حامل ادیب تصور کرنے لگ گیا تھا لہذا سر راہ چلتے ہوئے یوں محسوس ہوتا جیسے لوگ پیچھے مڑ مڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہے ہوں کہ اس منفرد شخص کو کہیں دیکھا ہے۔ گویا میرے وطن کے نوے فیصد لوگ ادب کے رسیا ہو گئے ہوں۔

کھڑا ہمارے نشین پر غنم کی ریل جالی ہے نہ مرتا ہوں نہ جیتا ہوں عجب قسمت ہماری ہے

شیشی بھری گلاب کی میں پتھر پہ توڑ دوں گا خط کا جواب نہ آیا تو میں اسے سر کو چھوڑ لوں گا میں ان دونوں حضرات کو جواب نہیں دے سکا۔ بزرگ مکتوب نگار سے مجھے خدشہ تھا کہ اگر میں نے انہیں ایک خط لکھ دیا تو وہ بہت سے تحفے تحائف لے کر بخش نفیس ملنے چلے آئیں گے۔ پلہر دوست کو اگر میں ایک موقع دے دیتا تو وہ اپنی پوری میاض ارسال کر دیتا یا کسی ممتاز میگزین کے کچھ شمارے بھیج دیتا جس میں اس کے بہت سے شعری انتخابات یا تخلیقات شائع ہو چکی ہوں گی۔ کچھ مزید نامے میرے نام آئے تو ان میں سے ایک کسی خاتون کی طرف سے تھا۔ میں نے اس دم ایسا محسوس کیا جیسے میں ایک نیار یا ہوں اور میری تغاری میں ریت اور راکھ کا آمیزہ، سارے کا سارا اچانک پائے کا سوتا بن گیا ہے۔ میں نے گھر کے ہر مناسب حصے میں جا کر خط کو بغور پڑھا۔ سب سے پہلے ہاتھ روم میں گھس کر، چھت پر اور پھر باہر والے برآمدے میں۔ اچانک مجھے لگا کہ موسم بہت

خوشگوار ہو گیا ہے اور ایسے میں گھر گھسے رہنا پرلے درجے کی بدذوقی ہوگی۔ میں چلتے چلتے شہر سے باہر نکل گیا۔ مجھے اس روز ہر منظر قدرت نے محسوس کیا۔ میں نے کئی بار خط کو پڑھا اور مسرور ہوا۔ دل میں سوچا کہ ایک عظیم افسانہ نگار ہونے کے ناطے مجھے اپنی پہلوئگی کی پرستار ہستی کو مایوس نہیں کرنا چاہیے۔ معاملے کی اہمیت کے پیش نظر خط و کتابت پر انحصار کرنا محض وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔

بنس نفیس مکالمہ کرنے کا اہتمام کرنا لازم ہے۔ اس نے خط میں اپنا تفصیلی تعارف کرانے میں ذرا بھر بھی بخیلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جس طرح سے اسے افسانے لکھنے کا شوق ہے، اگر وہ میری جانب سے عدم توجہی یا غیر ضروری تاخیر کی وجہ سے ناامید ہو کر کسی سال خوردہ گھاگ مدیر کے اٹھے چڑھ گئی تو اس کی تعبیر کا بھی ہرج ہوگا اور کیا خبر کہ مدیر محترم اسے اپنے ہمراہ ادب کی کسی انجانی پگھلڈی پر لے کر نکل پڑیں، لیکن راہ میں اجل سے مٹ بیٹھ ہو جانے پر طبعی عروپوری کر چکیں تو موصوفہ کسی اندھے ادبی جنگل کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جائے۔ بحیثیت ادیب اپنے زمانے کی اعلیٰ قدروں کا امین ہونے کے ساتھ ساتھ میں چونکہ سچے، انمول اور کوئل انسانی جذبوں کا بھی بھرپور ادراک رکھتا تھا، اس لیے کسی بھی طور ایسی مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کر کے اپنی ہی نظروں میں رسوا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ نیک کام میں دیر، چہ معنی دار، میں نے اسے خط لکھا کہ میں اتفاق سے چار پانچ روز بعد اس کے شہر آ رہا ہوں۔ وہاں ایک دو ادبی جرائد کے مدیران نے بڑے خلوص اور محبت سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے تاہم میں وہاں پہنچ کر فون کے ذریعے اپنی جملہ مصروفیات سے آگاہ کر سکوں گا۔ میں نے اسے اپنی فین (Fan) کہہ کر یاد

کرنے سے اجتناب برتا کیونکہ اس طرح ایک نہایت ہی خوبصورت سے معنی اور سبک سے مفہوم کا لطف زائل ہو جاتا۔ چونکہ فین کے عام فہم مروج لغوی معنی پگھلا ہوتے ہیں اور یہ مذکر ہے۔ اسی لیے فین کا لفظ ریٹم ریٹم سے احساس میں بری طرح رٹ کئے لگتا لہذا میں اسے پرستار کہنے میں زیادہ خوش محسوس کرتا۔

امان نے مجھے ابا سے چوری زادراہ کے لیے اتنی رقم دے دی کہ شاد کام ہو گئیں اور یہ باور کر بیٹھیں کہ ان کا بیٹا شہزادوں کی طرح سفر کر سکے گا اور ایک بڑے شہر میں اعلیٰ طعام و قیام کا تحمل ہو سکے گا حالانکہ اصل صورت حال کچھ ایسی تھی کہ اگر میں انتہائی کفایت شعاری سے خرچ نہ کرتا تو واپسی پر مجھے پرستار سے ادھار مانگنا پڑتا یا بربل سڑک کسی متمول راغبیر کو روک کر بیٹانا پڑتا کہ میری جیب کٹ گئی ہے یا یہ کہ میں شکر گڑھ کا رہنے والا ہوں اور سیلاب میں میرا گھر بہہ گیا ہے۔ اس لیے پچھلے کئی روز سے کچھ کھایا بھی نہیں۔ میں رات دیر سے ہیر یا پھنچا۔ بھوک لگ رہی تھی، ایک اصلی دانشور کی طرح صرف کپ چائے پر گزارا کر لیا۔ نشین کے باہر ہی ایک ایسے ہول میں کمرہ لیا جو تیرے درجے سے ذرا اوپر اور درمیانے سے کافی نیچے تھا۔ سفر کی تھکان کے باعث قرین قیاس تھا کہ دوسری صبح دس بجے تک مردار کی طرح سویا رہتا لیکن رات فاقے سے تھا۔ کتا زیادہ زور سے بھونکا تو بیدار ہو گیا۔ ایک پابند صلوٰۃ مؤمن کی طرح پہلی اذان کی آواز پر بستر چھوڑ دیا۔ صلوٰۃ کے لیے نہیں، کیونکہ جب سے یہ حقیقت مجھ پر کھلی تھی کہ میری ذات میں ایک فنکار پوشیدہ ہے تو نماز کی ادائیگی میں بے قاعدگی در آئی تھی۔ اس سے اگلے مرحلے پر جب میری نگارشات شائع ہونے لگیں تو جمعہ کی نماز بھی

میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ جلد ہی مجھے چند اونگے اونگے سے خطوط موصول ہوئے۔ دو بیرون ملک سے بھی تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ مکتوب نگار بہ سلسلہ روزگار باہر مقیم ہیں۔ بہت اداں ہو چکے ہیں۔ یقیناً ناسٹیلیا کے زیر اثر ہیں۔ تصویر سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک صاحب تو میرے ابا حضور کے ہم عمر ہیں۔ انہوں نے ہر دو فقروں

چھوٹ گئی۔ اب زندگی کا معمول بنتا جا رہا تھا کہ رات بھر جاگتا اور دن کو سوتا۔ لگتا تھا کہ اسی طرح بے درپے ادبی منزلیں مارتا رہا تو آئندہ عید بقرعید بھی سوکر مٹانے لگوں گا۔

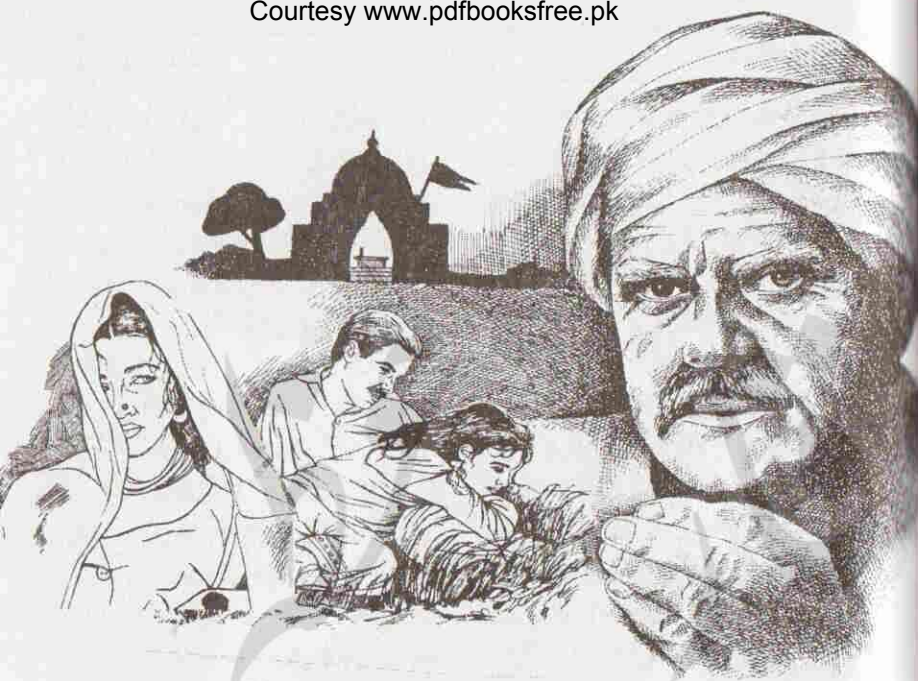
ٹیکے کا کونا اٹھا کر ٹیک ہاتھ میں لی تو گولڈن فریم میں سے دہنی سائیز کا شیشہ باہر جا پڑا۔ دھندلے مناظر میں سے راستہ بناتے ہوئے باہر آ گیا۔ فائو سٹار ناشتہ کرنے کی غرض سے ایک فٹ پائسی موبائل ریٹورنٹ پر نظر انتخاب پڑی۔ گرم گرم پوریاں اور چنے خوب شکم سیر ہو کر کھائے۔ گزشتہ رات کے فاقے سے زائل شدہ توانائی کو پورا کرنے کے لیے حلوے کی پلیٹ بھی آگے سرکالی۔ پیٹھ احتیاطاً سڑک کی جانب اور چہرہ دیوار کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ نہ جانے کس خیال کے زیر اثر گم ہو گیا۔ حلوے کا آخری نوالا منہ میں رکھا تو ننگے سے بیشتر اچانک جبروں کی گرفت میں کسی ہڈی کا ٹکڑا کڑکڑایا۔ حیرت ہوئی کہ حلوے میں ہڈی کا کیا کام لیکن اسی اثناء میں دماغ اور جسم کے اندر سنسناء ہٹ ہونے لگی اور منہ میں خشک ہوا کا جھونکا سرسراہٹ لگا۔ عقدہ کھلا کہ سامنے والے دونوں دانتوں کی جگہ کھڑکی وا ہو گئی ہے۔ ہونٹ میچ کر ادھر ادھر دیکھا، کبھی لوگ سر جھکائے ہبڑ دھڑکھانے میں مصروف تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ میں نے نظر بچا کر حلوے میں تھڑا ہوا دانتوں کا جڑواں خول باہر نکالا تو بن دانتوں کے اپنے متوقع حلیے کے بارے میں سوچ کر خوفزدہ ہو گیا۔ میرا جی چاہا کہ میں خون کے آنسو روؤں۔ کمرے میں واپس آیا۔ دانتوں کے شکستہ خول کو اچھی طرح دھو کر غور سے معائنہ کیا تو اس کا ایک حصہ ٹوٹا ہوا پایا۔ میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو بچ روٹا آ گیا۔ ہاف سیٹ چائے منگوائی۔ یہ بھی ایک عجیب تجربہ تھا کہ چائے پیتے

ہوئے ہر گھونٹ کے ساتھ ایک دو قطرے کھڑکی میں سے بہہ نکلتے۔ سارے پیسے پورے کرنے کے لیے ساری چائے پی لی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر منہ میچ کر بونے کی کوشش کی جو ممکن العمل ثابت نہ ہو سکی۔ بالآخر ایک انوکھا ٹوکھا سوچا۔ نیچے آ کر پان سگریٹ کی دوکان سے سفید رنگ کی چیونگم خریدی اور اوپر کمرے میں آ گیا۔ چیونگم خوب چبائی اور ٹوٹے ہوئے خول میں بھر کر ٹیڈ منڈ بد رنگے دانتوں پر چڑھا لیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر انہیں اپنی اصل جگہ پر بھایا۔ یہ ایک تکلیف دہ مشق تھی۔ دیر تک باچھیں کھلی رکھنے اور مسلسل کھچاؤ کی وجہ سے جڑے، ہونٹ اور ان سے متعلقہ جلد اینٹھ گئی۔ چیونگم کی ایک ہلکی سی تہہ ٹیک کے فریم کی اندرونی جھری میں لپ کی اور شیشہ فٹ کر دیا۔ دہنی سائیز کے قبضے کا تنھا سا سکریو چوڑیاں ناکارہ ہونے کے باعث ڈھیلا ہو گیا تھا۔ میں نے سارے غم بھلا کر یکسوئی اور محنت سے شیو اور غسل کیا۔ اس دوران میری طبیعت بہت بوجھل ہو چکی تھی۔ تیاری مکمل ہونے تک کھنی ڈکاریں آنے لگیں۔ میں جب بھی کسی سفر پر جایا کرتا تھا تو اماں میرے سفری تھیلے میں کارمینا اور سردی گولیاں ضرور رکھ دیا کرتی تھیں۔ کارمینا سے استفادہ کیا۔ ملاقات کا طے شدہ وقت قریب تھا۔ پہلے سوچا کہ فون کر کے پروگرام موخر کر دوں اور بہانہ یہ کروں کہ کچھ مدیران نے زیادہ وقت طلب کر لیا ہے۔ بیشک وہ مجھے ایک کج ادا اور مغرور صاحب فن تصور کر لے لیکن کسی ممکنہ سبکی سے بچا رہوں۔ مگر یہ میرا ظالم دل نہیں مانتا۔

ملاقات کے لیے جس پارک میں مجھے آنے کے لیے کہا گیا میں وہاں وقت مقررہ پر ٹیکسی کے ذریعے جا پہنچا۔ ٹیک ہی کہتے ہیں کہ دل کو دل سے

راہ ہوتی ہے۔ اس نے مجھے بڑی آسانی سے پہچان لیا اور میں نے چمن زار دل کی روش پر چلتے ہوئے اسے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو جی جان سے پہچان گیا۔ بہت خوبصورت باتیں ہوئیں لیکن میں نے زیادہ سنیں۔ کسی ہم عمر، قبول صورت، خوش اطوار اور ذہین لڑکی سے گفتگو کرنے کا لطف اتنا ہی سحر انگیز ہوتا ہے جتنا ادب عالیہ کا انتخاب پڑھنے کا۔ اس نے میری تواضع کرنا چاہی تو ظاہر ہے میں نے چائے کا ہی انتخاب کرنا تھا چونکہ میں آئندہ وہائی کے دوران ایک صاحب طرز افسانہ نگار، پرت دار لظم گو شاعر اور ممتاز دانشور کے طور پر نمایاں مقام حاصل کرنے والا تھا۔ اس لیے کولڈ ڈرنک پی کر بدذوقی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چپس کنکریٹ کی بنی ہوئی شیخ پرٹی شال والا چائے کے دوکپ اور شامی کباب کی پلیٹ رکھ کر چلا گیا۔ میں بہت محتاط تھا، اس لیے زیادہ گفتگو کرنے کی بجائے مدبرانہ انداز میں مسکرانے پر اکتفا کرتا رہا۔ بات کرنے کو دل اور زبان چل چلی لیکن دانٹوں کی متوجع بغاوت پر دل دہل جاتا۔ اس لیے میں نے اپنے شہر کے ایک عظیم شاعر کے ایک شعری مصرعے ”زیادہ سنتا ہے کم کم بولتا ہے“ پر سختی سے کاربند رہنے میں عافیت جانی۔ فانیو شارتا شتے کے پانچویں ستارے پہلے ہی جڑ بڑ ہوئے بیٹھے تھے۔ ان پر شامی کباب کے دم دار ستارے نے ضرب لگائی۔ تو تو میں میں سے آغاز ہوا۔ نوبت ہاتھ پائی تک چاہی اور پھر وہ دھکم پیل شروع ہوئی کہ ایک دوسرے کا مورال ڈاؤن کرنے کے لیے بڑھک بازی اور گالی گلوچ کے مروجہ اور گھٹیا ہتھیار کا استعمال شروع ہو گیا تو کسی قوی یا صوبائی اسمبلی کے اجلاس کا منظر نامہ دہرایا جانے لگا۔ پہلے تو میں خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ یہ غیر پارلیمانی کارروائی بند

کمرے میں ہو رہی ہے لہذا آف دی ریکارڈ ہے اور کرسیاں میز مائیک چلنے سے جو گڑگڑاہٹ ہو رہی ہے وہ صرف میری ذاتی قوت سماعت تک محدود ہے تاہم میں احتیاطاً ذرا دور کھٹک گیا۔ معاملہ اسمبلی کا تھا، شرمندہ میں ہو رہا تھا۔ اسی خفت آمیز گھبراہٹ کے عالم میں عینک کا شیشہ فریم میں سے نکل کر گھاس پر جا پڑا۔ میں نے جھک کر شیشہ اٹھایا اور سیدھا ہو کر کرن اکیوں سے اپنی میزبان کو اس خیال سے دیکھا کہ وہ میری ہیئت کذائی کا سارا منظر دیکھ رہی ہے یا خوش قسمتی سے کسی اور جانب متوجہ ہے لیکن اس مختصر وقفے کے مضحکہ خیز اور تکلیف دہ عمل کے نتیجے میں میرے دانٹوں کا خول چوگم کی ایک موٹی تار سے چپکا نچلے ہونٹ پہ لٹک آیا۔ یہ نظارہ میرے لیے ڈوب مرنے کا جواز مہیا کر رہا تھا۔ سامنے تھوڑی دور روش پر ٹپکتے ہوئے آتے دو پولیس کانسٹیبلان کے کندھوں سے بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ میرا دل چاہا کہ میں ان میں سے ایک چھین کر خودکشی کر لوں۔ اسی لمحے فانیو سے ترقی پا کر سکس (Six) شمار ہونے والا ناشتہ بھڑک اٹھا اور اٹھل پھل کرتے ہوئے بری طرح گر بنے لگا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ آج میرا ڈی ڈی یا بی ڈی ہے اس لیے میں اس خوش فہمی میں نہ رہوں کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ میری مت مکمل طور پر ماری جا چکی تھی۔ ایسی نفیس محفل میں کسی خوبصورت ہم سخن کے روبرو ایک صاحب دل شاعر اور وسیع تر امکانات کے حامل ادیب کی ایسی گت بنے کہ اس کے ظاہر و باطن ایک ساتھ تنگ ہو جائے تو وہ کس منہ سے مزید سامنا کرتا۔ اس لمحے میرے بائیں ہاتھ پارک کی باڈھ کے پار لوکل بس آ کر رکی۔ میں نے اپنے ارمانوں کو روند کر پندرہ بیس جسٹ میں قریباً دوڑتے ہوئے فاصلہ طے کیا اور ریگتی ہوئی بس



ناک کہ شاید ہی کسی حساس دل کے ساتھ ایسے بیتی ہو۔ میرا جی چاہتا کہ میں کسی عینک ساز اور ڈسٹ کی خدمات حاصل کروں۔ چہرے اور دہن مبارک کی مناسب مرمت کروا کر پھر اس گلی لوٹ جاؤں لیکن یہ صرف میری سوچ ہی تھی۔ دوبارہ سامنا کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا۔ چپک آؤٹ ہوا اور کسی بھی مدد کو شرف ملاقات بخشے بغیر رخت سفر باندھا۔ گھر پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ میری تخلیقی صلاحیت یکسر مفقود ہو چکی تھی۔ کھانے کی رغبت رہی اور نہ ہی کسی کام میں دل لگتا۔ میں نے دل ناداں کو بہت سمجھایا کہ مقدر اور قدرت سے بیک وقت کیسے لڑا جاسکتا ہے۔ جو ہوا سو ہوا اب بھول بھی جالین رہ رہ کر رونے کو جی چاہتا۔ چوتھے روز مجھے خط ملا۔ میری دونوں آنکھیں پھڑکنے لگیں۔ ہاتھ لرزنے لگا جیسے رعشہ ہو گیا ہو۔ بڑی بے تابی سے خط پڑھا، جس کے مندرجات کچھ ایسے تھے کہ میرے تمام اعضاء رئیسہ کا خون ہو گیا اور آنکھوں پر غمی عینک لگی ہونے کے باوجود تاریکی چھا گئی۔

”میں نے تمہیں ایک افسانہ نگار اور سچا صاحب فن سمجھ کر عزت و احترام سے دل میں جگہ دی لیکن میرا خیال ہے کہ تم نے کسی کے افکار چرا کر اپنے نام سے چھپوائے ہیں۔ علاوہ ازیں تم یقیناً جیب تراش بھی ہو۔ اسی لیے پولیس کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور انہوں نے مجھے تاحق گھیر لیا۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ آخر کوئی کس پر اعتبار کرے..... میرا ایک مشورہ ہے کہ کھانے کے معاملے میں کچھ احتیاط کر لیا کرو، ٹھہر بیٹنگ پر لیا ہو، پیٹ تو انسان کا اپنا ہی ہوتا ہے۔ اور ہاں! اب کہ کسی بھاری جیب پر ہاتھ صاف کرو تو اپنے چہرے کی ڈسٹنگ پیٹنگ ٹھیک طرح سے کروانا۔

میں سوار ہو گیا۔ دوڑنے سے غالباً میدان کارزار میں مزید گرمی کا رنگ پیدا ہو گیا اور ستارے زیادہ زور سے آپس میں ٹکرائے۔ میں نے حفظ ماقدم کے طور پر بس کی چھت سے لگے آہنی پائپ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ آج پھر مجھے ایک طویل عرصے کے بعد اخروٹ توڑنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ میں نے اس سلسلے میں پوری توانائی صرف کر دی۔ وہ دن یقیناً میرے لیے بی ڈی تھا بلکہ ”وی وی بی ڈی“ (V.V.B.D) تھا۔ ورنہ لوکل بس میں مجھ جیسے بد قسمت کو خالی نشست بھلا کب ملی ہے۔ انہما درجے کی بد قسمتی کو کیا کہیے کہ آس پاس کئی نشستیں خالی تھیں اور ساری سواریوں کو انسانی ہمدردی اور مروت کا دورہ پڑا جا رہا تھا۔ آس پاس والے خالی نشستوں کی طرف اشارے کر کے مجھے براہِ جان ہونے کی دعوت دے رہے تھے۔ گویا میں اندھا ہوں اور مجھے خالی نشستیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اس لیے سارے ہم سفر مجھے بٹھانے پر تلے بیٹھے تھے اور اس مفت کی نیکی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی ٹھان چکے تھے۔ یہ تو میں جانتا تھا میرا خدا کہ بیٹھنے کے چکر میں اپنے جسم کے تناؤ کو کھوتا کس قدر خطرناک عمل ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے لوگوں سے سخت چڑھنے لگی۔ اگر مجھے اس وقت اخروٹ توڑنے کا تن شکن مرحلہ درپیش نہ ہوتا تو میں ایک ایک سے پوچھتا کہ وہ اچانک اتنے ہمدرد خصلت کیسے ہو گئے ہیں۔

جوں جوں کمرہ نزدیک آتا گیا، مجھ پر داگی سکون طاری ہونے لگا تاہم اندر داخل ہونے سے پیشتر ہی ستارے لڑ جھگڑ کر بے سدھ ہو گئے یا مر چکے تھے۔ لیکن میرے لیے یہ سب کچھ اب بے معنی ہو چکا تھا۔ مجھے ذلت و رسوائی کا احساس ہونے لگا اور ناقابل بیان دلی صدمہ بھی۔ میں نے کتنا طویل سفر طے کیا تھا۔ انجام ایسا خفت آمیز اور حسرت

پیوین ملک/جیل احمد پال

ذات برادری

”جی؟“ میرا منہ کھلا رہ گیا۔ چودھری کا بیٹا اچھا خاصا خلیصورت اور جوان تھا اور لڑکی محض قبول صورت۔ پھر لڑکا ایف اے پاس اور لڑکی کو کالے حرف کی پہچان بھی نہیں تھی۔ میں انہی سوچوں میں غوطے کھا رہی تھی کہ چودھری پھر گویا ہوا۔ ”آپ مہربانی کر کے لڑکی کی ماں سے بات کر لیں۔ بس خاموشی سے نکاح پڑھالیں گے۔“

ذات برادری کو مقدم رکھنے والوں کا ماجرا، ایک دن انکی عزت پر ضرب پڑ گئی تھی

جانے کیا ہوا تھا اور کیا نہیں، مجھے اس کا انداز اچھا نہیں لگا۔ میں خشکی سے بولی۔ ”سب کچھ بتاؤ گی بھی یا شور ہی مچانی رہو گی۔“

”اری باجی، مہمبولی نے مجھے ٹکوں سے ہلکا کر دیا ہے۔ اسی سے پوچھ لو اس نے ایسا کیوں کیا؟“

اسی وقت میری نظر دروازے سے ٹپک لگا کر

”ہائے نی باجی ہم تو مارے گئے..... تباہ ہو گئے، ہمارا کچھ نہیں بچا۔“ جیلہ میرے پاس آ کر یوں روئی کہ لکھنیر میرے ہاتھوں سے نیچے گر گیا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر اسے دیکھا۔

”کیا ہو گیا؟“

”ہائے ہائے۔“ اس نے دو ہتھڑ چھانی پہ مارا اور باور پچی خانے کے فرش پر بیٹھ گئی۔

”باجی، اس نابکار نے میرا ناک کٹوا دیا۔ دیکھو..... یہ دیکھو زرا.....“ اس نے چھینو کے پیٹ پر زور سے لات ماری تو میں بات سمجھ کر ایک پل کے لیے چکرا گئی۔ ”چھینو اتنی بڑی ہو گئی ہے۔“

تھے جیسے میت کی کلائیوں سے نکلن۔

ادھر کا شان ٹپٹے ٹپٹے تھک کر موٹھڑے پر بیٹھ گیا اور سامنے لگے دیوار گیر کلاک کو گھورنے لگا۔ اس میں یہ عادت راسخ ہو چکی تھی کہ جب تک اپنی پڑھائی سے مطمئن نہ ہوتا اسے بشکل ہی نیند آتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر جماعت میں اول آتا تھا۔ گوگر کچھ عرصے سے اس کے ابا کو اسے سوال حل کرانے میں مشکل پیش آرہی تھی مگر وہ جیسے تیسے درست نتیجے تک پہنچ ہی جاتا تھا۔ جو سوال بالکل ہی سمجھ میں نہ آتے، ابا اپنے دفتر لے جا کر ایک مہربان اکاؤنٹنٹ سے سمجھ آتا۔ اب کے ابا نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی جماعت میں وہ اسے ٹیوشن سنٹر میں داخل کروا دے گا۔ ویسے بھی وہ خود اپنی تعلیمی استعداد سے بڑھ کر کتنا سمجھ سکتا تھا۔ اس نے اپنے باس کو اور ٹائم پر بھی آمادہ کر لیا تھا۔

ادھر جب کافی دیر گزر گئی اور سڑک پر اکا دکا گاڑیوں کے علاوہ کسی بس کے آنے کا امکان معدوم ہونے لگا تو وہ درخت کی اوٹ سے نکل کر اپنے گھر کی جانب تیز تیز قدم اٹھاتا پیدل چلنے لگا۔ چلنے کی وجہ سے اسے اپنے جسم میں حرارت محسوس ہوئی تو اس کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ ساتھ میں وہ دونوں ہاتھوں کو بھی اس احتیاط سے ملتا جاتا تھا کہ بغل میں دبا یونیفارم کا ڈبہ نہ گر پڑے۔ گھر کو پیدل روانہ ہونے کے ارادے پر ایک مرتبہ تو وہ مسکرا بھی دیا لیکن پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ابھی اسے چلتے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ پینر بنے لگا۔

وہ اپنی قسمت کو کوستا ایک بند دکان کے سامنے چھجے کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

ادھر کا شان نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے ابا کے انتظار میں اب تک کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ وہ بے معنی نظروں سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سامنے

حل نہ کر پایا تھا۔ اس کے سامنے کتابیں کھلی پڑی تھیں اور ان کے اوراق کھڑکی سے آتی سمندری ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ کا شان اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھا تو، دن بھر زمین پر بیٹھ کر پڑھنے کی وجہ سے، وہ کٹکٹا اُٹھے۔

اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی اور پھولدار پردہ اس کے سامنے کھینچ لیا۔ کمرے کی فضا ختم گئی۔

اب وہ کمرے میں چپل قدمی کرنے لگا۔ چلتے چلتے وہ دن بھر کے یاد کیے کھپے دہرانے لگا۔ اس کا چہرہ وقت سے کچھ پہلے ہی بھر بھر سا گیا تھا اور اوپر والے لیوں کے بالائی حصے پر روئیں سی اُبھر آئی تھیں۔

آج اسے ایک اور شے کا انتظار بھی تھا۔ اس کے ابا نے نیا یونیفارم لانے کا وعدہ کیا تھا۔ ابا چاہتا تھا کہ بیٹا امتحان میں تازہ ذہن اور نئے لباس کے ساتھ بیٹھے۔

ادھر بس ابھی تک نہ آئی تھی۔ جب تیز ٹھنڈی ہوا کے برقیلے جھونکے، جو اخروؤں اور سیبوں کی زمین سے بچ بنگی ساتھ میں لے آئے تھے، اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے تو اس نے کس کر مقفل اپنی گردن کے گرد پلیٹ لیا اور قریبی درخت کی اوٹ میں چلا گیا مگر اس کی نگاہیں بدستور تاریکی میں دو جگہوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ شہر کے معتدل موسم کی وجہ سے پچھلے برسوں میں تو لوگ سردیوں میں سادہ قمیص پہن کر بھی باہر نکل آتے تھے مگر اس مرتبہ خنکی غیر معمولی تھی۔ رات کی تاریکی ہو یا دن کا اُجالا، آسمان پر بادل چھائے رہتے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہتی۔

اس نے کئی مرتبہ ارادہ باندھا کہ ٹیکسی یا رکشہ کر لے مگر وہ بھی شہر کی سڑکوں پر سے اس طرح ناپید

انتظار

عرفان جاوید

جب کسی بس کے آنے کا امکان معدوم ہونے لگا تو وہ درخت کی اوٹ سے نکل کر اپنے گھر کی جانب تیز تیز قدم اٹھاتا پیدل چلنے لگا۔ چلنے کی وجہ سے اسے اپنے جسم میں حرارت محسوس ہوئی تو اس کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ ساتھ میں وہ دونوں ہاتھوں کو بھی اس احتیاط سے ملتا جاتا تھا کہ بغل میں دبا یونیفارم کا ڈبہ نہ گر پڑے۔

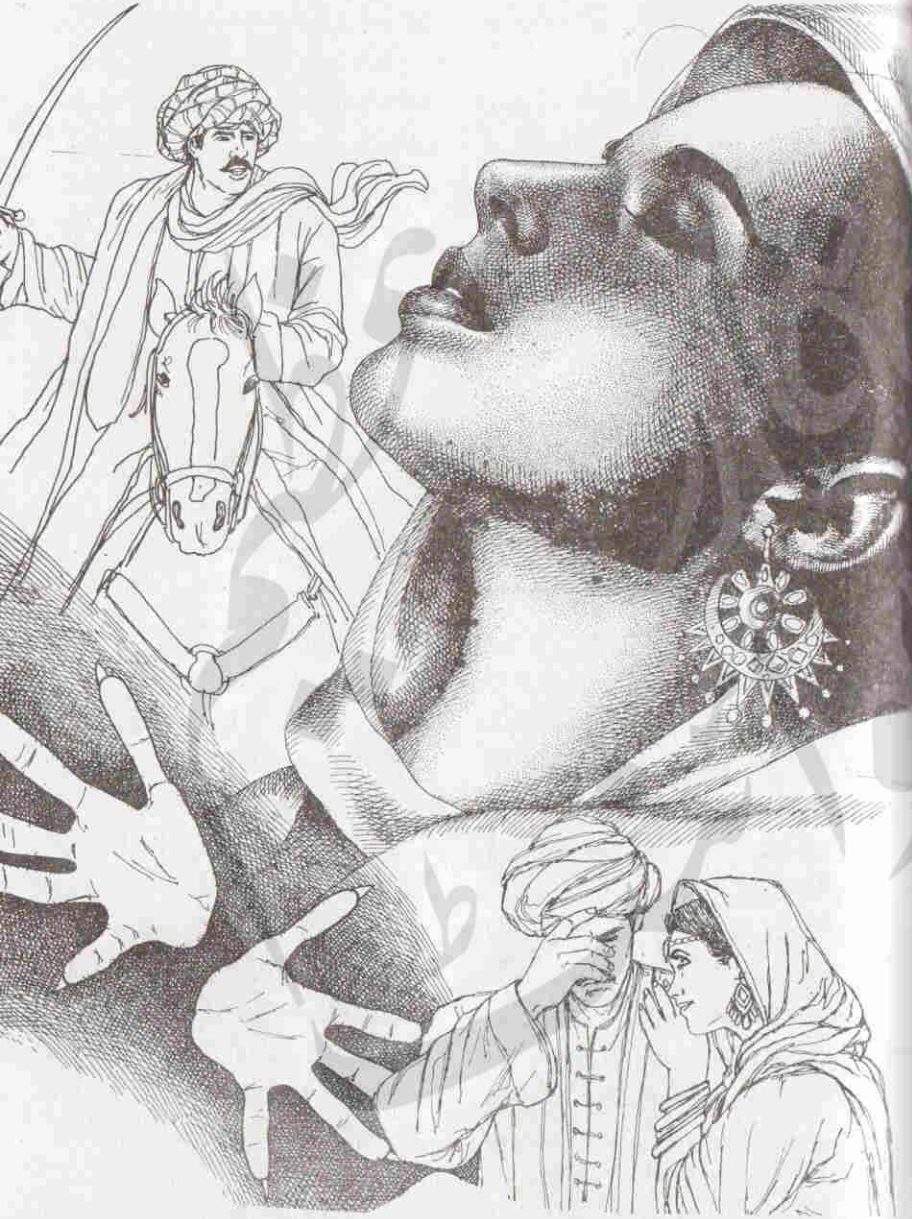
باپ کی واپسی کے منتظر ایک بیٹے کا الیہ، ایک رات نے اسکی تقدیر بدل دی

خبر تو ایک تھی مگر لوگ دو۔ رات کو ہو کا عالم تھا۔

ادھر وہ کافی دیر سے بس سٹاپ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ فضا میں ابھی تک جھینکے، مچھلی لے کر جانے والے کھلے ٹرکوں کے گزرنے کی وجہ سے بسا ند باقی تھی۔ سامنے صرف ایک پی سی او کھلا تھا جس کے اندر سے ٹیوب کی سوگوار ٹھنڈی سفید روشنی شیشے کے دروازے کھڑکیوں سے باہر جھانک رہی



پانسنہ اور کھسہ



جنوری ۲۰۱۲ء

96

سیارہ ذہن جست

مسکرائیے

ایک کنجوس باپ اپنے بیٹے سے: کیا کر رہے ہو؟
بیٹا: کچھ نہیں پایا۔ باپ: تم کچھ لکھ رہے ہو گے۔
بیٹا: جی نہیں پایا۔
باپ غصے سے: ”تو پھر چشمہ اتار کیوں نہیں دیتے۔ تمہیں فضول خرچی کی عادت پڑ گئی ہے۔“

☆☆☆

سپاہی کونلہ کے بیوپاری سے: تم کونلہ بلیک کیوں کرتے ہو؟
کونلہ والا: جناب ہم کہاں بلیک کرتے ہیں یہ تو قدرتی طور پر بلیک ہوتا ہے۔

☆☆☆

عظیم انگریزی مصنف ایچ ویلز جب سخت بیمار ہوا اور زندگی کو کوئی امید باقی نہ رہی تو اس کے رشتے دار، دوست اور لواحقین کی خواہش تھی کہ اس کے منہ سے کچھ ایسے کلمات نکلیں جو بطور یادگار ہمیشہ یاد رکھے جائیں۔ جب ان لوگوں نے اس عظیم رائٹر کو بار بار تنگ کیا تو اس نے تلخ لہجہ میں جواب دیا۔ ”آپ دیکھ نہیں رہے کہ میں مرنے میں مصروف ہوں؟“

کارلس پر اس کی مرحوم ماں کی تصویر رکھی تھی جس میں چھوٹا سا کاشان ماں کی گود میں بیٹھا نہیں رہا تھا۔ ساتھ میں کاشان کی اپنی تازہ تصویر دھری تھی جس میں سکول کا ہیڈ ماسٹر اول آنے پر اس کے گلے میں میڈل ڈال رہا تھا۔ اس کا ابا کہا کرتا تھا کہ وہ اسے اتنا لائق بنائے گا کہ وہ اس کے بڑے پاس سے بھی بڑا افسر بنے گا۔ وہ تصور میں ابا کو اپنے متعلق خواب سناتے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔

ادھر جب مینہ، موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گیا، مٹی کچھل میں بدلنے لگی اور بارش کی دیوار اس کا لباس ہونے لگی تو اس نے کسی گزرتی کار سے لفت

لینے کا ارادہ کیا اور سڑک پر آ گیا۔ ابھی وہ سڑک پر آیا ہی تھا کہ رات کی تاریکی کو چرتی دو روشنیاں اس کی جانب بڑھیں۔ شاید وہ کوئی وین تھی۔

وین کے ڈرائیور نے سڑک کے اس ویران گوشے میں کھڑے تنہا شخص کو دیکھ کر گاڑی کی بتیاں بجھا دیں اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔

اس نے وین کو آتا دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ وین کی کھڑکی سے سٹریٹ لائٹ کی کٹی پھٹی روشنی میں دھات کی ایک بندوق برآمد ہوئی جس نے ایک ششکاری بھری اور دو شعلے اُگل دیئے۔ اس نے حیرت سے وین کو دیکھا اور اپنے بغل میں دبا یونیفارم کا ڈبہ سڑک پر پھینک کر فٹ پاتھ پر خاموشی سے لیٹ گیا۔

وین ڈبے کو پکچلتی کسی نامعلوم مقام کی جانب روانہ ہوئی۔

ادھر عین اسی لمحے مونڈھے پر سوتا کاشان چونک کر اٹھ بیٹھا اور رونے لگا۔

☆☆☆☆☆☆

خبر تو ایک تھی مگر لوگ دو۔

پہلا شخص اخبار کا ایڈیٹر جس کے پاس انٹرنی رپورٹر جب یہ چار سطر خبر لایا ”بھپلی شب نامعلوم دہشت گردوں کی فائرنگ سے ایک بے گناہ شخص مارا گیا۔ ورثا کی تلاش میں ناکامی کے بعد لاش کو ویلفیئر والوں نے دفن کیا۔ پولیس قتل کی تحقیقات کر رہی ہے۔ جلد مثبت نتائج آنے کی توقع ہے۔“ تو ایسی معمولی خبر لانے پر ایڈیٹر نے رپورٹر کو مزید محنت کی تلقین کی۔

دوسرا شخص کاشان ہے، جو آج بھی گیراج میں گاڑیوں کی مرمت کرتے ہوئے کبھی کبھار چونک کر دروازے کی طرف منتظر نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔



نواز خان

پانسہ اور کھسہ

اسے پکڑنے والے دو آدمی تھے، انہوں نے اسے ملنے نہیں دیا اور اسے ڈنڈا ڈول کر کے ویرانے میں لے گئے اور پھر اس پر ایک نئی وحشت سوار ہو گئی.....!

جبراً زیادتی کا کوئی واقعہ اخبار میں نظر سے گزرتا ہے تو مجھے برسوں پہلے اپنے دوست گلاب دین کی بیٹی ستارہ کے ساتھ ہونے والا واقعہ یاد آ جاتا ہے۔ بیس سال کی عمر کی نیلی آنکھوں والی اس صحت مند لڑکی کا باپ میرا دوست ہی سمجھ لیں۔ میں ان دنوں جس علاقے میں تعینات تھا اس علاقے کے ہی ایک گاؤں میں چودھری گلاب کا دو منزلہ سفید مکان گاؤں کے باہر ہی واقعہ تھا اور سال کے بارہ مہینے ایسا لگتا تھا کہ اس پر تازہ تازہ قلمی کی گئی ہے۔ گلاب دین اور اس کی بیوی کا ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ ککڑی کے نال، چکی چارے کی دو مشینوں کے مالک گلاب دین کی کچھ زمین بھی تھی جس پر اس نے آلوچے کا باغ اگا رکھا تھا۔ اپنی اسی زمین سے وہ بھری اور آلوچے ہمارے گھر بھیجتا تھا۔

کی صداقت ثابت ہو گئی۔ شریف گلاب دین اور اس کی بیٹی کی زندگی بد معاشوں نے حرام کر کے رکھ دی۔

ان دنوں جرم اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا آج ہے۔ آتشیں اسلحہ استعمال ہوتا تھا۔ گلابڑی، ڈانگ، لوٹا، ٹوکا، برچھی دیہاتی علاقوں میں زیادہ استعمال ہوتے تھے۔ چوری کا جرم زیادہ تھا یا مار کٹائی۔ ڈکیتی بہت کم تھی۔ آج کل کے ہتھیار کلاشکوف، ٹی ٹی پستول، موزر وغیرہ ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ مشین گنیں فوجیوں کے پاس نظر آتی تھیں۔

خیر میں جو بات کر رہا ہوں اس طرف آتا ہوں۔ جن دنوں یہ واقعہ ہوا مجھے یاد ہے کہ برسات کے دن تھے۔ کافی دنوں سے جھری لگی ہوئی تھی۔ میں گھر سے دفتر پہنچا گلاب دین کا ایک کامارہ میرے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ رضا اللہ بہت ہنس کھ آدی تھا۔ آج وہ زندہ نہیں۔ گاؤں کی ایک لڑائی میں اس کی گردن پر برچھی لگی تھی۔ زخم بڑ گیا جس نے آخر اس کی جان لے لی تھی۔ مجھے اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ کوئی خیر والی خبر نہیں لایا۔ میں نے پوچھا رضا اللہ کیا بات ہے؟ کس لیے آئے ہو؟ اس نے میرا سوال سن کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف لے گیا۔ میں سمجھ گیا کہ بہت ہی خاص بات ہوگی۔ ہم اس وقت جہاں کھڑے تھے وہاں محراب بھی تھا اور دو تین سپاہی بھی تھے۔ میں رضا اللہ کو باہر چوکی کے صحن میں لے آیا۔ وہاں اس نے مجھے جو بات سنائی اس نے مجھے بھی پریشان کر دیا۔ میں رضا اللہ کو اندر لے آیا اور محراب سے کہا کہ وہ رضا اللہ کی بات سن کر شکایت کا اندراج کر لے۔ رضا اللہ فارغ ہوا اس دوران میں نے باہر جانے کی تیاری کر لی تھی۔ میں نے

رضا اللہ اور دو سپاہی ساتھ لیے اور چودھری گلاب دین کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے گلاب دین کے گھر کی بیٹھک میں چھوڑ کر رضا اللہ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ چند منٹ بعد چودھری اس کی بیوی نذیراں اور ان کا رشتہ دار جو ایک دو بار پہلے بھی میں نے ان کے گھر دیکھا تھا اور جس کا نام راشد تھا ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔

چودھری ان سب سے آگے تھا۔ وہ سر جھکا کر چل رہا تھا اور اس نے پنکا گردن میں ڈال کر دونوں طرف سے کھینچ کر پکڑا ہوا تھا۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ یہی حال نذیراں کا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی رونے سے سو جی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی نذیراں پھر رونے لگی۔ اس بُری طرح وہ رو رہی تھی کہ اس کے کندھے بل رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر چودھری کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے بیٹھک میں بیٹھے ہوئے اس بڑے سے پلنگ پر بٹھا دیا جس پر چودھری کے مہمان آرام کر لیا کرتے تھے۔ پلنگ پر بیٹھ کر وہ بھی رونے لگا۔ میں اس خاندان کا دکھ سمجھتا تھا۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا بلکہ ان کی زبان میں جو انہوں نے ان کے ساتھ ہو گئی تھی دیہات میں وہ اس قدر محبوب خیال کی جاتی ہے کہ بس زندہ درگور کرنے والی بات ہوتی ہے۔ اب تو خیر زمانہ بھی بدل رہا ہے۔ اخلاقی قدریں بھی بدل رہی ہیں۔ دیہات وہ پہلے والے دیہات نہیں رہے۔ وہاں بھی شہری معاشرے کے اثرات ظاہر ہو چکے ہیں۔

ان دنوں دیہات کی اپنی تہذیب تھی جو شہری اثرات سے خاصی حد تک بچی ہوئی تھی۔ بہر حال میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ مخصوص سوالات کر

کے چودھری اور اس کی بیوی کا دل مزید دکھاؤں۔ رضا اللہ مجھے کافی کچھ بتا چکا تھا۔ میں نے گلاب دین سے پوچھا کہ ستارہ کہاں ہے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن نذیراں اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ بھی کچھ بولے بغیر مجھے اشارے سے باہر لے جانے لگی۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ ستارہ دوسرے کمرے میں ایک چارپائی پر پڑی تھی۔ ہماری آہٹ سن کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے جلدی سے دوپٹے کا لمبا سا ٹکڑا نکال لیا۔ وہ پوری طرح بیٹھ نہیں سکی تھی کہ ایک طرف لڑھک گئی۔ شرم سے یا کسی اور وجہ سے؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں بغیر کچھ بولے باہر آ گیا۔ واپس بیٹھک میں جا کر میں نے گلاب دین سے کہا تم میرے دوست ہو، ستارہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے مجھے اس کا اتنا ہی دکھ ہے جتنا تمہیں ہوا ہے۔ میں یہاں وہ تو نہیں کر سکتا جو پولیس والے کرتے ہیں۔ تم بس مجھے اس حرامی کا نام بتاؤ باقی کام میرا ہے۔ گلاب دین نے جھکا ہوا سر نہیں اٹھایا۔ صرف ہاتھ ہلا دیا کہ اسے کچھ علم نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ گلاب دین میرے لیے دوست جیسا تھا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو اور بات تھی۔ تب میں اتنی جھجک کا مظاہرہ نہ کرتا۔ ایسے کیسوں میں جس قانون پر عمل کرنا پڑتا ہے وہ ہماری معاشرتی روایات کے مطابق نہیں۔ جو لڑکی یا عورت اس کا نشانہ بنتی ہے اس سے پوچھ گچھ، ڈاکٹری ملاحظہ، گواہیاں، عدالت میں ویلوں کے سوال جواب اور طاقتور پارٹی کے اثر و رسوخ سے کیس کی جس طرح شکل پکڑ جاتی ہے وہ آپ سب جانتے ہیں۔ میں ستارہ کے معاملے میں اس شرم و حیا اور حجاب کی حد کیسے عبور کرتا جو کرنی پڑتی ہے۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ شام کے وقت اپنی بیوی کو ساتھ

لے کر گلاب کے گھر چلا گیا۔ بیوی کو میں نے سمجھا دیا کہ ستارہ سے ساری بات سننا اور یہ یہ سوال بھی کر لیتا۔ اس نے ستارہ سے ساری بات معلوم کر لی اور گھر جا کر مجھے تفصیل بتائی۔ ستارہ کی زبانی اس نے جو کچھ سنا تھا اس پر اسے بھی ڈکھ ہوا تھا اور مجھے بھی سن کر تکلیف ہوئی۔

”یہ سارا واقعہ اس آلوچے کے باغ میں ہوا ہے۔“ میری بیوی مجھے ستارہ کی زبانی سنی ہوئی باتیں سن رہی تھی۔

”اس باغ میں لڑکیوں نے جھولا ڈالا ہے اور برسات کے اس موسم میں چھ سات لڑکیوں کا ٹولہ وہیں جھولے پر گیا ہوا تھا۔ گلاب دین نے گھر کے استعمال کے لیے باغ میں جامن کے تین درخت لگوا رکھے ہیں اور ستارہ اس طرف جامن توڑنے گئی تھی۔ دوسری طرف لڑکیاں جھولے پر مصروف تھیں۔ جامن کے درختوں سے ادھر پانی کا کھال ہے جس کے کنارے سرکنڈے اُگے ہوئے ہیں۔ یہ اتنے گھنے ہیں کہ یہاں کوئی چھپ جائے تو نظر نہیں آ سکتا۔ ستارہ کی کم بختی بھی یہیں چھپی ہوئی تھی۔ وہ سرکنڈوں کے پاس سے گزری ہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر نیچے گرا لیا اور اس کی چادر سے اس کا منہ ڈھک دیا۔ ستارہ نے گھبرا کر چیخ مارنے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ جس آدمی نے اسے گرایا اس نے ستارہ کو اُٹھنے نہیں دیا اس نے منہ پر پڑی چادر اسی طرح رہنے دی اور ستارہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ عین اسی وقت کسی نے اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیے۔ ستارہ پر ایک نئی وحشت سوار ہو گئی۔ اسے پکڑنے والے دو آدمی تھے۔ ستارہ خود بھی جان والی لڑکی تھی لیکن وہ دونوں بھی خاصے ٹکڑے آدمی ہوں گے۔ انہوں

نے ستارہ کو پلٹے نہیں دیا اور اسے ڈنڈا ڈول کر کے انہی سرکنڈوں میں لے گئے۔ ڈر کے مارے لڑکی کی جان نکلی جا رہی تھی۔ جب آدمی خطرے میں گھرا ہو تو اس کی ساری حسیں کام کرنے لگ جاتی ہیں۔ ستارہ کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ آدمی اسے جان سے تو نہیں ماریں گے البتہ۔ اور اسی خوف سے وہ نیم بیہوش ہو گئی۔ وہ دونوں حیوان اسے سرکنڈوں میں لے گئے اور پھر دونوں نے باری باری اپنی حیوانیت کا مظاہرہ کیا۔ ستارہ اب واقعی بیہوش ہو گئی۔ کافی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو اسے لڑکیوں کے آوازیں کان میں پڑیں۔ وہ اس کا نام لے کر پکار رہی تھیں۔

ستارہ کے لیے اس حالت میں دیکھا جانا بڑے شرم کی بات ہوتی اور پھر یہ بات ہر جگہ پھیل جاتی۔ ستارہ یہ چیز اپنی ان سہیلیوں سے چھپانا چاہتی تھی۔ اس نے جلدی سے کپڑے درست کئے اور اپنے ہوش و حواس ٹھیک کر کے سرکنڈوں سے نکل آئی۔ لڑکیوں کے پوچھنے پر کہ وہ کہاں گئی تھی؟ اس نے بہانا بنایا کہ وہ ادھر سرکنڈوں کی طرف ضروری کام سے آئی تھی کہ کسی زہر لے کیڑے نے اسے کاٹ لیا اور وہ یہاں بیہوش ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی کہانی کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے ذرا لنگڑا کا چلنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی سہیلیاں اسے سہارا دے کر اس کے گھر چھوڑ گئیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اپنی ماں کو ساری بات بتا دی۔ ماں نے روتا پیتنا شروع کر دیا تو گلاب دین کو ساری بات کا علم ہو گیا۔

گھر کا پرانا نوکر رضا اللہ ستارہ کو بیٹیوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس نے اسے گود میں کھلایا تھا۔ اس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں تھی نہ ہی گلاب دین اور نذیراں اس سے کوئی چیز چھپاتے تھے۔ وہ

واقعی ان کا وفادار تھا۔ بالکل ان کے گھر کا فرد گنا تھا۔ اسے بھی ساری بات معلوم ہو گئی اور پھر نذیراں کے کہنے پر رضا اللہ مجھے بتانے تھا نے آ گیا تھا۔ اس نے تھانے میں جو رپورٹ لکھوائی تھی اس میں اتنا ہی کہا تھا کہ چودھری گلاب دین کی بیٹی پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا ہے وہ اسے جان سے مارنا چاہتا تھا تاکہ گلاب دین کی زمین پر قبضہ کر سکے کیونکہ گلاب دین کی ایک ہی اولاد ہے یہی ستارہ۔ رضا اللہ نے بہت ہوشیاری سے ستارہ کا نام خراب ہونے سے بچا لیا تھا لیکن مجھے اصل بات بتا دی گئی تھی۔ ستارہ نے ان دونوں آدمیوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ جب ایک نے اسے گرایا تھا تو وہ اس کی پشت کی طرف تھا اور اس کے گرنے سے اس کی چادر کھسک کر اس کے منہ پر آ گئی تھی۔ جب تک وہ دونوں اپنی حیوانیت میں مصروف رہے انہوں نے ستارہ کے منہ پر سے چادر نہیں اترنے دی تھی۔ اب میرے لیے بڑی مشکل ہو گئی۔

مجھے اُن دیکھے مجرموں کو پکڑنا تھا۔ قانونی کارروائی کے لیے ستارہ کا ڈاکٹری ملاحظہ ضروری تھا اور باقاعدہ ایف آئی آر بھی جس میں طرموں کو نامزد کیا جاتا لیکن ایسا کرتے تو دنیا جان جاتی اور گلاب دین کہیں کا نہ رہتا نہ ہی ستارہ۔ نہ وہ برادری میں بیباکی جاسکتی۔ اگر برادری میں اس کا رشتہ کوئی قبول کرے لیتا تو بدنامی کا یہ داغ ساری عمر اس کے دامن سے چمٹا رہتا۔ ستارہ طرموں کی شکلیں دیکھ لیتی تو میں یا تاں اسے بھی انہیں کھینچ لاتا لیکن انہوں نے اپنی شکلیں نہیں دیکھنے دی تھیں۔ خیر میں نے گلاب دین اور اس کی بیوی کو تسلی دی کہ میں بندے پکڑ لوں گا۔ تم چند دن کے لیے یہاں سے لڑکی کو لے کر نکل جاؤ۔ اپنے کسی رشتہ

دار کے پاس چلے جاؤ۔ میں نے اسے اس کے رشتہ دار کا حوالہ بھی دیا جسے میں نے گلاب کے گھر ایک دو بار دیکھا تھا۔ گلاب دین بیوی اور لڑکی کو لے کر وہیں چلا گیا۔ ستارہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا یہ بات باہر نہیں نکلی تھی صرف رضا اللہ کو پتہ تھا یا مجھے۔ گلاب دین کے جانے سے میں زیادہ بھل کر کام کر سکتا تھا۔ اسے اپنے سامنے پا کر مجھے ایک قدرتی جھجک سی ہوتی تھی۔ میں نے اس کے گھر ہی ڈیرہ لگا لیا۔ جس دن گلاب گیا اس سے اگلے دن میں سادہ کپڑوں میں اس کے آلوچے کے باغ کی طرف جا نکلا۔ میرا وہاں جانے کا خاص ارادہ تھا۔ میرا رُخ ان سرکنڈوں کی طرف تھا جہاں ستارہ کے ساتھ واردات ہوئی تھی۔ ستارہ نے میری بیوی کو جو کہانی سنائی تھی اس میں ان سرکنڈوں کا محل وقوع میں جان چکا تھا۔ پانی والا کھال آتے ہی مجھے وہ سرکنڈے نظر آ گئے۔ میں اس طرح چل رہا تھا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہوں۔ میرے اس طرح چلنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی مجھے دیکھ لے تو اسے پتہ نہ چلے کہ میں کس چکر میں ہوں۔

سرکنڈوں کی ایک عجیب خاصیت ہے کہ ان پر اگر کوئی چیز رکھی جائے تو اس کا تھوڑا بہت نشان وہاں رہ جاتا ہے۔ میں آپ کو ذرا تفصیل سے سمجھاتا ہوں۔ اگر آپ سرکنڈوں پر کوئی بیٹی یا صندوق رکھ دیں تو اس کا نشان پڑ جائے گا کیونکہ سرکنڈے اس کے نیچے دب جاتے ہیں اور اوپر پڑی ہوئی چیز نشان چھوڑ جاتی ہے لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر پا نہیں ہوتی۔ چند گھنٹوں بعد زیادہ تر نشان ختم ہو جاتا ہے کیونکہ سرکنڈے پھر کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن خاص نظر سے دیکھا جائے یعنی باریک بینی سے

دیکھا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے۔ میں نے سرکنڈوں کے ادھر ادھر گھوم پھر کر دیکھا۔ ایک طرف جو باغ اور پانی کے کھالے سے اوچھل چھی مجھے ایسے نظر آیا جیسے سرکنڈوں پر کوئی چیز بیٹھی رہی ہو کیونکہ یہاں سرکنڈے تھوڑے دبے ہوئے تھے۔ جس طرح کوئی بھینس اگر لوں یا کھالے (پہ) دونوں فصلیں چارے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ دیہات کے رہنے والے لوگ ان کا نام سنتے ہی جان جائیں گے) میں گھس کر بیٹھ جائے تو ارد گرد لوں یا کھال بھی دب جاتا ہے اور بھینس کے جسم سے بڑا دب کا نشان پڑ جاتا ہے۔ بہر کیف میں بہت باریک بینی سے دیکھ رہا تھا۔ ایک جگہ سرکنڈے دبنے کا احساس بھی ہوا اور اسی جگہ ماچس بھی ملی۔ میں نے زیادہ غور سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا مجھے اور کچھ نہیں ملا۔ میں نے ماچس اٹھائی اور پانی والے کھال پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ماچس کو اٹنا پلٹا۔ یہ عام سی ماچس تھی جو ہر جگہ مل جاتی تھی۔ سوال یہ تھا کہ کیا انہی میں سے کسی آدمی کے پاس تھی جنہوں نے ستارہ کو پکڑا یا کسی اور آدمی کی۔

یہ جگہ راہگور نہیں تھی جسے لوگ راستے کے لیے استعمال کرتے ہوں۔ راستے پر تو کسی مسافر کی جیب سے کوئی چیز گر سکتی ہے۔ یہاں اگر کوئی چیز تھی تو اس آدمی کی بھی جو خاص اس طرف آیا تھا۔ میں نے ماچس کھولی۔ اس میں تیلیاں کم تھیں۔ تھوڑی سی روٹی اور ایک ”پاسہ“ تھا۔ ”پاسے“ کو دیکھ کر میرا ذہن ایک خاص بات سوچنے لگا۔ یہ ماچس جس آدمی کے پاس تھی وہ جواری تھا۔ جیسا کہ قارئین کے علم میں ہو گا کہ ”پاسہ“ جوے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح بعض جواری ”رومال“ استعمال کرتے ہیں اسی طرح

بعض جواہری پاسہ استعمال کرتے ہیں۔ روئی غالباً کانوں میں سے میل نکالنے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ یہ بھی بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ماچس میں روئی پاس رکھتے ہیں۔ ماچس ملنے سے مجھے یہ چل گیا تھا کہ یہ جس کسی کی ماچس تھی وہ جوئے کا عادی تھا اور اگر جوا کھلیتا تھا تو شراب بھی پیتا ہو گا اور گمان تھا کہ کسی لڑکی کے ساتھ ایسا ہی آدمی حیوانیت کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔ یہ جانتا تو ممکن نہیں تھا کہ یہاں سرکنڈوں میں جو کچھ ہوا وہ اسی ماچس والے نے کیا لیکن میرا اندازہ یہی تھا کہ ماچس والا یہاں بیٹھا ضرور ہے کیونکہ یہ جگہ راستہ نہیں راستے سے ہٹ کر ہے جو بھی یہاں آیا خاص مقصد یا نیت سے آیا ہو گا۔

میں نے تھوڑا اور ادھر ادھر دیکھا اور پھر وہیں بیٹھ گیا۔ باغ میں درختوں کی وجہ سے موسم بڑا اچھا تھا۔ مجھے بڑا سکون سا محسوس ہوا۔ میں نے اپنی کمر کے پیچھے ہاتھ کر کے دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکا لیں اور ٹانگیں زمین پر سیدی کر کے بیٹھ گیا۔ فوراً ہی مجھے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے نیچے چھن کا احساس ہوا۔ میں نے گھبراہٹ میں ہاتھ جھٹکا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی کیرا ہے جو میرے ہاتھ کے نیچے آ گیا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو کیرا وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ سونے کا ایک تعویذ پڑا تھا۔ ایسے تعویذ کالی یا سرخ ڈوری میں پرو کر گاؤں کے مرد اور عورتیں پہنتی ہیں۔ اب تو یہ رواج یا فیشن تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ بہت کم لوگ خاص کر مرد حضرات تعویذ پہنتے ہیں پہلے یہ عام تھا۔ اب کبھی کبھی کوئی عورت سونے کے تعویذ پہنے نظر آتی ہے۔ بہر حال میں نے وہ تعویذ اٹھا لیا اور اسے غور سے دیکھا۔ یہ سونے کا ہی تھا۔ اب پتہ نہیں ستارہ کا تھا یا اس آدمی کا جس نے ستارہ پر حملہ کیا تھا۔

میں نے وہ تعویذ اپنے گھر رکھ دیا کہ گلاب واپس آئے گا تو معلوم کروں گا کہ ستارہ کا ہے یا نہیں۔ اس جواہریے اور ممکنہ طور پر شرابیہ کی کھوج کسی خبر کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ میں نے بحر مان سنگھ سے کہا کہ مجر بلاؤ جواہری گاؤں کے ہوں۔ اس نے اسی وقت ایک سپاہی کو کہا کہ فلاں فلاں آدمی کو میرے پاس لے آئے۔

سپاہی جو پہلا آدمی لے کر آیا وہ اسی گاؤں کا موچی تھا۔ دینو موچی۔ دینو موچی کی گاؤں میں ”سیپ“ تھی۔ جو لوگ دیہاتی کچرے واقف ہیں انہیں پتہ ہو گا کہ ”سیپ“ کیا ہوتی ہے اور ”سیپ“ کسے کہتے ہیں۔ جو لوگ نہیں جانتے ان کے لیے میں بتاتا چلوں کہ گاؤں میں مختلف پیشوں کے لوگ مثلاً لوہار، ترکان، موچی، نانی وغیرہ وغیرہ گاؤں کے چودھریوں کی یا زمینداروں کی سارا سال فری خدمت کرتے ہیں مثلاً ترکان ان کا لکڑی کا کام کرے گا۔ موچی، نانی اپنا اپنا کام کرتے رہیں گے اور پیسے نہیں لیں گے۔ جب بھی نئی فصل اترے گی یہ لوگ اپنے اپنے چودھری یا زمیندار کے پاس جا کر گندم، چاول، دال، کپاس یا جو بھی فصل ہوگی وہ انہیں مل جائے گی۔ یہ ہوتی ہے سیپ اور جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ سیپی کہلاتے ہیں۔ بعض تو صرف ایک چودھری یا زمیندار کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ سارا سال اسی کام کرتے ہیں۔ بعض ایک سے زیادہ چودھریوں یا زمینداروں کی سیپ کرتے ہیں۔ یہ دینو موچی ایک اچھے زمیندار گھرانے کا سیپی تھا۔ اس گھرانے کی گاؤں میں چودھراہٹ تھی۔ وہ اپنے اس سیپی کو دوسرے گھروں میں بھی خدمت کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ اس لیے اس سے اکثر گھرانوں کے گھر کی باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔ ایسا آدمی بہت

گاؤں کے ہر قسم کے آدمی اس کے ڈیرے پر آتے

رہتے تھے۔ وہ زیادہ تر وقت زمین پر بنے ڈیرے پر گزارتا تھا۔ رات گھر چلا جاتا ماں کے پاس۔ ڈیرہ سنبھالنے والا نوکر تھا گاؤں۔ اس گامے کو خواخواہ تھانے بلانے کی تک نہیں تھی۔ میں بڑا اصول پسند رہا ہوں۔ جس آدمی نے جرم نہیں کیا اس کے حقوق کا احترام ہونا چاہیے۔ جرائم پیشہ لوگوں کی دوسری بات ہے وہ قانون اور دوسروں کے حقوق کا احترام نہیں کرتے اس لیے ان کے حقوق کے احترام کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

ایک تو یہ کہ ابھی تک گامے کا کوئی جرم میرے سامنے نہیں تھا دوسرے اسے تھانے بلا کر امیر حسین کو خیردار کرنے یا شک میں مبتلا کرنے یا خوف و ہراس میں مبتلا کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ اگر وہ واقعی مجرم تھا تو اپنے نوکر کے تھانے بلائے جانے پر ہوشیار ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے فرار ہو جاتا اور اسے پکڑنا مشکل ہو جاتا۔ میں نے دینو موچی کو اس کام پر لگایا کہ وہ گامے کے پاس جائے، اسے شیشے میں اتارے اور معلوم کرے کہ اس کے علم میں یہ بات ہے یا نہیں کہ امیر حسین کے لڑکیوں کے ساتھ تعلقات ہیں یا کیا وہ لڑکیوں سے ایسی ویسی حرکتیں کرتا ہے؟ اگر وہ اس طرح کا آدمی ہوا تو پھر وہ ستارہ والے معاملے میں ملوث ہو سکتا ہے۔ گامے سے رابطہ اس بات کا یقین کرنے کے لیے تھا کہ امیر حسین کا کردار کیسا ہے۔ اگر کل کلاں کو میں امیر حسین پر ہاتھ بھی ڈالتا تو اس کا بیک گراؤنڈ میرے سامنے ہونا چاہیے تھا۔

دینو موچی تین چار دن گامے کے پاس آنے بہانے جاتا رہا اور ہر روز رات کو میرے پاس آ کر رپورٹ دیتا تھا کہ وہ گامے کے ساتھ دوستی کی پیشکشیں بڑھا رہا ہے۔ ابھی اس نے مطلب کی بات

کام کا ثابت ہوتا ہے۔

میں نے اسے واقعہ بتائے بغیر پوچھا کہ گاؤں میں جو کھیلنے یا کھلوانے والے کون کون سے لوگ ہیں۔ شراب کون کون پیتا ہے۔ اس نے مجھے چند لوگوں کے نام بتائے جن کی شہرت یہ تھی کہ بڑے شریف آدمی ہیں لیکن ان کے اندر خانے یہ کروت تھے۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ یہ لوگ موچی کے الفاظ میں بڑے ”شرابیہ“ تھے۔ چار آدمی صرف جو کراتے یا کھیتے تھے۔ میں نے موچی سے ان کی عمریں پوچھیں۔ یہ چالیس پچاس کے پھیر میں تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ان میں سے شاید ہی کوئی ستارہ کے ساتھ حیوانیت کا مرتکب ہوا ہو کیونکہ ان کے گھروں میں جوان بیٹیاں تھیں۔ دیہات میں اس عمر کے لوگ ناجائز تعلقات میں ملوث ہو سکتے ہیں لیکن زیادتی کا معاملہ دوسرا ہے۔ اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو زیادتی کرنے والا یا والے اس گاؤں کے نہیں تھے یا پھر دونوں اسی گاؤں کے تھے اور ایک ہی قماش کے تھے۔ میں نے موچی سے کہا کہ وہ ایک ایک کر کے سب کے بارے میں ہر چیز مجھے تفصیل سے بتائے۔ موچی مجھے ہر ایک کی تفصیل بتاتا گیا۔ قد کاٹھ، جسمانی صحت، عادتیں، یاری دوستی وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ایک امیر حسین مجھے مطلب کا آدمی نظر آیا۔ امیر حسین کوئی چالیس سال کا ہو گا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اس ہندو معاشرہ میں وہ بڑا صاحب جائیداد آدمی تھا کیونکہ تمام مسلمان تو بچارے کم تر حالت والے تھے لیکن یہ امیر حسین بارہ ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ اس کا باپ نہیں تھا۔ صرف ماں تھی۔ اس کے دو ہی شوق تھے۔ اچھا کھانا اور شکاری کتے رکھنا۔ ڈیرہ دار تھا۔ قد کاٹھ کا ٹکڑا۔ پوری طرح صحت مند آدمی تھا۔ ارد گرد کے

کرتے کرتے کوئی آدمی سامنے والے کوٹھے سے باہر نکلا اور کھری کی طرف آنے لگا جہاں ہم کھڑے تھے۔

دینو نے اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا گاماں ہی ہے۔ شاید وہ حیران تھا کہ دو آدمی اور کہاں سے آگئے۔ میں نے کلدیپ سے کہا کہ اس آدمی کو قابو کرلو۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ کلدیپ بہت طاقتور آدمی تھا۔ جو آدمی ہماری طرف آ رہا تھا اسے قابو کرنا اس کے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ میں نے دینو سے کہا کہ اندھیرا ہے اس آدمی کی شکل نظر نہیں آ رہی۔ جب یہ پاس آئے تو مجھے بتا دینا کہ یہی گاماں ہے یا کوئی اور۔ دینو کہنے لگا جناب گاماں ہی ہے۔ بے فکر ہو جائیں۔ میں نے دینو سے کہا کہ اب تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ تم پر حرف آئے گا کہ تم نے چھاپہ مروایا ہے۔ اس لیے کلدیپ تمہیں جھوٹ موٹ پکڑتا ہے۔ تم تھوڑی سی کھینچا تانی کرو اور پھر دوڑ لگا دو۔ یہ گاماں سمجھے گا کہ تم چھڑا کر بھاگ نکلے ہو۔ میں بھی لاکارا ماروں گا کہ اسے چھوڑ دے دو دوسرے کو پکڑو۔ گاماں ابھی کھری سے تھوڑا دور ہی تھا۔ کھری کے پاس تین آدمی کھڑے دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ دیہاتی لوگ اس طرح کے خطرے کو سمجھ لیتے ہیں۔ وہ سوچ رہا ہو گا کہ وہ تو صرف ایک آدمی یہاں چھوڑ کر گیا تھا دوسرے دو کہاں سے آگئے اور یہ ہیں کون؟ میں نے کلدیپ سے کہا کہ فوراً شروع ہو جاؤ۔ اس نے دینو کو پکڑ لیا۔ دینو اس کے ہاتھ سے اپنے گرتے کا گلا چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور منہ سے بے معنی سی آوازیں نکالنے لگا۔ میرا دھیان گامے کی طرف تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گامے نے سر پٹ بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کا رخ ڈیرے سے باہر

کچھ دیر بعد ہی کلدیپ کو احساس ہو گیا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ ہم امیر حسین کے ڈیرے پر تو نہیں جا رہے؟ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے پوچھا شروع کر دیا کہ کیا بات ہو گئی ہے۔ میں نے اسے اور بات تو نہیں بتائی بس یہ کہا کہ مجھے امیر حسین کے ڈیرے پر شراب اور جوئے کی اطلاع ملی ہے۔ کلدیپ کہنے لگا کہ اس نے بھی امیر حسین کی یہی شہرت سنی ہے کہ اس کے ڈیرے پر جو بھی ہوتا ہے اور یہ امیر حسین کوئی ٹھیک آدمی تو ہے نہیں اوپر سے بڑا مغرور ہے لیکن علاقہ کے دلال اس کے ڈیرے پر پڑے رہتے ہیں۔ کلدیپ کی بات سے دینو موچی کی بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ ڈیرہ بری صحبت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ خیر ہم ڈیرے پہنچے۔ وہاں جا کر گھوڑوں کی راسیں ہم نے ہاتھوں میں پکڑ لیں اور آہستہ آہستہ چلنے لگے تھے کیونکہ ہمارے سامنے ہی دو کوٹھے نظر آ رہے تھے۔ جس کے ارد گرد درختوں کے جھنڈ سے بنے ہوئے تھے۔ ہمارے دائیں طرف ایک بڑی سی کھری تھی جس کے پاس دو تین جانور بندھے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں چھینیس تھیں کہ گامے۔ اس کے ساتھ ہی چارہ مشین نظر آ رہی تھی اور اس مشین کے پاس بچھی ہوئی چار پائیوں پر بیٹھا ہوا آدمی ہمیں دیکھتے اور پاس آتے ہی اٹھ کر ہمارے قریب آ گیا۔ یہ دینو موچی تھا۔ اس نے میرا گھوڑا پکڑ لیا اور کھری کے پاس کھڑا کر دیا۔ کلدیپ نے بھی گھوڑا وہیں کھڑا کیا اور ہم تینوں اکٹھے کھڑے ہو گئے۔ میں نے دینو سے پوچھا کہ یہاں کون کون ہے؟ کہنے لگا یہاں میرے پاس ابھی تھوڑی دیر پہلے گاماں ہی تھا۔ میں نے تھیلا اس کے حوالے کر دیا ہے وہ اندر رکھنے گیا ہے۔ اندر کا مجھے پتہ نہیں۔ ہمارے باتیں

میں نے دینو سے کہا کہ فی الحال تم شراب کی دو بوتلیں لے کر گامے کے پاس چلے جاؤ۔ اس کے ساتھ کوئی بہانہ بنا دینا کہ تم لڑکی نہیں لاسکے۔ اسے شراب دوتا کہ کچھ تو تمہارا اعتبار قائم ہو جائے اور پھر باقی سوچنا میرا کام ہے۔ تم شراب دے کر وہاں ٹھہرنا نہیں بلکہ جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے نکل جانا۔ دینو حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ میرے ذہن میں کیا تھا۔ میں اس گامے کو تھانے لانے اور پوچھ گچھ کے لیے اپنے پاس رکھنے کا جواز بنا رہا تھا۔ صرف اس لیے کہ امیر حسین چوکننا نہ ہو جائے کہ میں اس کے پیچھے لگ چکا ہوں۔ اگر اسے پتہ چل جاتا تو پھر سارا معاملہ خراب ہو سکتا تھا۔ میں نے دینو کو پلے سے پیسے دینے کے شراب کی دو بوتلیں لے آئے اور رات کو گامے کو ڈیرے پر دے کر آ جائے لیکن ادھر جانے سے پہلے مجھے بتا کر جائے۔ دینو اچھا جی کہہ کر چلا گیا۔ ان دنوں میرے پاس کلدیپ نام کا کالٹھیل تھا۔ جو چھوٹا جوان تھا، بہت طاقتور ورثی جسم کا مالک اور اچھے کردار کا جوان تھا۔ دینو کے جانے کے بعد میں نے کلدیپ کو بلایا اور کہا کہ رات کھانا کھا کر میرے پاس آ جانا، ہم دونوں نے کھیں جانا ہے۔

رات ڈھلی تو پہلے دینو میرے پاس آیا اس نے دو بوتلیں تھیلے میں ڈالی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی کلدیپ آ گیا۔ میں نے دینو سے کہا کہ وہ جائے۔ کلدیپ کو میں نے پاس بٹھا لیا اور ادھر ادھر کی باتیں پوچھنے لگا۔ امیر حسین کا ڈیرہ کوئی زیادہ دور نہیں تھا۔ نصف یا پون کھنے میں آدمی وہاں پہنچ سکتا تھا۔ اتنا ہی وقفہ دے کر میں نے کلدیپ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں امیر حسین کے ڈیرہ کی طرف نکل گئے۔ تھانے سے نکلنے کے

شروع نہیں کی۔ میں نے دینو سے کہا کہ وہ گامے کے ساتھ شراب اور عورت کی بات کرے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ دونوں چیزیں اسے یا امیر حسین کو فراہم کر سکتا ہے پھر مجھے بتائے کہ گامے کا کیا جواب ہے۔ دینو نے اسی دن گامے کے ساتھ بات کر دی اور حسب معمول رات کو مجھے آ کر رپورٹ دی۔ کہنے لگا ”صاحب آپ نے مجھے جو پتی پڑھائی تھی وہی میں نے گامے کے سامنے دہرا دی۔ گاماں میری بات سن کر پہلے تو ہچکچایا جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ میری بات پر یقین کرے یا نہ کرے۔ میں نے منہ پکا بتائے رکھا اور اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے میرا اصل دھندا یہی ہے۔ میں نے اسے بہت لالچایا۔ اسے فرضی لڑکیوں کے بارے میں بتایا کہ فلاں اس طرح کی ہے فلاں اس طرح کی ہے۔ گاماں میری بات سن کر ”آپھر“ گیا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا اور مجھے کہنے لگا دیکھو اگر تم واقعی کسی کو یہاں ڈیرے پر لاسکتے ہو تو لے آؤ۔ میں نے پوچھا کہ تم اکیلے ہی یہ شغل کرتے ہو یا امیر حسین کے لیے بھی لاؤں۔ گاماں پھر سوچ میں پڑ گیا۔

شاید وہ سوچ رہا ہو کہ مجھے امیر حسین کے بارے میں بتائے یا نہ بتائے۔ آخر کہنے لگا شوق تو امیر حسین بھی کرتا ہے لیکن یار ذرا بچ کر دھیان سے لانا اور پہلے آ کر یہاں بتا جانا تا کہ میں ڈیرہ خالی رکھوں۔ یہاں بہت سے چڑ کئے آ جاتے ہیں۔ چڑ کئے کا مطلب یہ تھا کہ مفت میں روٹیاں توڑنے والے اور ڈیرہ پر وقت گزارنے والے وہاں نہ ہوں۔ میں نے اس کے ساتھ رات کا وقت مقرر کیا ہے۔

دینو موچی کی باتیں سن کر مجھے احساس ہونے لگا کہ شاید میں مڑموں کے قریب پہنچ رہا ہوں۔

کی طرف تھا وہ تیر کی طرح ان درختوں کے جھنڈ کی طرف جا رہا تھا جو ہم نے ڈیرے کی طرف آتے ہوئے دیکھے تھے۔ کلدیپ اور میں دونوں اس کے پیچھے دوڑے۔ دینو بھی ہمارے پیچھے ہی پیچھے فاصلہ دے کر آ رہا تھا۔ میں نے کلدیپ کو آواز دی کہ یہ چلنے نہ پائے لیکن وہ گاماں تو چلا وہ نکلا۔ وہ بلاشبہ کسی خرگوش کی طرح ہوا ہو گیا تھا۔ بہت تیز دوڑتی اس کی۔ کلدیپ طاقتور ضرور تھا لیکن اتنی تیز دوڑ نہ اس کی تھی نہ میری۔ مجھے خدشہ ہوا کہ یہ گاماں تو گیا ہاتھ سے اور واقعی وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ ہم سے پہلے ان درختوں میں جا گھسا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس کا نام و نشان نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا اسے زمین ہی نکل گئی تھی۔ میں غصے سے ان درختوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ دراصل بڑے درخت نہیں تھے انہیں ”شرریں“ کہتے ہیں۔ انہیں فصلوں کی حفاظت کے لیے باڑ کے طور پر لگایا جاتا ہے یا بکریوں اور دوسرے چھوٹے جانوروں کو چارے کے طور پر بھی کھلاتے ہیں۔ گاماں یہیں کہیں چھلاوے کی طرح غائب ہوا تھا۔ ہم وہاں سے ناکام واپس ہوئے۔ واپسی پر جھنجھلاہٹ طاری تھی۔ گاماں مجھے چوٹ دے گیا۔ میں نے ڈیرے کے اندر جا کر تلاشی لی۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ شراب کی دونوں بوتلیں خالی چارپائی پر پڑی تھیں۔ میں کلدیپ کو لے کر باہر نکل آیا۔

دینو بھی باہر ہی کھری کے پاس کھڑا تھا۔ ہم وہیں چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا کہ یہاں ڈیرے سے باہر نکلو۔ یہ گاماں واپس ضرور آئے گا چاہے کتنی دیر بعد ہی کیوں نہ آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر امیر حسین یہاں ہوتا تو شاید گاماں واپس نہ آتا لیکن اب وہ ضرور آئے گا اس

لیے کہ وہ ڈیرہ اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہاں ان کے جانور بندھے ہوئے ہیں اور یہاں کمروں میں سامان بھی ہے اور بھی ان کی چیزیں ہوں گی۔ وہ صرف تھوڑی دیر یہاں سے غائب رہے گا تاکہ ہم یہاں سے چلے جائیں پھر وہ ڈیرہ کسی کے سپرد کرنے کے بعد پھر یہاں سے غائب ہو گا۔ میں نے دینو سے کہا کہ ایک چارپائی اٹھا لو۔ ہم ڈیرے سے باہر آ گئے۔ ایک کھلی جگہ جہاں پہلی (کھیت) ہوا تھا دینو سے چارپائی بچانے کا کہا۔ ہم تینوں ہی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد میں نے دینو اور کلدیپ دونوں کو بھیج دیا کہ تم جا کر ڈیرے پر چھپ جاؤ۔ جب گاماں وہاں واپس آئے تو مجھے آکر خبر کر دینا۔ دونوں کو بھیج کر میں چارپائی پر دراز ہو گیا۔ میرا دھیان گامے اور امیر حسین کی طرف ہی تھا۔ میں کافی دیر خیالوں میں کھویا رہا۔ گلاب دین ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ بار بار ستارہ کا چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا۔ میں غصے سے بل کھاتا کہ مجھے پتہ چل جائے کہ وہ سو کون ہے تو پھر دیکھو میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔ ایسے لوگ میری نظر میں ناقابل معافی تھے جو دوسروں کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہوں۔

میں جانے کتنی دیر خیالوں میں گم رہا تھا کہ خیالوں کا سلسلہ دینو کی آواز سے ٹوٹ گیا۔ اس کے بھاگتے پیروں کی آواز آ رہی تھی اور وہ مجھے آواز بھی دے رہا تھا۔ ”صاحب جی!! صاحب جی!!“ میں چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دینو میرے پاس آتے ہی کہنے لگا ”گاماں آ گیا ہے۔“ ”کہاں ہے؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”وہ ادھر شرریں کے درختوں کے پار۔“ دینو تیزی سے میرے آگے چلنے لگ پڑا۔ میں نے اس سے زیادہ بات نہیں کی۔ ہم شرریں کے درختوں

کے لیے چھپا ہوا نہیں تھا۔ اسے بھی پتہ نہیں تھا کہ گامے کا آگاہ چھپا کیا ہے۔ اس نے البتہ اس گاؤں سے پتہ کر لیا تو معلوم ہوا کہ امیر حسین وہاں سے جا چکا تھا اور اسے لینے کے لیے گاماں ہی آیا تھا۔ دینو موچی رضا اللہ، کلدیپ سب امیر حسین اور گاماں کو تلاش کر کے تھک گئے۔ انہیں تو جیسے زمین ہی کھا گئی۔ وہ نظر ہی نہیں آئے۔ ان کا یوں فرار ہو جانا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ دونوں یا ان میں سے ایک ستارہ والے معاملے میں ملوث ضرور ہے یا کم از کم انہیں یہ علم ہے کہ اصل مجرم کون ہے؟ میرا خیال یہ تھا کہ وہ خود ہی مجرم ہیں۔ ان کے بارے میں کام کی خبر کوئی نہیں لا رہا تھا۔ آخر یہ کام رضا اللہ کے ہاتھوں ہی ہوا۔

گلاب دین نے چارے کی مشینوں کا کام بھی کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک مشین خراب ہو گئی تو رضا اللہ اسے ٹھیک کرانے لے گیا۔ مستری ایک نواحی گاؤں میں رہتا تھا۔ اسے گاؤں سے زیادہ قصبہ کہنا چاہیے۔ اس قصبے میں رضا اللہ نے گامے مصلی کی جھلک دیکھ لی۔

رضا اللہ اس وقت مستری کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا جب اس نے گامے کو گزرتے دیکھا۔ اس نے مستری سے کوئی بہانہ کیا اور فاصلہ دے کر گامے کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ گاماں جس مکان میں گیا وہ جگہ اس نے دیکھ لی اور مستری سے مشین ٹھیک کروا کر شام کو لاری کے ذریعے گھر آ گیا۔ اسی رات گلاب دین اور رضا اللہ میرے پاس گھر آ گئے۔ گلاب دین نے مجھے بات بتائی کہ کیا ہوا ہے اور رضا اللہ نے بتایا کہ وہ کس طرح گامے کا پیچھا کرتے ہوئے اس گھر تک جا پہنچا جو شہباز کا ہے۔ یہاں پر مجھے گلاب نے بتایا کہ شہباز کون ہے۔ یہ آدمی گلاب کا رشتہ کا بھتیجا لگتا تھا۔ دو سال پہلے

ہے۔ گامے سے میں نے کہا کہ مجھے امیر حسین کو پکڑو اے۔ کہنے لگا کہ وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ وہاں کا ایک ترکھان اس کا مقروض تھا اور امیر حسین اس کے پاس رقم لینے گیا ہوا تھا۔ میں نے گامے کو بہت دھمکایا کہ میں تم پر جوئے کا اڈا چلانے کا کیس بنا دوں گا۔ تم امیر حسین کو چھوڑ دو ہمارے ساتھ مل جاؤ تو تمہاری بچت ہو جائے گی۔ امیر حسین نے تو ویسے بھی اندر ہو جانا ہے تم کیوں ناحق اندر ہوتے ہو۔ پتہ نہیں کب تمہاری جان چھوٹے گی۔ کہنے لگا ٹھیک ہے میں امیر حسین کو پکڑوا دیتا ہوں۔ آپ مجھے جانے دیں۔ جب امیر حسین ڈیرے پر آیا میں آپ کو اطلاع کر دوں گا۔ میں نے اسے آزاد کر دیا۔

گامے کو چھوڑے دو دن ہو گئے تو میں نے کلدیپ کو بھیجا کہ وہ جا کر پتہ کرے کہ امیر حسین آیا ہے یا نہیں کیونکہ گامے نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ کلدیپ جب واپس آیا تو اس کا منہ اُترا ہوا تھا۔ کہنے لگا ”ڈیرے کے دونوں کمروں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ کوئی ڈنگر وہاں نہیں نہ کوئی آدمی ہے۔ میرا خیال ہے کہ گاماں فرار ہو گیا ہے جی۔“

کلدیپ کی بات میرے ذہن میں بھی شک پیدا کر گئی۔ گامے کو تو پتہ تھا کہ امیر حسین کہاں ہے وہ اسے بلانے تو گیا نہیں تھا۔ اس کے نظر نہ آنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہم سے جان چھڑا کر بھاگ گیا تھا۔ میں نے پھر دینو موچی کو بلا لیا۔ اسے کہا کہ گامے کا کھوج کرو۔ انہی دنوں گلاب دین واپس آ گیا۔ وہ ستارہ اور بیوی کو اپنے رشتہ دار کے گھر ہی چھوڑ آیا تھا۔ گاماں کو غائب ہوئے کئی دن ہو گئے۔ میں نے ساری بات گلاب دین کو بتائی۔ امیر حسین کے بارے میں باتیں سن کر اسے بھی شک ہو گیا۔ امیر حسین کا شرابی جوار یا ہونا اس

وہیں چل کر بتائیں گے۔
تھانے پہنچے تو کافی رات ہو گئی تھی۔ میں نے دینو کو گھر بھیج دیا اسے یہ ہدایت دینے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ زبان بند رکھے۔ وہ ایک باعتبار آدمی تھا۔ گامے کی خبری کر کے اس نے ویسے بھی خود کو مصیبت میں ڈال لیا تھا اسے ہماری یعنی پولیس کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اشتہار نہیں لگانا تھا کہ گامے کو میں نے پکڑ دیا ہے۔ میں نے گامے کو حوالات میں ڈالا اور خود تھوڑی دیر آرام کرنے چلا گیا۔ میرا ارادہ علی الصبح آنے کا تھا۔ اس وقت آدمی نڈھال ہوتا ہے اور اس پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ فجر تک میں نے گھر میں آرام کیا اور پھر تھانے آ گیا۔ کلدیپ کو بھی میں نے بلایا ہوا تھا وہ بھی آ گیا اور اس نے حوالات کے اندر ہی گامے کو وہ پھینکی لگائی کہ اگر کوئی باہر کا آدمی سن لیتا تو توبہ تو پ کرنے لگتا۔ اچھی خاصی ٹھکانے کے بعد بھی گاماں نہیں مان رہا تھا کہ اس نے کوئی لڑکی ڈیرے میں لا کر خراب کی ہے جبکہ میں نے کلدیپ سے یہی کہا تھا کہ وہ پہلا پھرت مارتے ہی یہ بات کرے کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تم ڈیرے پر لڑکیاں خراب کرتے ہو، شراب رکھتے ہو۔ ہمیں دو بوتلیں وہاں سے مل گئی ہیں۔ اب لڑکیوں کا بتاؤ۔ گاماں کہنے لگا کہ اس نے کوئی لڑکی نہیں اٹھائی نہ ہی ڈیرے خود لے کر گیا ہے۔ کلدیپ کو ہنا کر اب میں نے چھتر پکڑ لیا۔ اب میں نے جوئے کی بات چھتر دی کہ تم اڈے پر جوا کراتے ہو۔ مجھے حیرانی ہوئی جب گامے نے اس بات سے انکار نہیں کیا۔ جب اس میں مار کھانے کی سکت نہیں رہی تو کہنے لگا کہ ٹھیک ہے امیر حسین جوا کراتا ہے۔ یہ لڑکیوں والا کام بھی اس کا ہی ہے۔ میں تو نوکر ہوں جو کہتا ہے مجھے کرنا پڑتا

کے پار پہنچ گئے۔ وہاں کلدیپ کھڑا تھا اور اس کے پیروں کے پاس کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی کلدیپ نے پیروں میں بیٹھے ہوئے آدمی کو گالی دی اور کہنے لگا جنتاب یہ حرامی ادھر تھا۔ اس نے ہاتھ سے پاس ہی کی چیز کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے وہ صاف نظر نہیں آ رہی تھی صرف دو تین چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں سی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں اس طرف چلا گیا جدر کلدیپ نے اشارہ کیا تھا۔ پاس ہو کر دیکھا تو بڑے بڑے دو کھڈے تھے۔ اب مجھے سمجھ آ گئی کہ یہ کیا ہے۔ یہ دیسی شراب بنانے کا انتظام تھا۔ دیسی شراب بنانے کے لیے پہلے ایسے ہی کھڈے بنائے جاتے ہیں اور پھر ان میں شراب تیار کرنے والے محلول سے بھرے گھڑے رکھے جاتے ہیں۔ گاماں وہاں چھپ گیا ہوا تھا۔ جب میں نے دینو اور کلدیپ کو چھپ کر نگرانی کے لیے بھیجا تھا تو دینو کمروں کے پاس چھپ گیا تھا اور کلدیپ شریریں کے درختوں کے پار گیا تھا۔ اسے بھی کھڈوں کی کھدائی ہوئی مٹی کی ڈھیریاں نظر آئیں تو وہ اس طرف آ گیا۔ میں نے ایک کھڈے میں جھانکا تو اسے اس میں کوئی آدمی اکڑوں بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس نے اس آدمی کو پیچھے سے قیص کے کار سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا اور اسے دو تین ہاتھ لگا دیئے جو اس کے لیے کافی ثابت ہوئے اور وہ بھاگ نہ سکا۔ کلدیپ کی آواز سن کر دینو بھی کلدیپ کی طرف گیا۔ کلدیپ نے اسے پوچھا کہ یہ آدمی گاماں تو نہیں۔ دینو نے آگے ہو کر دیکھا اور گامے کو پہچان لیا۔ اس کے تعقیب کرنے پر گامے کی کلدیپ نے خاطر کردی اور دینو کو میری طرف بھیج دیا۔ میں نے گامے سے کہا کہ چلو ڈیرہ بند کرو اور میرے آگے لگو۔ وہ پوچھنے لگا کہ آپ کون ہیں؟ میں نے کہا کہ جہاں چل رہے ہیں

اس کی ماں اس کا رشتہ لے کر آئی تھی۔ یہ لڑکا گولیاں ٹافیاں بنانے والی فیکٹری میں ملازم تھا۔ قد کاٹھ اور شکل شہادت کا اچھا تھا لیکن اتنے پیسے والے نہیں تھے اور گلاب پیسے والا بھی تھا اور اس کی بیٹی ہی اس کی واحد اولاد تھی۔ گلاب کے پاس جو کچھ تھا اسی کا تھا۔ اس لیے گلاب کی بیوی نہیں مانی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی امیر گھر میں بیاہی جائے یا پھر شہباز فیکٹری کی ملازمت چھوڑ کر ماں کو لے کر اپنے سرال ہی آجائے۔ یہ بات شہباز کو گوارا نہ ہوئی اس لیے رشتہ نہ ہو سکا۔ اس کا شہباز کو دکھ بھی تھا۔ گلاب کہہ رہا تھا۔ ”شہباز کو رشتہ نہ ہونے کا جو دکھ تھا اس کا اظہار اس نے اپنے اپنے رشتہ داروں کے سامنے کیا بھی تھا جو ہمارے گھر بھی آتے تھے۔ ہمیں پتہ تھا کہ وہ ہم سے ناراض بھی ہے لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ میرے گھر میں خرابہ کرنے والوں کو اپنے گھر میں پناہ دے گا۔“ ان دنوں آڑھتیوں اور دکانداروں کو صبح ہی صبح منڈی لے جانے والی بیسیں میرے کام آ سکتی تھیں۔ میں نے گلاب سے کہا کہ تم تو گھر جاؤ۔ رضا اللہ کو میں نے ساتھ رکھ لیا۔ تھانے سے کلدیپ کو بلایا اور ہم پوچھنے سے پہلے ایک بس میں سوار ہو کر اس قصبہ جا پہنچے۔ اس قصبہ کے ساتھ ہی ایک طرف قبرستان تھا اور دوسری طرف فیکٹری تھی۔ قبرستان کے کنارے پر گھر تھا۔ جس کے دروازے پر رضا اللہ نے دستک دی۔ کچھ دیر بعد کوئی آدمی باہر آیا۔ میرے پاس کھڑے رضا اللہ نے میرا ہاتھ دبا یا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی شہباز ہے۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔

وہ اس اچانک حملے سے پریشان ہو گیا۔ اس نے رضا اللہ کو پہچان لیا تھا۔ وہ اس سے پوچھنے لگا کہ کیا بات ہے یہ کیا ہو رہا ہے؟ رضا اللہ کی

بجائے میں نے اس سے پوچھا کہ گاماں کدھر ہے؟ کہنے لگا اندر محن میں سویا ہوا ہے۔ میں نے کلدیپ کو اشارہ کیا۔ وہ اور رضا اللہ اندر گھس گئے اور تھوڑی دیر بعد ہی گامے کو گردن سے پکڑے کلدیپ باہر آ گیا۔ میں نے شہباز کو چھوڑ دیا اور دھمکایا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے ورنہ میں اسے بھی اسی طرح لے جاؤں گا۔ شہباز رضا اللہ سے پوچھتا ہی رہ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ جاننا چاہتے ہو تو گلاب کے گھر آ جانا۔ یہ کہہ کر ہم گامے کو لے کر تھانے آ گئے۔

اس بار تھانے میں گامے کے ساتھ وہی کچھ کیا جو سخت کھال والے بجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسے وقفے وقفے سے ”پلش“ لگائی۔ صرف اتنا وقفہ دیتے تھے کہ وہ تھوڑی دیر آرام کر لے مرنے جائے۔ تیسرے دن کہنے لگا کہ امیر حسین اٹاری چلا گیا ہے۔ وہاں امیر حسین کا کوئی دوست رہتا تھا اس کی وہاں ڈیرہ داری تھی۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر اس سے سارا راتہ پتہ پوچھا اور کلدیپ کو ساتھ لے کر نکل گیا۔ گامے کو ساتھ نہیں لے جا سکا کیونکہ اس کی حالت اس قابل نہیں تھی۔ بسوں میں لوگ اسے دیکھ کر باتیں بناتے۔ کلدیپ امیر حسین کو پہچانتا تھا اس لیے اس کی شناخت کا مسئلہ نہیں تھا۔ امیر حسین کے دوست کا نام ہم معلوم کر چکے تھے اس کے گھر کا پتہ آسانی سے لگ سکتا تھا۔ ہم دونوں بس پر سوار ہو کر اٹاری پہنچ گئے۔ اس چھاپے کا وقت بھی میں نے علیٰ آج ہی رکھا تھا کیونکہ کیسا ہی آوارہ گرد آدمی کیوں نہ ہو اس وقت ضرور گھر ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ گھر آ گیا ہو۔ امیر حسین کی تلاش میں ہم اس کے جس دوست کے گھر آئے تھے اس کا نام سلیم تھا اور اس کے گھر کی نشانی یہ بتائی گئی تھی کہ آٹے کی چکی کے پاس

والا گھر اس کا ہے۔ اس گھر تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ گاؤں یہ بھی قصبہ نما تھا۔ ایک جگہ روٹی کا ”پینچا“ لگا دیکھا۔ کلدیپ نے یہاں سے آٹے کی چکی کا راستہ پوچھا اور ایک بچہ ہمیں اس جگہ چھوڑ گیا۔ اس کے ساتھ دو مکان تھے ایک کا دروازہ چکی کے ساتھ ہی تھا۔ چکی کے اندر سے موٹر چلنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید کسی چیز کی پسائی ہو رہی ہو گی۔ ہم نے ساتھ والا دروازہ کھڑکایا تو کوئی باہر نہ نکلا۔ میں چکی کے اندر چلا گیا۔ ایک بوڑھا آدمی سر پر پنک پلینے کٹڈے پر چاول تول رہا تھا۔ کچے فرش پر آٹا پھرا ہوا تھا۔ اسی کمرے میں پسائی کی مشین لگی تھی جو چل رہی تھی۔ اس کا پٹہ پھٹ پھٹ کی آواز کے ساتھ ہلکی پر محوم رہا تھا۔ مشین کی آواز کی وجہ سے بابے کی آواز بہت آہستہ تھی وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا کام ہے؟ میں نے اونچی آواز میں اس سے سلیم کا پوچھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اسے بلا دو۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہی مجھے ٹھہرنے کے لیے کہا اور اس کمرے سے نکل کر دوسری طرف محن میں چلا گیا جو مجھے نظر آ رہا تھا۔ چکی دیوار کے ساتھ چار پائی بچھی ہوئی تھی۔ بابے نے چار پائی پر کھڑے ہو کر دوسری طرف دیکھا اور کسی کو آواز دی۔ یہ ضرور ساتھ والے گھر کا محن ہو گا۔ آواز دے کر بابا میرے پاس کمرے میں آ گیا اور پھر مجھے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جاؤ باہر آدمی آ رہا ہے۔ میں باہر نکل آیا۔ میں نے کلدیپ کو اشارہ کیا کہ آدمی باہر آ رہا ہے۔ وہ دروازے کے پاس ہو گیا۔ باہر آنے والا ہمارے آنے کا مقصد پوچھنے لگا کہ ہم کون ہیں، کیا کام ہے۔ میں نے اسے کہا کہ ادھر چکی میں آ جاؤ۔ وہ تھوڑی دیر توقف کے بعد بابے والے

کمرے میں آ گیا۔ میں نے جھٹ سے دروازہ بند کر کے اسے گریبان سے پکڑ کر اس کا نام پوچھا۔ کہنے لگا میں سلیم ہوں، آپ کون ہیں؟ اس کا روٹائی پر بابا بھی گھبرا گیا اور دیوار کے ساتھ پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سلیم سے کہا گھبراؤ نہیں تمہارے گھر جو مہمان ہے وہ کہاں ہے؟ اس کے منہ سے امیر حسین کا نام نکل گیا۔ میں نے کہا ہاں وہی امیر حسین۔ اس نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑا اور باہر جھانک کر کلدیپ کو اندر بلا لیا۔ کلدیپ سے میں نے کہا کہ ادھر محن میں سے ہو کر ساتھ والے گھر کے محن میں دیکھو۔ امیر حسین وہاں ہے؟ اس نے چیک کیا، کہنے لگا وہ چار پائی پر لیٹا ہوا ہے۔ اکیلا ہے اور کوئی نہیں ہے۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ دیوار پھلانگ کر جاؤ اور اسے قابو کرو۔ کچھ دیر بعد کلدیپ نے مجھے باہر سے آواز دی۔ میں سلیم اور بابے کو چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ کلدیپ امیر حسین کو گریبان سے پکڑے باہر کھڑا تھا۔ ہم اسے ساتھ لے کر آ گئے اور حوالات میں گامے کے ساتھ ہی ڈال دیا۔ وہ راستے میں بھی اور پھر تھانے میں مجھ سے پوچھتا رہا کہ کیا بات ہے۔ میں نے کہا کہ تمہارے ڈیرے سے شراب نکلی ہے۔ شراب کے پودوں کے پیچھے تم نے دیکھی شراب بنانے کے لیے جو کھڈے کھود رکھے تھے وہ گامے نے تمہاری مرضی کے بغیر ہی کھودے ہوئے تھے؟ شراب بنانے کی بات نے امیر حسین کی ہوا نکال دی۔ میں نے امیر حسین کے ساتھ بھی وہی کچھ کیا جو گامے کے ساتھ کیا تھا۔ میں نے اسے دو دن حوالات میں رکھا، مارا، پیٹا اور پھر اسے کہا کہ ڈیرے کی تلاش دو۔ مجھے دراصل سونے کے توہیڑوں کی تلاش

تھی۔ اگر وہ امیر حسین کے پاس تھے تو میں انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ امیر حسین نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ڈیرے لے گیا۔ وہاں ایک دو صندوق تھے اور چھوٹا موٹا سامان۔ ان صندوقوں میں امیر حسین کے کپڑے تھے، ایک دو رنگین برائے اور پھر وہ چیز کچل آئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ ریشمی کالی ڈوری اور اس میں پروئے ہوئے تعویذ.....

تھانے میں میرے دفتر کی میز پر کالی ڈوری میں تین تعویذ پڑے ہوئے تھے۔ یہ سالم تعویذ تھے جبکہ ایک کنڈا تھا۔ میں نے اپنے پاس رکھا ہوا تعویذ نکالا۔ اس کا کنڈا ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے اسے ڈوری میں پروئے ہوئے کنڈے کے ساتھ ملایا۔ یہ ٹوٹے ہوئے کنڈے کے ساتھ بالکل فٹ بیٹھا۔ اس تعویذ کا ڈیزائن بھی وہی تھا جو دوسرے تعویذوں کا تھا۔ گویا یہ تعویذ اسی ڈوری سے ٹوٹا تھا۔ قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ تعویذ جو میرے پاس تھا کہاں سے آیا تھا۔ یہ وہی تعویذ تھا جو مجھے سرکنڈوں میں ملا تھا۔ بالکل اسی جگہ جہاں ستارہ پر حملہ ہوا تھا اور اب یہ تعویذ امیر حسین کے تعویذوں کے ساتھ مل چکا تھا۔ میں نے ٹوٹے ہوئے تعویذ کو سالم تعویذوں کے ساتھ جوڑ کر رکھا اور امیر حسین کو حوالات سے بلوایا۔ اسے اس کے یہ تعویذ دکھائے۔ وہ کافی دیر انہیں دیکھتا رہا۔ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس کی خاموشی ہی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا یہ تعویذ تمہارے ہی ہیں ناں؟ اس نے صرف سر ہلا دیا۔ میں نے اسے حوالات واپس بھیج کر محرر سے کہا کہ اس کا اقبالی بیان تحریر کر لو۔

امیر حسین نے اقبالی بیان تو دے دیا مگر خرابی یہ تھی کہ قانون اس بیان کو ایسے نہیں مانتا تھا۔ ایک تو ستارہ کا ڈاکٹری ملاحظہ ضروری تھا اور وہ بھی

انہی دنوں ہو جانا چاہیے تھا۔ دوسرے باقاعدہ مقدمے کا اندراج کوئی نہیں تھا۔ گلاب دین یہ بدنامی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اب نہ مقدمہ درج ہوا نہ ڈاکٹری ملاحظہ کی رپورٹ۔ نہ کوئی موقع کا گواہ نہ امیر حسین کی گلاب سے دشمنی۔ کچھ بھی نہیں تھا جو امیر حسین کے خلاف جاتا۔ عدالت میں اقبالی بیان کی کیا حیثیت تھی۔ وہ اس سے فوراً مکر جاتا اور عدالت اسے رہا کر دیتی۔ یہ ساری باتیں میں نے گلاب کو بتا دیں۔ اسے یہ بھی بتا دیا کہ تمہارے مجرم یہی ہیں۔ امیر حسین اور اس کا نوکر گاماں۔ زیادہ سے زیادہ ڈیرے سے شراب کی برآمدگی پر اندر ہو جائیں گے پھر ضمانت پر باہر آجائیں گے۔ میں بھی خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔ امیر حسین کی باتیں سن کر میرا خون کھول گیا تھا۔ اس نے مجھے سارا واقعہ بتا دیا تھا۔ جس دن ستارہ لڑکیوں کے ساتھ باغ میں جھولے پر گئی تھی۔ امیر حسین اور گاماں وہیں کھالے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں ستارہ ادھر آتی دکھائی دی۔ پتہ نہیں کس شیطانی خیال سے دونوں سرکنڈوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ ستارہ جب سرکنڈوں میں کھسی تو ان پر شیطان غالب آگیا اور امیر حسین نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔

ستارہ جان والی لڑکی تھی۔ اس نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے۔ اسی دھچکا مشتی میں امیر حسین کے گلے کا ایک تعویذ ٹوٹ گیا۔ گامے اور امیر حسین دونوں نے مل کر اسے قابو کیا اور پھر دونوں نے اپنی حیوانیت کا مظاہرہ کیا۔ ستارہ نیم بیہوش ہو چکی تھی اور اس کا فائدہ اٹھا کر دونوں وہاں سے بھاگ گئے۔ وہ ماچس گامے کی جیب سے گری تھی جس کا اسے علم ہی نہیں تھا۔ ماچس گرنے کا اسے دوسرے دن علم ہوا جب وہ جوا

”دُعائقدیر بدل دیتی ہے“ (حدیث رسول)

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک ایمان افروز پیشکش

دُعائقدیر

شائع ہو گیا ہے

- ☆ متہ آتی دعائیں۔
- ☆ عظیم پیغمبران خدا کی وہ دعائیں جو نسل انسانی کے لیے نجات اور ہدایت کا باعث بنیں۔
- ☆ خاتن کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہ کی تمام مسنونہ دعائیں جو رحمت اللعالمین کی ذاتِ برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- ☆ صحابہ کرام رضوان اللہ جمیعین کی دعائیں۔
- ☆ ائمہ اکرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دعائیں۔

جدید دنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تفتیشی آمینہ روحانی اور ایسی علاج

قیمت: 160 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 7245412



کھینے لگے تھے۔ گامے نے امیر حسین سے ذکر کیا۔ امیر حسین نے اسے کہا کہ میں بھی تعویذ گنوا آیا ہوں فکر نہ کرو اگر کسی کو یہ چیزیں مل بھی جائیں گی تو کیا ہوگا؟ وہ دونوں تو یہ چیزیں گنوا کر اتنے پریشان نہیں تھے۔ میں بھی انہی کی وساطت سے ان تک پہنچا تھا۔ گلاب دین مجھے کہنے لگا کہ میں دونوں کو چھوڑ دوں۔ اس کی یہ بات سن کر میں بہت ہی حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔ جس آدمی کی بیٹی کے ساتھ یہ واقعہ ہو جائے وہ تو مرنے مارنے پر مل جاتا ہے۔ گلاب دین مجھے کہہ رہا تھا کہ انہیں چھوڑ دوں۔ میں اس کے گھر چلا گیا۔ مجھے شک تھا کہ اس کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ میں نے نذیراں سے جا کر پوچھا کہ گلاب کا دماغ ٹھیک ہے؟ وہ یہ بات کر رہا ہے۔ گلاب کی بیوی اپنے شوہر کی بہت تابعدار تھی۔ وہ وہی کرتی تھی جو وہ کہتا تھا۔ ہم میاں بیوی بھی اس کی اس عادت پر ہنستے تھے اور تعریف بھی کرتے تھے۔ خاص طور پر میں یہ تعریف کرتا تھا۔ حسب عادت نذیراں کہنے لگی اگر گلاب یہ کہہ رہا ہے اور یہی چاہتا ہے تو آپ ایسا کر دیں۔ سمجھ لیں یہی میری بھی مرضی ہو گی۔ میں نے اپنے گھر جا کر بیوی سے مشورہ کیا کہ آخر گلاب اور اس کی بیوی ایسا کیوں چاہتے ہیں۔ وہ بھی کوئی بات نہیں سوچ سکتی تھی۔ خیر امیر حسین اور گامے کے خلاف کیس پہلے ہی کمزور تھا۔ میں نے دونوں کو چھوڑ دیا جس کا مجھے بے حد افسوس بھی تھا۔

امیر حسین اور گامے کو آزاد کرنے کے بعد میں نے دینو موچی کو بلا کر کہا کہ ان دونوں کی نگرانی کرنا۔ ایک تو اپنی حفاظت کے لیے کہ تم ان کی خبری کر چکے ہو۔ وہ شرابی جواریے تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ ان

دونوں کو حرام کاری کا چکا لگ گیا ہے۔ یہ ستارہ والی حرکت گاؤں کی کسی اور لڑکی یا عورت سے نہ کریں۔

امیر حسین اور گامے کو چھوڑے ایک مہینہ گزر گیا ہو گا یا زیادہ۔ گلاب دین اب میری طرف بہت کم آتا تھا۔ دینو موچی ایک دن آ کر بتانے لگا کہ شہباز اسی گاؤں میں آ گیا ہے بلکہ امیر حسین کے ڈیرے پر بھی جاتا ہے۔ میں نے تفصیل پوچھی تو کہنے لگا کہ شہباز اپنی ماں کے ساتھ گلاب دین کے گھر آ گیا ہے۔ اسے میں نے کم از کم دو بار امیر حسین کے ڈیرے پر بھی دیکھا ہے۔ اسی شام میں بیوی کو لے کر گلاب کے گھر گیا۔ نذیراں نے بتایا کہ شہباز اور اس کی ماں ہمارے پاس آ گئے ہیں۔ شہباز نے فیملی کی نوکری چھوڑ دی ہے اور اب ہمارے کاروبار میں ہاتھ بٹائے گا اور ہمارے گھر ہی رہے گا۔ ہم ستارہ کی شادی اس سے کر رہے ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ چلو گھر کی بات گھر میں ہی رہ گئی ہے۔ گلاب بھی اس انتظام پر بہت راضی تھا۔ کہنے لگا اگرچہ شہباز کو میں پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ میرا داماد بنے لیکن اب اس نے نوکری وغیرہ چھوڑ کر میری بات مان لی ہے اس لیے اب دوسری بات ہے اور میں نے اسے داماد کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ اب جلد ہی ستارہ کی شادی بھی کر دوں گا۔ ہماری اس ملاقات کو چندہ میں دن گزر گئے ہوں گے کہ وہ بات ہو گئی جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا..... امیر حسین قتل ہو گیا!!

قتل کی اطلاع دینے والا بھی دینو موچی ہی تھا۔ اس دن بڑی سخت گرمی تھی۔ میں تھانے سے گھر نہیں گیا تھا بلکہ کھانا دفتر میں منگوایا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھو کر کرسی پر نیم دراز آرام کر رہا تھا کہ دینو موچی آ گیا۔ اس کے چلنے ہی سے

ایک کھمبہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس اُلٹے پڑے ہوئے کھمبے کو اٹھا کر دیکھا یہ کھمبہ کسی عورت کا تھا! میں نے کھمبہ اٹھایا اور وہاں پر تھانے لے آیا۔ تھانے آ کر میں نے آدمی بھیجے جو لاش امیر حسین کی ماں کے حوالے کر آئے۔ وہ کھمبہ میرے دفتر میں میرے سامنے میز پر پڑا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اتنی دیر میں پانچ آدمی تھانے آ گئے۔ مجھے انہیں دیکھ کر حیرانگی ہوئی۔ ان میں سے ایک گلاب دین، دوسرا رضا اللہ، تیسرا شہباز اور دو اور آدمی تھے جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔ گلاب دین میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رضا اللہ اور دونوں آدمی باہر بھیج دیے۔ اس کے پاس شہباز رہ گیا۔ گلاب دین نے اسے اشارہ کیا۔ شہباز نے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کر دیئے جیسے اشارہ کر رہا ہو کہ ہتھکڑی لگا لوں۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے۔ شہباز نے اپنا منہ میری طرف اٹھا کر بڑے مضبوط اور فخریہ لہجے میں کہا ”امیر حسین کو میں نے قتل کیا ہے۔ یہ کھمبہ ستارہ کا ہے۔“ شہباز کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے گلاب دین کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ وہ شہباز کی بات کی تائید کر رہا تھا۔ میں اس طرح شہباز کو کیسے ہتھکڑی لگا دیتا۔ میں نے اسے کرسی پر بٹھا دیا اور آگے بڑھ کر باہر کے کمرے کی طرف محر کو آواز دی۔ جب وہ آ گیا تو میں نے اسے شہباز کا بیان لینے کے لیے کہا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ میں بھی چپ تھا۔ گلاب دین بھی چپ تھا۔ ہم صرف شہباز کی آواز سن رہے تھے۔

”امیر حسین کو میں نے قتل کیا ہے۔ ستارہ کی عزت کے لیے۔ چاچا گلاب مانے نہ مانے ستارہ

پتہ چل رہا تھا کہ بڑی تیزی میں ہے۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ جلدی سے بول اٹھا، صاحب وہ امیر حسین..... قتل ہو گیا ہے جناب۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس سے دوبارہ پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ اس نے پھر کہا کہ امیر حسین کو کسی نے مار دیا ہے۔ ”کیا تم نے خود دیکھا ہے؟“ میں نے یقین کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔ کہنے لگا کہ اس نے خود تو نہیں دیکھا۔ وہ چودھری کے گھر سے کام کا پتہ کرنے گیا تھا کہ وہاں گاماں مصلیٰ آ گیا۔ اس نے میرے سامنے چودھری کو خبر دی ہے۔ امیر حسین کا چودھری کے گھر آنا جانا تھا۔ گاماں انہیں اطلاع دینے آ گیا ہوگا۔

چودھری اسی وقت گامے کے ساتھ نکل گیا اور میں ادھر آپ کی طرف بھاگا ہوں۔ میں نے کلدیپ کو آواز دی، اسے ساتھ لیا اور ہم دینو کے ساتھ امیر حسین کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ جن دو کمروں میں سے ایک میں سے میں نے چارپائی سے شراب کی بوتلیں اٹھائی تھیں وہیں لاش ہوئی کیونکہ وہیں دو آدمی اس کمرے کے کھلے دروازے میں سے دیکھ رہے تھے۔ قریب گئے تو ان میں سے ایک گاماں تھا اور دوسرے نے آگے بڑھ کر مجھے سلام کیا اور اپنا نام چودھری امان اللہ بتایا تھا۔ امیر حسین چارپائی پر پڑا تھا۔ اس کے گلے پر کسی نے استرا پھیر دیا تھا۔ اس کا سر جس سرہانے پر تھا وہ خون میں تر ہو چکا تھا اور خون سیاہ ہو چکا تھا۔ اسے جس کسی نے مارا تھا سوتے ہوئے مارا تھا۔ مجھے اس کے قتل ہونے پر حیرت نہیں تھی۔ وہ جس طرح کے کام کرتا تھا ان کا انجام یہی ہوتا ہے لیکن صرف ایک چیز دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی اور بات بھی بڑی حیرت کی تھی۔ امیر حسین کے منہ پر

اور جب فلم چلی تو احساس ہوا کہ لوگ واقعی عقل مند ہوتے ہیں جو کھاتے پیتے وقت مووی کے کمرے سے چھتے پھرتے ہیں مگر آپا جانی کے مووی میکر کو خاص ہدایات تھیں کہ کوئی کمرے کی زد سے نکلنے نہ پائے۔ اسی لیے سب ہی رکتے ہاتھوں پکڑے گئے۔

ایک تقریب کا اجراء جہاں آنیوالوں کا باقاعدہ ”حساب“ رکھا گیا تھا

”یہ آپ ساگرہ میں آنے والی رقوم کا اندراج کیوں کر رہی ہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
”یہ قرض حسہ ہوتا ہے۔ ہنس ہنس کر لیا جاتا ہے اور ہنس ہنس کر واپس کیا جاتا ہے۔ بس یونہی اپنی یادداشت کے لیے لکھ لیا۔“

ساگرہ کی مووی کب سے آئی رکھی تھی مگر آپا جان کے پاس ٹائم ہی نہیں تھا کہ مووی دیکھیں۔ وہ تو بس نیوٹے میں آئے لفافوں کی رقم کا اندراج اور تحائف کی مالیت کا اندازہ ایک بڑے سے رجسٹر میں درج کر رہی تھیں۔

تصدیق کی ضرورت تھی۔ میں وہاں سے چاہے گھر آ گیا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ جب برداشت جواب دے گئی تو میں صبح کے وقت قصبے چلا گیا۔ استراخیدا اور واپس امیر حسین کے ڈیرے پر آ گیا۔ اس وقت دوپہر تھی۔ گاماں پتہ نہیں کہاں تھا۔ کمرے میں امیر حسین اکیلا سویا ہوا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر استرا پھیر دیا۔ میرے اندر کی آگ پھر بھی ٹھنڈی نہ ہوئی۔ میں دروازہ بند کر کے چاہے کے گھر چلا گیا۔ وہاں سب سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ستارہ کی چارپائی کے پاس پڑی اس کی جوتی کا ایک پاؤں اٹھایا اور دوبارہ امیر حسین کے ڈیرے گیا اور جوتی اس کے منہ پر رکھ دی۔ وہ اس جوتی کے قائل ہی تھا۔“

میں نے دیکھا گلاب دین کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اس آدمی نے جسے اس نے داماد کے طور پر قبول نہیں کیا تھا اس کی عزت کا کس طرح پاسدار بن گیا کہ اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ شہباز کے اعتراف کے بعد مجھے اسے حوالات بھیجنا تھا۔ سو میں نے کیا۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا مگر قانون کے ہاتھوں میں مجبور تھا۔ میں نے اس کا چالان پیش کر دیا اور دل میں دعائیں کرتا رہا کہ شہباز عدالت میں اپنے بیان سے پھر جائے تاکہ اسے سزا نہ ہو۔ اس نے امیر حسین جیسے درندے کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اس طرح کے درندوں کے ساتھ ہوتا ہی چاہیے۔ جانے شہباز کو گلاب نے یا کسی اور نے کیا پٹی پڑھائی کہ وہ واقعی عدالت میں مکر گیا۔ قدرت نے اس کی مدد کی اور وہ بری ہو گیا۔ اس چالان بنانے میں میری ہمدردی بھی شاید شامل رہی ہو۔ آج بھی ایک لاش کے منہ پر پڑا ہوا کسمہ میری نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔

میری عزت تھی۔ میں نے اسے اپنی عزت ہی سمجھا۔ میں غریب ہوں، ایک فیکٹری میں کام کرنے والا۔ ہمارے پاس مرے نہیں تھے۔ اس لیے چاچا گلاب نے میری ماں کو ستارہ کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ میرے دل میں زخم لگا لیکن میں نے ضبط کر لیا۔ میری بے عزتی ہو گئی تھی۔ سب کو پتہ تھا کہ مجھے رشتے سے انکار ہو چکا ہے۔ ایک دن گاماں میرے پاس آیا اور کہنے لگا اسے پناہ چاہیے۔ پولیس اس کے پیچھے ہے۔ گلاب سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ اس نے پولیس پیچھے لگا دی ہے۔ وہ مجھے چاہے گلاب کا مخالف سمجھ کر میرے پاس آیا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ میں چاہے گلاب سے ناراض ہوں۔ اس کی ضرورت مدد کروں گا اور میں نے گامے کو پاس رکھ لیا۔ پھر آپ نے چھاپہ مارا اور گامے کو لے گئے۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا ”آپ جب گامے کو لے جا رہے تھے تو میں نے پوچھا تھا کہ کیا بات ہے؟ آپ نے کہا تھا کہ جانا چاہتے ہو تو گلاب کے گھر آ جانا اور میں چاہے کے گھر گیا۔ وہاں مجھے رضا اللہ نے بتایا کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے نوکری پر لات ماری اور ماں کو لے کر گلاب چاہے کے گھر آ گیا۔ یہاں مجھے چاہے اور چاچی نے وہی بات سنائی جو رضا اللہ مجھے بتا چکا تھا۔ میں نے چاہے اور چاچی سے کہا کہ یہ بدلہ اب میں لوں گا۔ چاہے اور رضا اللہ کو شک امیر حسین پر ہی تھا۔ میں نے امیر حسین پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں گلاب دین کے گھر ہی آ گیا ہوں۔ میں اس پر ظاہر کرتا رہا کہ میں اسے ملنے آتا ہوں۔ میں چاہے گلاب کا دشمن بنا رہا۔ ایک دن امیر حسین نے دب کے شراب پی رکھی تھی۔ اس نے بڑے فخر سے مجھے بتایا کہ ستارہ تمہاری بیوی نہیں بن سکی فکر نہ کرو اسے میں نے اپنی بیوی بنا لیا ہے۔ مجھے بس اسی



”مگر ہم تو ہنس ہنس کر نہیں دیتے بلکہ رو رو کر دیتے ہیں کہ آئے دنوں تو تقریبات کی بھرمار رہتی ہے۔“ میں نے اکتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس ماہ بھی چار شادیاں، دو سالگراہیں اور سات عقیقہ بھگتا چکی ہوں اور مگر کابجٹ چاروں شانے چت پڑا ہے۔“

”بڑی خالہ تو خاصا کوس کوس کر دیتی ہیں اور منجھلی نانی تو زیر لب گالیوں کے ساتھ دیتی ہیں۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے معلومات بہم پہنچائی۔

”ان پے منٹ والی تقریبات سے میزبان کو خاصا فائدہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو ایک دوسرے کی حرص میں آئے دن تقریبات کی لائنیں لگی رہتی ہیں۔ آپ کا پرس بھی خوب پھول گیا تھا۔ اب دوسرے بچے کی سالگرہ کب کر رہی ہیں؟“ میں نے آپا جانی کو چھیڑا۔ ”چلیں جنوری میں کر لیں۔“ میں نے مشورہ بھی دے ڈالا۔

”اے لو، چھوٹے گڈو کی سالگرہ جنوری میں کہاں آتی ہے وہ تو اکتوبر میں گزر بھی گئی۔ بچہ کہتا رہا ہے کہ سالگرہ کر لیں، خوب سارے تحفے آ جائیں گے مگر ان کے ”بادا“ مانے ہی نہیں۔“

”چلیں فروری میں کر لیجئے گا۔ ان تقریبات کے لیے سالگرہ کا اصلی دن کون سا ضروری ہوتا ہے۔ اب بڑی ممانی کو دیکھ لیں کہ ان کی پونی کی سالگرہ جون میں ہوتی ہے مگر وہ ٹالتی رہتی ہیں کہ ان کی بیٹیاں باہر سے آجائیں، ماموں حج سے ہو آئیں۔ موسم اچھا ہو جائے تب دسمبر میں آکر انہوں نے سالگرہ کی۔ اب سنا ہے کہ اس کی دوسری سالگرہ وہ فروری میں کریں گی کیونکہ ان کا بیٹا اور بہو سال بھر کے لیے لندن جا رہے ہیں۔ دفتری امور کی وجہ سے کہنے والے بلا سے بکتے رہیں مگر مجال ہے کہ وہ کسی کی پروا کریں۔ خوب

دھوم دھڑکے سے مہمانوں کو لوٹنے کی عادی ہوتی جا رہی ہیں۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہے مجال ہے کہ کباب پرائے سے آگے بڑھتی ہوں۔ وہی بد مزہ تیز مرچوں کے کباب اور ربڑ جیسے ٹھنڈے پرائے رکھوادیتی ہیں کہ جو پرائے اٹھائے چور ساین جائے کہ پورے کوٹھڑے کے پرائے اٹھنے لگتے ہیں مگر کنارہ ٹوٹ کر نہیں دیتا۔“ میں نے جل کر کہا۔

”تمہاری بات صحیح ہے مگر آج کے تمام مہمان کائیاں ہو گئے ہیں۔ پورے ربڑ کے ساتھ آتے ہیں جتنا کھاتے ہیں اتنی پے منٹ نہیں کرتے۔ کھانے کا زیاں الگ ہوتا ہے۔ ابھی سالگرہ کی مووی کے ساتھ نیوٹے کی رقم چیک کروں گی۔ تم دیکھ لینا کہ کون کتنا مکار ہے۔“ انہوں نے غصے سے کہا۔

”اچھا، یہ بات تھی جو آپ نے ابھی تک مووی نہیں دیکھی تھی۔“ مجھے ہنسی آگئی۔

”ہاں بھئی، دیکھنا تو ہوتا ہی ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ ہمارے ہاں محبت سے شریک کون ہوا۔ اور کمیٹنی کس کس نے دکھائی۔“ انہوں نے سالگرہ کی مووی لگاتے ہوئے کہا۔

اور جب فلم چلی تو احساس ہوا کہ لوگ واقعی عقل مند ہوتے ہیں جو کھاتے بیٹے وقت مووی کے کمرے سے چھپتے پھرتے ہیں مگر آپا جانی کے مووی میکرو خاص ہدایات تھیں کہ کوئی گیرے کی زد سے نکلنے نہ پائے۔ اسی لیے سب ہی رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔

میں دلچسپی سے مووی دیکھ رہی تھی اور آپا جانی بار بار ”سٹاپ کر کے“ مکاروں کی نشان دہی کر رہی تھیں جیسے وہ دہشت گرد ہوں۔

”افوہ بھابی کی بہن کو تو دیکھو پلیٹ میں نری مرغی کی ٹانگیں دھری ہیں جیسے بقیہ بوٹیاں انہیں

میں اسے میز کے پاس کھاتے دیکھ کر کہا کہ دیگر مہمان تو اپنی بیٹیاں لے کر دور کھڑے بھی ہو گئے مگر وہ کھانے کی میز کے پاس ہی اپنی کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔

”ارے قریبی عزیز داری ہے۔ اس لیے بلا لیا ورنہ دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ اگر نند کی بیٹی نہ ہوتی تو کبھی نہ بلاتی۔“ انہوں نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”مگر ٹھوس کس طرح رہی ہے جیسے مال مفت ہو۔“ میں نے آپا جانی کی ساس سے پیٹھ کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”دیکھ لینا ہضم تھوڑی ہو گا۔ بد بخت صرف بچپن روپے دے کر گئی ہے۔ جیسے قیام پاکستان سے پہلے کی کسی تقریب میں شریک ہوئی ہو اور اپنے ہاں کچھ ہو تو پہلے ہی سے فرمائش کرنی شروع کر دیتی ہیں۔ اب تو کچھ بھی کرے قدم نہیں دھروں گی۔ بد تیز کے۔“ آپا جانی غصے میں کھول رہی تھیں۔

”دلہن دیکھنا۔ یہ اپنی ساجدہ کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ فیروزی ساری تو ماشاء اللہ ایسی غضب کی لگ رہی ہے۔“ آپا کی ساس اپنی نواسی کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ ”اللہ میری ساجدہ کے بچے بھی کھانا کھا رہے ہیں، ورنہ وہ کہاں کھاتے ہیں۔ کتنے پیارے لگ رہے ہیں۔ ساجدہ تو سب سے پیاری ہے۔“

”اب تو موٹی ہو گئی ہے، بہت۔ ساری کہاں اچھی لگتی ہے۔“ بلخ کی طرح بھدر بھدر چل رہی تھی۔ اس سے کہیں اچھا تھا کہ شلوار قمیص پہن آتی۔“ آپا جانی نے گلے کر جلتے دل کے پھپھوے پھوڑے۔

”آف یہ مسز عارف کو دیکھو۔ صرف دو کا بلاوا

نقصان دیتی ہوں گی۔ یوں پٹی ہیں مرغی پر جیسے پہلی دفعہ کھا رہی ہوں۔ یہ نہیں کہ چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ کھلا لیتیں۔ ایک ایک بچے کی پلیٹ میں چوٹیاں کھڑی کر رکھی ہیں اور دیئے ہیں صرف اکیاون روپے۔ کم بخت پانچ سو روپے کا تو کھانا کھا گئی..... اور نیوتا دیتے ہوئے دم نکلتا ہے۔ جیسے فری کا مال تھا۔“

”ارے دفع کرو، کٹ کٹ کر نکلے گا۔ کم بخت کے۔“ آپا جانی کی ساس نے تسلی کے پھاہے رکھے اور میری ہنسی نکل گئی۔ آج ہی صبح بھابی نے فون پر بتایا تھا کہ ان کی بہن یک دم بیمار ہو گئی ہیں۔

”اور ان کو دیکھو، بڑی خالہ کو۔ یوں تو شوگر کی مرلیضہ ہیں، مگر میں ہر وقت ڈانٹنگ پر رہتی ہیں مگر ہمارے ہاں دیکھو کیسے سوٹ ڈنسر پر گر رہی ہیں۔ غضب خدا کا بربانی کی پلیٹ میں کھیر نکال رکھی ہے اور ایسے چھپا چھپ چچے بھر بھر کر منہ میں ڈال رہی ہیں کہ اب نہیں کھایا تو جہنم بھر کھانے کو نہیں ملے گا۔ بھوکی کہیں کی.....“

”اے دلہن، فیروزہ کو تو دیکھو۔“ آپا جانی کی ساس نے اپنے نکلے پنتے ہوئے کہا۔ ”کہنے کو تو لاٹ صاحب کی بیگم ہیں مگر کھا اس قدر چڑیلوں کی طرح رہی ہیں کہ توبہ۔ شاید دو دن کا فاقہ میٹیں کھولا تھا۔ منہ کیسا کچر کچر چل رہا ہے۔ اللہ کیسے بڈیاں چبا کر میزوں کے پیچھے پھینک رہی ہیں۔“

”خیر انہوں نے تو دو سو روپے دیئے ہیں بچے بھی ساتھ نہیں لائیں۔“ آپا جانی نے رجسٹر میں ان کا نیوتا چیک کر کے اطمینان سے کہا کہ جیسے ان کو معاف کیا جاسکتا ہو۔

”ساجدہ کو کیوں بلا لیا تھا۔ جبکہ پتا بھی ہے، مریحوں کی طرح کھاتی ہے۔“ میں نے مووی

وہ دونوں دم سادہ کر رہتلی زمین پر بیٹھ گئے۔ خونی درندہ غراتا ہوا گڑھے تک پہنچا جہاں دو بڑے کئے انسان قید ہو چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اب راہ فرار ممکن نہیں۔ ان کے لیے یہ موت کا نکول تھا۔ اب وہ باہر نکل سکتے اور نہ بھاگ سکتے تھے۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ اب موت یقینی ہے۔

دو دوستوں کا مجرا، موت خونی درندے کے روپ میں انکا طواف کر رہی تھی!

میں شیر، چیتے بکثرت پائے جاتے تھے۔ درختوں کے گھنے ذخائر ان جانوروں کی آماجگاہ تھے۔ انہی جنگلوں میں بعض آدم خور شیر بھی موجود تھے۔ جو انسانوں کی تاک میں رہتے۔ ان کے خوف سے بھلے مانس انسان جنگلوں کا رخ نہیں کرتے تھے۔

یہ پاکستان بننے سے پچیس، ستائیس سال قبل کا واقعہ ہے۔ پاکستان کے تمام علاقے متحدہ ہندوستان میں شامل تھے۔ ہر طرف گھنے جنگلات تھے۔ چولستانی اور نخلستانی علاقوں کی فراوانی اور خطرناک جانوروں کی بہتات تھی۔ گھنے جنگلوں



”ارے ستیاناس، مز جئد تو مچھلی بھی کھا رہی ہیں اور اوپر سے کھیر بھی جبکہ پتا ہے کہ مچھلی کے اوپر دودھ کی بنی ہوئی چیزیں نہیں کھانی چاہئیں۔ زردہ اسی وجہ سے رکھوایا تھا کہ مچھلی کھانے والے زردہ کھالیں اور یوں کھیر پر زور کم رہے مگر یہ تو سب ڈکار گئیں کہ ایک سرخ پتا دیا ہے۔ جو کچھ بھی ہو بعد میں دیکھا جائے گا۔ اس وقت حساب برابر کر لیں۔“

”ایسے ہوش قسم کے مہمانوں کو بلانا ہی نہیں چاہیے کھانے پر۔ یوں گرتے ہیں کہ تو بے..... مووی دیکھ کر مجھے بھی غصہ آ رہا تھا۔“

اور آپا کا تو پارہ ہائی ہو گیا تھا۔ بلند پریش نیوتے کے رجڑ کو چپک کرتے ہوئے بار بار ”لو“ ہو رہا تھا اور آخر وہ نڈھال سی ہو گئیں۔ مالی لحاظ سے خاصا خسارہ ہوا تھا۔ لوگوں نے نیوتا کم دیا تھا اور ٹھوننا زیادہ تھا۔

”دلہن مبر کرو..... ان کم بختوں سے اللہ ہی حساب کتاب لے گا۔ حد ہو گئی بے ایمانی کی۔“ ان کی ساس انہیں پانی پلاتے ہوئے تسلی دے رہی تھیں۔

”مگر میں نے سوچ لیا ہے۔ دو ماہ بعد ایک ساتھ ساتوں بچوں کا عقیقہ کروں گی۔ ایک بچہ یا کاٹ لوں گی۔ کھانے میں صرف کباب پرائے ہوں گے۔ وہ بھی تیز مرچوں والے کباب اور ربڑ سے پرائے کہ ٹھونسو کتنا ٹھونسے ہو۔ پھر پتا لگے گا کہ سات بچوں کے لیے گفٹ دیے ہوں گے۔“ آپا فخر سے کہہ رہی تھیں اور ان کی ساس بڑی رغبت سے قہقہہ لگا رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ چلر لوگوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے۔

تھا۔ پورے مہر کے ساتھ آگئیں اور تو اور اپنے جیٹھ اور دیوروں کے بچوں تک کو ساتھ لے آئیں اور دے کر مٹی ہیں صرف پچیس روپے کا جہاز، ڈبہ اتنا بڑا لے آئیں کہ پوری تقریب میں ان کے آگے پیچھے پھرتی رہی اور اتنے بڑے ڈبے میں سے یہ چوہا سا جہاز برآمد ہوا ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ ان کے منہ پر دے ماروں۔“ آپا، ان کے ساتھ آئے ہوئے لشکر کو دیکھ کر چیخ اٹھیں۔

”سنجبال کر رکھ لو دلہن، ان کے ہاں کوئی تقریب ہو تو یہی جہاز ان کے منہ پر دے مارنا۔“ آپا جانی کی ساس مووی دیکھتے ہوئے ہر قسم کا مرہم لیے بیٹھی تھیں۔

”ارے ان کے ہاں، کہاں ہوتی ہیں تقاریب، سوائے ساس سر کی برسی کے مجال ہے کہ سوائے غم کھانے کے کچھ اور کھلا دیں۔“ آپا جانی کو ان پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔

”اللہ میاں کہاں جاؤں۔ یہ شیشے کے گلاس بڑی بھابی نے توڑے ہیں۔ کیسا مووی والے نے پکڑا اور اس دن باجی کے بچوں پر خواخوہ بہتان لگا رہی تھیں کہ ان کے بچے بہت بدتمیز ہیں۔ بھاگتے ہوئے کئی گلاس شہید کر گئے۔ اب پتا چلا کہ یہ مذموم حرکت خود ان کی اپنی تھی۔ کشتی ہوئی تو یوں بھی آتی تھیں۔ میرے گھر کی خوشی ان کو کیسے اچھی لگ سکتی تھی۔ اب طبیعت صاف کروں گی ان کی کہ خواخوہ کا نقصان کر کے لگیں۔“

”آپا ذرا، مووی ریو سنڈ کر کے مز باسط کو دیکھو۔ دودھ کھانا کھایا ہے۔ اپنے گھر میں تو رات کا کھانا تک نہیں کھاتی ہیں۔ درجنوں تو بیماریاں لگی ہوئی ہیں اور یہاں دودھ کھا لگیں۔“

”ہاں یہ ایسے ہی ڈکاری ہیں۔“ آپا کو تاؤ آ رہا تھا۔

شکاری یہ رسک لیتے تھے۔ وہ شیروں کی گھات میں رچے، مختلف طریقوں سے شیروں کو قید کر کے لے آتے اور ریاست کے نوابوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے۔ نواب لوگ ان شیروں کو چڑیا گھر کی زینت بنا دیتے تھے۔

چڑیا گھر کو شیر باغ کہا جاتا تھا۔ دو اڑھائی صدیاں قبل انگریز نے جنگلوں کے درمیانی قطعات صاف کر کے ریلوے لائنوں کے جال بچھا دیئے تھے۔ انگریز کے دور حکومت میں پہاڑوں میں سرنگیں بنا کر ریلوے نظام میں تبدیلیاں لائی گئی تھیں۔ سمرٹھ سے جب ریل گاڑی بہاولپور کی طرف آتی تو درمیان میں ایک ذخیرہ آتا جو اس دور میں بہت گھنا تھا۔ اس ذخیرے میں بڑے خطرناک جانور پائے جاتے تھے۔

اس وقت اسٹیم یعنی کالے انجن کا دور تھا۔ اس انجن میں یہ 'خوبی' تھی کہ اچانک تیزی سے چل پڑتا تھا۔ مسافر ٹرین میں بھاگ کر سوار نہیں ہو پاتے تھے۔ میرے دادا جی جن کا نام قادر بخش تھا اس وقت جوان تھے۔ وہ جب خان پور جنگل سے بہاولپور تک کا سفر کرتے تو پنجر ٹرین میں آتے جس کا انجن کالا ہوتا تھا۔ میرے دادا جی کا ایک ہمسایہ جس کا نام خان محمد عرف خانو تھا وہ حقہ بہت پیتا تھا اور حقہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا۔ دو چار سال بعد جب میرے دادا جی بہاولپور آتے تو خان محمد کو بھی ہمراہ لے آتے تاکہ دوران سفر گپ شپ ہوتی رہے۔ دادا جی تیس بیگھے زمین کے مالک اور خوشحال تھے جبکہ خان محمد غریب آدمی تھا۔ اس لیے اس کا کرایہ اور کھانا پینا میرے دادا جی کے ذمہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ان کا ایک ساتھ بہاولپور آنے کا پروگرام بنا۔ گھر والوں نے جوار کے آٹے کی موٹی روٹیاں جن کو (ڈھوڑے) کہا

جاتا تھا فوراً لٹکا دیں۔ جوار اور مکئی کے آٹے کی روٹی ساگ کے ساتھ بڑا مزہ دیتی ہے۔ یہ اب بھی دیہاتیوں کی مرغوب غذا ہے۔ کھیتوں میں محنت کرنے والے کسان لوگوں کا معدہ ان ٹھوس روٹیوں کو ہضم کر لیتا ہے۔ ساگ دیسی گھی یا مکھن ڈال کر پکایا جاتا ہے اس لیے بڑا مزیدار ہوتا ہے۔ کھانا تیار کر کے گھر والوں نے ایک رومال میں باندھ کر ان کے حوالے کر دیا۔ یہ دونوں دوست سڑک کی بجائے گڈنڈیاں، کھالے عبور کرتے براستہ گڑھی اختیار خان پیدل خان پور روانہ ہوئے۔ اس وقت کچے راستے تھے۔ پنڈت سڑکوں کا نام و نشان نہ تھا۔ تیرہ چودہ میل کا سفر تھا جو ان دونوں نے پیدل طے کیا۔ دن کے بارہ بجے یہ سٹیشن پہنچ گئے۔ پنجر گاڑی جسے لنڈی کہتے تھے، دو بجے آنے والی تھی۔ ٹکٹ لے کر یہ دونوں پلیٹ فارم کے ایک پنجر پر بیٹھ گئے۔ خان محمد حقہ بھی پیتا رہا اور گپ شپ بھی ہوتی رہی۔ لنڈی جسے مقامی زبان میں بند پنچہ کہا جاتا ہے روہڑی سے چلتی اور خانوال اس کی آخری منزل تھی۔ کراچی (جسے کلاچی کہتے تھے) جانے کے لیے راستے میں مسافروں کو دو تین ٹرینیں تبدیل کرنا پڑتی تھیں۔ اس وقت جنگلوں سے لوگ بہت ڈرتے تھے۔ راتوں کو اکثر گھنے جنگلوں سے شیر کی بڑی گونج دار دھاڑ سنائی دیتی۔ لوگ اس دھاڑ سے خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ ٹرین کے دروازے میں اندر کی طرف نچلے حصے میں ایک چٹختی ہوتی، دوران سفر دروازہ بند کر کے چٹختی لگا دی جاتی تھی۔ کسی جنگل میں ٹرین کھڑی ہو جاتی تو مسافر دروازے اندر سے بند کر لیتے۔ اگر کوئی خطرناک جانور آتا بھی تو ٹرین کے ارد گرد گھوم کر جنگل میں روپوش ہو جاتا تھا۔ مسافر کھڑکیوں کی گرل نیچے

گرا لیتے تاکہ نیچے خوفزدہ نہ ہوں۔ دو بجے لنڈی آئی۔ دونوں دوست اس میں سوار ہو گئے۔ ٹرین چلی، چلتے، رکتے سمرٹھ جنگلشن پر آٹھری۔ اس سٹیشن پر تقریباً پون گھنٹے کا سناپ ہوتا تھا۔ کالے انجن کی حوضی میں پانی بھرا جاتا۔ بوگیوں کی لیٹریں کی چھت میں نصب آہنی حوض بھرے جاتے۔ گاڑی رکی تو میرے دادا اور ان کا دوست خانو میاں نیچے اتر کر ایک ٹوٹی ہوئی بیچ پر بیٹھ گئے جس کی ٹیگی نہیں تھی۔ پرانا دور تھا۔ تمام چیزیں خستہ حال تھیں۔

دونوں نے ساگ کے ساتھ ڈھوڑے کھائے۔ کھانا ہضم کرنے کے لیے دونوں نے پلیٹ فارم پر مرگشت شروع کر دی۔ گھومتے ہوئے دونوں کافی دور نکل گئے اور انہیں وقت کا احساس نہ ہوا۔ جب واپس آئے تو گاڑی جا چکی تھی۔ پلیٹ فارم بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ سنان پلیٹ فارم اور ہو کا عالم۔ دونوں بہت پریشان ہوئے کہ اب کیا کیا جائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ اب ریلوے لائن کے کنارے بہاولپور تک کا سفر پیدل کیا جائے۔ پیدل چلنے کی عادت تو تھی لیکن راستہ خطرناک تھا۔ درمیان میں ذخیرہ بھی تھا جس میں خطرناک جانور تھے۔ موٹے موٹے اڑدھے اور شیر اس ذخیرے میں پائے جاتے تھے۔ سورج بھی غروب ہونے والا تھا۔

سمرٹھ سے بہاولپور دس میل دور تھا۔ دونوں نے باہمی مشورے سے سفر کرنے کی ٹھان لی اور ریلوے لائن کے کنارے کنارے بہاولپور کی طرف روانہ ہوئے۔ کزیل جوان تھے۔ حوصلہ اور ہمت دلوں میں جاگزیں تھے۔ چلتے چلتے ذخیرے میں پہنچ گئے۔ عین اسی وقت سورج بھی غروب ہو گیا۔ اب وہ دونوں محتاط ہو گئے۔ احتیاطاً وہ

لائنوں کے درمیانی راستے پر آ گئے۔ دونوں لائنوں کے درمیان جو کشادہ جگہ ہوتی ہے وہ اس جگہ میں سفر کرنے لگے۔

بلند و بالا گھنے درخت خود رو جھاڑیاں، اندر بلا کی تاریکی۔ یہ سب کچھ ایک اچھے بھلے انسان کو خوفزدہ کرنے والے نظارے تھے۔ اچانک انہیں شیر کی گونج دار دھاڑ سنائی دی۔ ان کی رگوں میں خون جمند ہو گیا۔ آواز کافی نزدیک سے آئی تھی۔ اپنی حفاظت کے لیے ان کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ دونوں تومند اور کسرتی جسم کے مالک مگر

ہتھیار نہ ہونے کی وجہ سے خطرے سے دوچار تھے۔ اچانک مشرقی حصے کے ذخیرے کی جھاڑیوں میں ہلچل سی ہوئی۔ یوں لگتا تھا خونخوار درندہ جھاڑیوں میں سفر کرتا ہوا ادھر ہی آ رہا ہے۔ اب سوچنے سمجھنے کو وقت نہ تھا۔ وہ دونوں ریلوے لائن سے ذخیرے کے مغربی حصے میں اتر گئے۔ میرے دادا نے خانو سے کہا حقہ ایک طرف پھینکو اور جلدی سے کسی درخت پر چڑھنے کی کوشش کرو۔ اس خوبی درندے کے آنے سے پہلے ہمارا درختوں پہ چڑھ جانا ضروری ہے۔ ہم خالی ہاتھ ہیں یہ درندہ ہمیں چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ وہ دونوں جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

میرے دادا جی نے مڑ کر دیکھا۔ خوف سے بدن لرز گیا۔ شیر ریلوے لائن پر آ کر اب ان کی طرف بھوکی نظروں سے وکیہ رہا تھا۔ قد آور جسم شیر اب کسی بھی لمحے جست لگا کر ان کی طرف دوڑنے والا تھا۔ ان کے دل دھڑکنے لگے۔ جھاڑیوں کے آگے اچانک ایک صاف حصہ آ گیا۔ وہ اس صاف حصے میں پہنچے تو احساس ہوا کہ یہاں شیر سے بچنا قطعی ناممکن ہے۔ ان کے سر دل پر موت کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ عین اسی وقت انہیں صاف جگہ

جنگلوں کی بہتات تھی۔ لوگ سرشام ہی گھروں میں پناہ گزین ہو جاتے۔ کسان مل جل کر خطرناک جانوروں کو مار دیتے تھے۔ گھنے جنگلوں میں چھپے ہوئے درندوں کو مارنا مشکل ہوتا تھا۔ روپوش درندے اندر جانے والوں پر اس طرح حملہ کرتے کہ انسانوں کا اجتماعی حملہ ناکام ہو جاتا تھا۔ نواب صادق محمد کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ یہ ذخیرہ خطرناک جانوروں کا گڑھ ہے۔ تمام ذخیرہ ہرا بھرا تھا اس لیے اسے آگ لگانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اگر خشک درخت اور جھاڑیاں ہوتیں تو آگ لگا کر موذی درندوں کا خاتمہ کیا جاسکتا تھا۔ ایک دفعہ نواب صاحب کے ایماء پر برطانیہ سے انگریزوں کی ایک ٹیم آئی۔ ان کے پاس آتشیں ہتھیار تھے۔ انہوں نے ذخیرہ کا سروے کیا۔ ایک شیرنی اور اس کے دو بچے ان کے ہاتھ لگے۔ وہ انہوں نے نواب صاحب کے حوالے کئے اور چلے گئے۔ نواب صاحب نے شیرنی اور اس کے بچے چڑیا گھر، شیر باغ کے پیچھے والے کمرے میں موچھا دیئے۔ اس کا رد عمل یہ ہوا کہ ذخیرے میں موجود شیروں نے طوفان مچا دیا۔ وہ پھر گئے اور لوگوں کو زخمی کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے خوف سے ذخیرے کے قریب جانا چھوڑ دیا۔

میرے دادا جی اور ان کا دوست خان محمد اسی ذخیرے کے ایک گڑھ میں محبوس تھے۔ جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ یہ سمران کی بہت بڑی غلطی بن گیا تھا۔ ایک خطرناک درندہ ان کی جان کے در پے تھا۔ وہ پھنس چکے تھے تاہم شیر گڑھے میں کودنے سے باز رہا۔ نیچے دیکھنے کے بعد اس نے عجیب حرکت کی۔ گڑھے کے ارد گرد غراتے ہوئے پھر لگاتا رہا۔ وہ اوپر دائرے میں گھوم رہا تھا اور بُری طرح غرا رہا تھا۔ گویا موت ان کا

کر دی۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے ترچھی نگاہ سے اوپر دیکھا۔ گڑھے کے کنارے کافی اونچے تھے۔ شیر غراتا ہوا گڑھے کے کنارے کھڑا تھا۔ اس درندے نے گڑھے میں چھلانگ نہیں لگائی۔ غراتے ہوئے نیچے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں دو دوست دم سادھے اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ شیر گردن تک چاچا خان کو نظر آیا۔ ”یا اللہ خیر“ اس کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ میرے دادا سے مخاطب ہوا ”موذی ہمیں دیکھ رہا ہے۔ لگتا ہے نیچے کودنے کی تیاری کر رہا ہے۔“ میرے دادا نے خانو سے کہا ”خاموشی اختیار کر، مکہ شریف پڑھ لے جو بھی دعا تجھے یاد ہے اسے پڑھ، موت کا ایک دن مقرر ہے۔ اگر وقت آگیا ہے تو پھر ملے گا نہیں۔ لگتا ہے ہم دونوں کا وقت آخر آ پہنچا ہے۔ گڑگڑا کے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے۔ تیرا حقہ کہاں ہے؟“

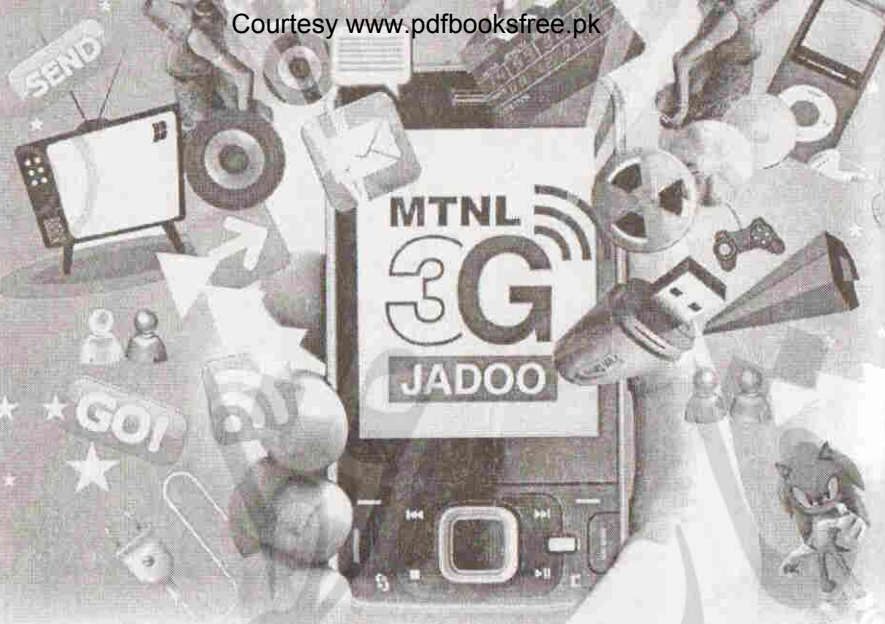
”وہ باہر پڑا ہے۔ نیچے کودتے ہوئے میں نے اسے ایک جگہ رکھ دیا تھا۔“ چاچا خان بولا۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اوپر دیکھا۔ شیر اب بھی دونوں کو غور سے دیکھ کر پیش میں غرا رہا تھا۔ کنواں نما یہ گڑھا چونکہ کافی گہرا تھا اس لیے ان دونوں نے نیچے کودتے وقت ایک ٹھنڈی کی تھی۔ اگر وہ چھلانگ لگاتے تو ان کو نقصان پہنچتا۔ وہ جلدی سے کناروں پر ہاتھ رکھ کے نیچے لٹک گئے تھے۔ اس طرح ان کے پاؤں نیچے چلے گئے تھے جس سے ان کو یہ فائدہ ہوا کہ اندر کی طوالت کا حجم گھٹ گیا۔ گرتے وقت زیادہ چوٹ پاؤں میں لگتی ہے چونکہ ان کے پاؤں نیچے چلے گئے تھے اس لیے کنویں کا نیچلا حصہ قریب ہو گیا تھا اسی وجہ سے وہ زیادہ چوٹ لگنے سے محفوظ رہے۔

پاکستان بننے سے تیس پینتیس سال پہلے گھنے

وجہ سے ان کو چوٹ کم لگی۔ وہ دونوں دم سادھ کر ریتیلی زمین پر بیٹھ گئے۔ خونی درندہ غراتا ہوا گڑھے تک پہنچا جہاں دو بے کئے انسان قید ہو چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اب راہ فرار ممکن نہیں۔ ان کے لیے یہ موت کا کنواں تھا۔ اب وہ باہر نکل سکتے اور نہ بھاگ سکتے تھے۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ اب موت یقینی ہے۔

ان کو یقین تھا کہ اب بچتا ان کے مقدر میں نہیں۔ شیر اوپر سے چھلانگ لگائے گا اور گڑھے میں آکر ان کو چیر پھاٹ کے رکھ دے گا۔ یہ گڑھا شکاریوں نے بنایا تھا۔ شکاری جنگلوں میں ایسے گڑھے مزدوروں سے بنواتے تھے کہ جب کوئی جنگلی جانور گڑھے میں گر جاتا تو شکاری جال کے ذریعے اسے باہر نکال کر قید کر لیتے۔ پھر ٹرک میں رکھ کے شہر لے جاتے۔ چاچا خان نے تسبیح شروع

پر ایک کشادہ سا گڑھا کھدایا تھا۔ وہ اس گڑھے کے قریب پہنچ گئے جو کافی گہرا تھا۔ اچانک شیر نے ایک دلدوز دھاڑ ماری اور بجلی کی سی سرعت سے کلاچیں بھرتا ہوا ان کی طرف بڑھا ”مر گئے۔ اب موت یقینی ہے۔“ چاچا خان بولا۔ اب کسی درخت پر چڑھنے کے لیے ان کے پاس وقت نہ تھا۔ ان کے اور شیر کے درمیان فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق انہوں نے ایک ساتھ گڑھے میں اتر کر کناروں سے لٹکتے ہوئے چھلانگ لگا دی۔ گڑھا کسی کنویں کی مانند تھا۔ تقریباً بیس فٹ گہرائی ہو گی۔ وہ دونوں دھڑام سے گڑھے کی تہہ میں جا گرے۔ ان کی قسمت یاوری یہ ہوئی کہ گڑھے کی تہہ ٹھوس نہیں تھی ورنہ ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ کنویں نما گڑھے کا فرش ریتلا تھا۔ بھربھری اور نرم زمین کی



فیضان خاں

ٹیکنالوجی کی دنیا

3G ٹیکنالوجی: میلوں پارلوگوں سے ریل ٹائم کیونٹیشن، ہائی سپیڈ وائرلیس انٹرنیٹ اور موبائل ٹی وی، جیسی سہولیات اسی ٹیکنالوجی کی بدولت مل رہی ہیں!

امریکہ کی ورچوئل ایلمینسی: ایرانی لوگوں سے رابطہ برقرار رکھنے اور اپنا حلقہ اثر بڑھانے کے لیے امریکہ کی نئی چال.....!

آئی فون 5 جلد منظر عام پر آنے والا ہے!

3G..... خوابوں کو حقیقت دینے والی ٹیکنالوجی

ایک زمانہ تھا جب یہ باتیں محض خواب لگتی تھیں کہ آپ سات سمندر پار اپنے عزیز و اقارب اور رشتہ داروں سے جب چاہیں بات کر سکیں بلکہ انہیں عین اسی وقت چلتے پھرتے، ہنستے کھیلتے، بات کرتے لائیو دیکھ بھی سکیں۔ اسی طرح دور دراز مقامات پر، کھلے میدانوں، پہاڑوں اور برف زاروں کی سیاحت کے دوران حسین نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ

ساتھ بغیر کسی واسطہ اور لمبی تاروں کے جھنجھٹ کے انٹرنیٹ کا مزہ لیں اور ساتھ ہی ان حسین نظاروں کی لائیو ویڈیو بھی گھر بیٹھے اپنے عزیزوں تک پہنچاتے رہیں۔ یہی نہیں بلکہ سبھی بھی کہیں بھی موبائل ٹی وی اور لائیو ٹیلی کاسٹ کے مزے بھی حاصل کریں۔ یہ سب اب نہ صرف ممکن ہے بلکہ بہت تیزی سے عام لوگوں کی دسترس میں بھی پہنچ رہا ہے اور اس سب کا باعث ہے 3G یا ”تھرڈ جینریشن موبائل ٹیلی کمیونیکیشن“۔ اس ٹیکنالوجی کے تحت بے شمار حیرت انگیز ایپلی کیشنز ہماری

محموظ ہوئے۔ وہ ان کو اپنی جیب میں گھر چھوڑنے آئے تو داداجی نے ان کی میزبانی کرنا چاہی مگر وہ نہ مانے۔ داداجی نے غلبت میں شکر کا شربت انہیں پلایا۔ میں نے جب چاچا خانو کو دیکھا تو وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ میرے داداجی انتقال کر چکے تھے۔ یہ کہانی مجھے چاچا خانو نے سنا ہی تھی۔ داداجی اور چاچا خانو نے شکاریوں سے سوال کیا تھا کہ خونخوار شیر گڑھے کے ارد گرد دائرے میں چکر لگاتا رہا اندر کیوں نہیں کودا؟ شکاریوں کے سرغنہ نے ہنس کر جواب دیا ”جوانو! بات یہ ہے کہ شیر اس وقت بھوکا نہیں ہو گا۔ کسی جانور کا شکار کر کے وہ شکم سیری کر چکا ہو گا۔ اگر بھوکا ہوتا تو فوراً گڑھے میں کود پڑتا۔ یہ ہمارا پہلا نظریہ ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے اسی گڑھے میں اس شیر کی مادہ گرہنی تھی۔ وہ باہر نہیں نکل سکی تھی۔ شیر نے اس کی کسمپرسی اور مجبوری دیکھ لی تھی۔ جانور ہے کچھ تو عقل رکھتا ہو گا۔ اس نے اپنے تئیں اندازہ قائم کر لیا ہو گا کہ گڑھے میں سے کود کر باہر نکلنا ناممکن ہے۔ اس لیے وہ گڑھے کے ارد گرد چکر لگاتا رہا مگر اندر نہیں کودا۔ یہ دو وجوہات ہیں۔ پھر آپ کی زندگی کے ایام ماہ و سال بھی باقی تھے۔ اس لیے قدرت نے آپ کو بچا لیا۔“ شکاریوں نے مزید بتایا کہ ”وہ شیرنی جو اس گڑھے میں گری تھی ہم نے نواب صاحب کے کہنے پر چڑیا گھر کے عملے کے حوالے کر دی تھی۔ نواب صاحب نے اس کے بدلے ہمیں شاہی اجرک اور کافی انعام و کرام دیا تھا۔“

داداجی اور چاچا خانو بھی اس شیرنی کے شکر گزار تھے کہ اس کی حالت دیکھنے کی وجہ سے ہی خونخوار شیر گڑھے میں کود کر ان دونوں کو نقصان پہنچانے سے باز رہا تھا۔

طواف کر رہی تھی۔ وہ دونوں دم سادھے بیٹھے تھے۔ جسم کو حرکت نہ دیتے تھے کہ کہیں شیر پھر کر گڑھے میں نہ کود آئے۔ پندرہ بیس منٹ تک خونخوار شیر گڑھے کے ارد گرد چکر لگاتا رہا۔ پھر غراتا ہوا درختوں میں روپوش ہو گیا۔ انہیں یہ بات سمجھ نہیں آئی تھی کہ شیر گڑھے میں کیوں نہ کودا۔ شاید وہ درندہ حساس اور سمجھدار تھا۔ گڑھے میں قید ہو جانے کا احساس اس کے اندر جاگزیں تھا۔ وہ دونوں شیر کے چلے جانے کے کافی دیر بعد تک گڑھے میں بیٹھے رہے۔ دبی آواز میں گفتگو کرتے رہے۔ رات کافی دیر پہلے زمین پر آڑ آئی تھی۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ باہر نکلنے سے قاصر تھے۔ اگر گڑھا ذرا تنگ ہوتا تو وہ ٹانگیں پھیلا کر پیر گڑھے کی دیواروں پر ٹکاتے اور اوپر آنے کی کوشش کرتے۔ گڑھے کی گولائی زیادہ تھی اس لیے یہ کوشش بے سود تھی۔ سوتے جاتے اپنے خالق و مالک کو یاد کرتے وہ رات انہوں نے گڑھے میں گزاری۔ دوسری صبح دن کے گیارہ بجے تک وہ گڑھے میں رہے۔ پھر ان کی دعائیں رنگ لائیں اور اچانک کسی انجن کی گڑ گڑاہٹ سنا دی۔ پھر ایک شکاری جیب گڑھے سے کچھ فاصلے پر ریلوے لائن کے قریب آ کر رکی۔ جیب میں سے شکاری نیچے اترے۔ ان کے پاس گلوں والی بندوقیں تھیں۔ وہ گڑھے کی طرف بڑھے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ گڑھے میں کوئی خونخوار درندہ بگڑا ہے تو وہ اسے نکال لے جائیں۔ کنارے پر پہنچ کر وہ ششدر رہ گئے۔ گڑھے میں دو آدمی انہیں سراسیمہ حالت میں نظر آئے۔ شکاری یہ صورتحال دیکھ کر بہت ہنسے۔ بہر حال انہوں نے رسہ اندر ڈال کر ان کو باہر نکالا۔ مختصر لفظوں میں چچا خانو نے ان کو سارا واقعہ سنا دیا۔ شکاری روداد سن کر کافی

زندگیوں میں انقلاب برپا کر رہی ہیں اور اس کے تحت مہیا کی جانے والی اہم سروسز میں وائیڈ ایریا وائرلیس اور وائس ٹیلی فون، موبائل انٹرنیٹ، ویڈیو کالز اور موبائل ٹی وی شامل ہیں اور یہ سب سروسز موبائل انفراسٹرکچر میں مہیا کی جاتی ہیں یعنی آپ ان سروسز سے لطف اندوز ہونے کے لیے کسی خاص جگہ کے محتاج نہیں ہوتے۔ ذرا تکنیکی لحاظ سے دیکھیں تو اس وقت تک ٹیلی کام کے شعبے میں تین طرح کی ٹیکنالوجی متعارف ہوئی ہے جن میں 3G سب سے ایڈوانس اور جدید ہے۔ IG (Network Analog) اور دوسری 2G (Digital system with network) تھیں۔ 3G ٹیکنالوجی سب سے پہلے جاپان میں 30 مئی 2001ء کو NTT Docomo نے متعارف کروائی جس کی رفتار 384 کلواٹ فی سیکنڈ تھی تاہم اب اس کی رفتار 3 ایم بی تک ہو گئی ہے۔ اس وقت 3G ٹیکنالوجی کا جال پوری دنیا میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل رہا ہے۔ یہ ٹیکنالوجی کئی ممالک میں عام ہو چکی ہے حتیٰ کہ ہمارا پڑوسی ملک بھارت بھی اس ٹیکنالوجی سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔

3G ٹیکنالوجی کے ذریعے آن لائن خریداری، ویڈیو سیل، موبائل بینکنگ، ڈیجیٹل معلومات کا تبادلہ (آڈیو اور ویڈیو کانفرنسنگ) انتہائی تیز رفتاری سے ممکن ہے نیز ڈرامے، موسیقی کے پروگرام اور کھیلوں کے پروگرام کسی بھی وقت دیکھے، روکے اور دوبارہ دیکھے جاسکتے ہیں نیز انہیں چند منٹوں میں ڈاؤن لوڈ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ذریعے آپ اپنے گھر پر موجود کسی بھی انٹیمیشن سسٹم سے باآسانی کنیکٹ ہو کر اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ چونکہ اس ٹیکنالوجی کے ذریعے انتہائی برق رفتار ترسیل ممکن ہے لہذا آپ ریل ٹائم میں بہترین آواز اور ویڈیو کے ساتھ چیٹنگ کر سکتے ہیں۔ آسان الفاظ میں کہا جائے تو یہ ٹیکنالوجی دنیا سے

ہر وقت Live انداز میں منسلک رہنے کا باعث ہے اور امید کی جا رہی ہے کہ یہ بہت جلد ہم پاکستانیوں کی روزمرہ زندگیوں کا حصہ بھی بن جائے گی۔

اس وقت 3G ٹیکنالوجی دنیا کے کئی اہم ممالک میں رائج ہے جن میں امریکہ، جاپان، انگلستان، جنوبی کوریا، افریقہ، چین، بھارت، فلپائن، یورپ، عراق، شام، ترکی، کینیڈا اور اب پاکستان بھی شامل ہے۔

بہت سی ٹیلی کمیونی کیشن کمپنیاں 3G ٹیکنالوجی کو مارکیٹنگ کے حربے کے طور پر استعمال کرتی ہیں اور یہ کہتی ہیں کہ ان کی کمپنی تھری جی ٹیکنالوجی کے تحت انٹرنیٹ سروس فراہم کرتی ہے۔ دراصل تھری جی کے تحت سروس مہیا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کمپنی کی سروسز بین الاقوامی معیار 2000-IMT کے تکنیکی شیڈرڈز کے مطابق ہوں جس کے تحت آواز اور ویڈیو کی ترسیل کی رفتار کا عالمی معیار مقرر کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی معیار 2000-IMT پر پورا اترنے کے لیے کمپنی کو ڈیٹا ٹرانسفر کا انتہائی تیز معیار مہیا کرنا ہوتا ہے جو کہ 200 کلواٹ فی سیکنڈ کم از کم ہے تاہم بہت سی کمپنیاں اس ٹیکنالوجی کی مدد سے اس کم از کم معیار سے کہیں زیادہ رفتار پر مبنی سروسز مہیا کرتی ہیں۔

پاکستان میں سب سے پہلے پی ٹی سی ایل نے 2008ء کے وسط میں اپنی موبائل انٹرنیٹ ڈیوائس Evo میں تھری جی ٹیکنالوجی متعارف کروائی تھی اور اب یہ سروس پاکستان کے 105 بڑے شہروں اور قصبوں میں مہیا کی جا رہی ہے۔ اب ایک اور کمپنی ورلڈ کال بھی پاکستان کے تقریباً 50 شہروں میں 3G سروس مہیا کر رہی ہے۔ پاکستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ 14 اگست 2010ء کو پاکستان دنیا میں پہلا ملک بن گیا جہاں 9.3 ایم بی فی سیکنڈ کی رفتار سے تھری جی ٹیکنالوجی کے تحت انٹرنیٹ سروس مہیا کی جائے گی۔ یہ کام بھی پی ٹی سی ایل نے اپنی نئی انٹرنیٹ

ڈیوائس EVDO's REV B تھری جی کے ذریعے کر دکھایا۔ اب یہ سروس EVONITRO کے برینڈ نام کے ساتھ ملک بھر میں فراہم کی جا رہی ہے۔

موبائل کمپنیوں کے حوالے سے دیکھیں تو اس وقت پاکستان میں کچھ ٹیلی کام کمپنیاں اس کو متعارف کروانے کے بارے میں اقدامات کر رہی ہیں جبکہ کچھ نے اسے متعارف کروا بھی دیا ہے۔ ٹیلی نار پاکستان نے سب سے پہلے اسے متعارف کرواتے ہوئے موبائل ٹی وی کی سروس مہیا کی تھی تاہم یہ سروس زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں تھری جی ٹیکنالوجی والے ہینڈ سیٹ بہت کم دستیاب تھے تاہم اب ایپل آئی فونز کے تیزی سے بڑھتے رجحان اور دیگر تھری جی ٹیکنالوجی کے حامل ہینڈ سیٹ بھی لوگوں میں مقبول ہو رہے ہیں اور اسی لیے موبائل فون کمپنیاں بھی بہت تیزی سے اس سروس کو اپنے نیٹ ورک میں شامل کر رہی ہیں۔ ایپل آئی فون کے ساتھ ساتھ ایپل، ایچ بی، ڈیل اور سونی کے ٹیبلٹ بھی تیزی سے مقبول ہو رہے ہیں جن میں تھری جی ٹیکنالوجی متعارف کروائی جا رہی ہے۔ انہی کی نقید میں پی ٹی سی ایل نے بھی اپنا تھری جی ٹیبلٹ متعارف کروا دیا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کب تک یہ ممکن ہو پاتا ہے کہ عام شہری بھی اس ٹیکنالوجی کو باآسانی استعمال کر سکیں اور بھارت کی طرح اس سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

☆☆☆

امریکہ نے ایران کیلئے

ورچوئل ایمبسی قائم کر دی

ایران اور امریکہ کے تعلقات نہ صرف تناؤ کا شکار ہیں بلکہ دونوں ممالک ایک لحاظ سے باہم برسر پیکار ہیں۔ خاص طور پر امریکہ مسلسل ایران کو دباؤ کا شکار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تجارتی و اقتصادی

باندھنیاں، ایٹمی پروگرام کے حوالے سے عالمی دباؤ اور فوجی کارروائی کی دھمکیاں آئے روز سننے میں آتی ہیں۔ ایران سے اصل خطرہ اسرائیل کو لاحق ہے جو خطہ میں اپنی بلا دستی قائم رکھنے کے لیے کسی طور ایران کو جوہری طاقت حاصل کرتے نہیں دیکھنا چاہتا چنانچہ اسرائیل کی مضبوط یہودی لابی امریکہ کے اہم سیاسی و ابلاغی حلقوں میں اثر و رسوخ کے باعث امریکہ کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ایران کو جوہری طاقت بننے سے روکنے کے لیے اپنا کردار ادا کرے۔ چنانچہ امریکہ ہر حربہ استعمال کر کے ایران کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتا ہے اور اسے کمزور کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ ایران بھی امریکہ اور اسرائیل کی یہودی لابی کی سازشوں سے بخوبی آگاہ ہے اور وہ امریکہ کے سازش محلوں کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ کشیدہ تعلقات کے باعث دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات بھی ایک عرصہ سے بند ہیں تاہم امریکہ نے ایران کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور ایران میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لیے ایک ”ورچوئل ایمبسی“ قائم کر دی ہے تاکہ باہمی تعلقات کی عدم موجودگی کے باوجود ایران میں اپنا حلقہ اثر قائم رکھ سکے۔

امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے اکتوبر میں اس پراجیکٹ کے منصوبے کا اعلان کیا تھا جس پر ایران کے مقتدر حلقے پہلے ہی بے حد شدید رد عمل کا اظہار کر چکے ہیں۔ ایرانی افسانہ نگار کے مطابق امریکہ اس ”ورچوئل ایمبسی“ کے ذریعے دراصل ایران کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور اسے کمزور کرنے کی سازشیں تیار کرنا چاہتا ہے۔ ایمبسی جے <http://iran.usembassy.gov> کے ایڈریس سے آن لائن کیا گیا انگریزی اور فارسی زبانوں میں معلومات مہیا کرتی ہے اور اس کے ذریعے ایرانی شہری آن لائن آ کر امریکی ویزا کے

ایرانی شہریوں کو ان درخواستوں کے باوجود عملی طور پر ویزا کے حصول کے لیے دوسرے ممالک جیسا کہ سعودی عرب یا ترکی وغیرہ جانا پڑے گا۔ یاد رہے کہ امریکہ اور ایران کے درمیان 1979ء کے اسلامی انقلاب کے بعد سے سفارتی تعلقات منقطع ہیں۔

☆☆☆

آئی فون جلد منظر عام

پر آنے والا ہے

رپورٹ کے مطابق اپیل کمپنی بہت جلد اپنے مقبول زمانہ ہینڈ سیٹ آئی فون کا نیا ماڈل iPhone-5 متعارف کروانے والی ہے۔ اپیل کے کیلی فورنیا میں واقع ہیڈ کوارٹر میں اس حوالے سے ایک خصوصی تقریب منعقد کی جائے گی جسے LetsTalk "iPhone" کا عنوان دیا گیا ہے۔

ماہرین کے مطابق نیا فون زیادہ بڑی سکرین کے ساتھ ہو گا اور یہ ریموٹ کمپیونگ ڈیوائسز کے ساتھ زیادہ بہتر طور پر کام کرنے کے قابل ہو گا۔

اپیل آئی فون پانچ سالہ سی ای او اسٹیو جابز کے بعد نئے چیف ایگزیکٹو ٹم کک کے زیر انتظام پہلی پراڈکٹ ہو گا۔ آئی فون کو پہلی بار 2007ء میں متعارف کروایا گیا تھا اور اب یہ سمارٹ فون مارکیٹ میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا سیٹ ہے۔ تائیوان کی مشہور کمپنی Hon Hai Precision اور Pegatron Corp مل کر نیا آئی فون تیار کریں گی اور انہیں کہہ دیا گیا ہے کہ وہ 45 ملین یونٹ تیار کرنے کی مکمل تیاری رکھیں۔

☆☆☆

پاکستان میں کرپشن کا خاتمہ

بذریعہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی

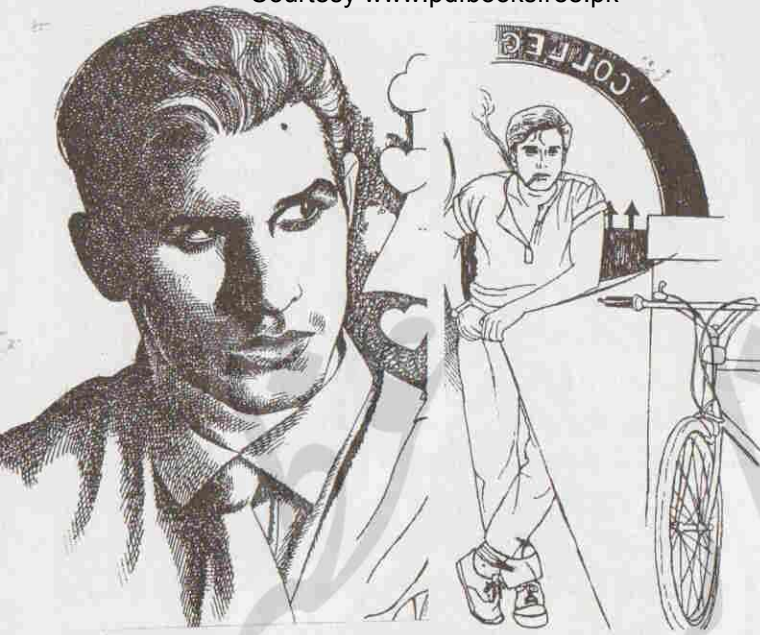
پاکستان میں کرپشن کا زہر تمام سرکاری اداروں میں کینسر کی طرح سرایت کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ

بارے میں معلومات اور امریکی فنڈز سے چلنے والے وائس آف امریکہ کی خبروں سے استفادہ کر سکتے ہیں نیز سوشل میڈیا کے ذریعے باہم خیالات کا تبادلہ بھی کر سکتے ہیں۔

اس ویب سائٹ پر آنے والوں کو "ویکٹر نوٹ" کے طور پر ہیکری کلنٹن کی طرف سے یہ جملہ سننے کو ملتا ہے کہ "مجھے امید ہے یہ پلیٹ فارم امریکی اور ایرانی عوام کو بغیر کسی خوف کے مل کر باہم تبادلہ خیال کا موقع فراہم کرے گا۔" اسی ویب سائٹ پر ایک ویڈیو پیغام میں ہیکری کلنٹن کہتی ہیں "چونکہ ایران اور امریکہ کے درمیان سفارتی تعلقات نہیں ہیں اس لیے ہم نے آپ (ایرانی شہریوں) سے بات چیت کے بہت سے اچھے مواقع کھودیے ہیں لیکن آج ہم نئی ٹیکنالوجی اور جدید آلات کی مدد سے اس خلا کو پُر کرنے اور دونوں ممالک کے درمیان دریاں کم کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور اسی مقصد کے تحت ہم نے یہ "ورچوئل ایکیسی" قائم کی ہے۔

امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی اعلیٰ عہدیدار وینڈی لیمن نے اس حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ "دراصل امریکہ ایران کے عام لوگوں سے بات چیت کرنے کا خواہشمند ہے بجائے ان اعلیٰ ایرانی عہدیداروں کے جن کی اور ہماری سوچ میں بہت فرق ہے۔ ایران کے تنگ نظر حکمرانوں نے انٹرنیٹ، موبائل فون اور سوشل میڈیا پر قدغن لگا کر ایک طرح سے دونوں ممالک کے عوام کے درمیان "برقی پردہ" حائل کر رکھا ہے اور ہم اس منصوبے کے ذریعے دراصل اس پردہ کو ہٹانے کی ایک کوشش کر رہے ہیں۔"

ورچوئل ایکیسی کے ذریعے ایران کے شہری امریکی ویزے کے حصول کے لیے درخواست فارم ڈاؤن لوڈ کر کے ویزا درخواستیں جمع کروائیں گے تاہم



محمد عبداللہ عاقر

کالا پانی

بس کو پانے کیلئے کیا کیا جتن نہ کرتے تھے۔ کبھی دعائیں مانگتے، کبھی چہل قدمی کرتے، کبھی بیروں فقیروں کی منتیں مانتے، کبھی شعر و شاعری کرتے، لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بس کے آٹار دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔ جب کبھی بس دور سے آتی دکھائی دیتی تو سارا جھوم چو کنا ہو جاتا۔ وہ جونہی قریب آتی سب حملہ کر دیتے۔

ایک طالب علم کا قصہ جسے حصول علم کیلئے ”کالے پانی“ کی سزا بھگتنا پڑی

نتیجہ پر پہنچنے کے جو کچھ بھی ہو اس سزا میں کالے پانی کا کوئی نہ کوئی دخل ضرور ہوگا لیکن جب شعور آیا تو عقدہ کھلا کہ یہ تو جزائر ایمان کو کہتے ہیں جہاں ہندوستان سے عمر قید کے مجرم بھیجے جاتے تھے۔ اگرچہ اس سزا میں کالے پانی کو تو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا البتہ مجرم کو ایسی جگہ پر رکھا جاتا کہ نہ اپنوں کی خبر ہوتی تھی نہ بیگانوں کی۔ دوسرے اس کی صورت کو

جب چھوٹے تھے تو بڑے بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ انگریز نے فلاں کو کالے پانی کی سزا دی۔ تب گھٹنوں سوچتے کہ نہ جانے یہ کالا پانی کیسی سزا ہوگی۔ نام سے کچھ عجیب و غریب معلوم ہوتی تھی۔ سوچتے کہ مجرم بیچارے کو کالے پانی میں غوطے لگوائے جاتے ہوں گے یا پھر کالے پانی میں ڈبو دیا جاتا ہوگا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس ہی

- 2- ہر قسم کی آمدنی کے ذرائع
- 3- اخراجات
- 4- بینک اکاؤنٹس
- 5- ٹیکس کی ادائیگی
- 6- کریڈٹ کارڈ
- 7- کلب کی ممبرشپ (اگر کسی کی ہے)
- 8- تعلیمی اخراجات
- 9- انشورنس
- 10- ملکی و غیر ملکی سفر
- 11- واجبات کی ادائیگی
- 12- نوکری یا کاروبار کی تفصیلات

اس فارم کے موصول ہونے کے بعد ہر پاکستانی کے اثاثہ جات، آمدنی و اخراجات، نوکری و کاروبار وغیرہ کی تفصیلات NADRA کے ریکارڈ میں شامل ہو جائیں گی۔ اس طرح نہ صرف کرپشن کے ذریعے حاصل کردہ اثاثہ جات، آمدنی اور اخراجات کو چھپانا ناممکن ہوگا بلکہ بلیک اکاؤنٹی کو بھی دستاویزی کیا جاسکے گا۔ اس پروگرام کو مزید موثر بنانے کے لیے ضروری ہوگا کہ تمام بے نام اور گننام اثاثہ جات کو دستاویزی کیا جائے، انتقال جائیداد کا طریقہ کار تیز رفتار، سادہ اور کم خرچ بنایا جائے تاکہ تمام جائیداد کی تفصیلات موجود ہوں۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص قانون کی خلاف ورزی کر کے جائیداد بناتا ہے اور اس کے اخراجات اس کی آمدنی سے زیادہ ہوتے ہیں تو ایسے شخص پر قانونی گرفت نہ صرف آسان ہوگی بلکہ عدالت سے اس کو سزا دلانا بھی آسان ہوگا۔ امید ہے کہ ارباب اختیار تجویز کردہ طریقہ کار پر سنجیدگی سے غور کریں گے تاکہ ملک سے نہ صرف کرپشن کا خاتمہ ہو بلکہ ملزمان کو عدالت سے سزا دلانا بھی یقینی ہو سکے۔

عام شہری یا کاروباری حضرات ٹیکسوں کی پچت، غیر قانونی ذرائع یا غیر دستاویزی کاروبار سے جو دولت اکٹھی کرتے ہیں ان کا حساب لینا مشکل ہو گیا ہے۔ اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ہم کاروبار اور معیشت کو دستاویزی بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ ان وائٹ کالر جرائم کی تفتیش اور پھر عدالتوں میں کرپشن ثابت کرنا ہر کیس میں ممکن نہیں ہوتا۔ سرکاری اداروں اور نجی کاروبار میں کرپشن اور غیر قانونی معاملات کی روک تھام کے لیے 70 کی دہائی میں ایف آئی آر اور 80 کی دہائی میں احتساب بیورو کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان اداروں نے پچھلے کئی عشروں میں تفتیش کو جدید خطوط پر استوار کیا اور چالان عدالتوں میں پیش کیے لیکن دستاویزی ثبوت کی کمی کی بنا پر زیادہ تر کیسوں میں عدالتیں ملزمان کو سزا نہیں دے سکیں بلکہ کئی کیسوں میں ملزمان یا تو ضمانتوں پر رہا ہو گئے یا الزامات سے بری ہو گئے۔ ظاہر ہے جو شہادتیں عدالتوں میں پیش کی گئی تھیں وہ دستاویزات کے ساتھ مکمل ثبوت پیش کرنے سے قاصر تھیں۔

درج بالا حقائق کی روشنی میں ضروری ہو گیا ہے کہ ملک میں آمدنی اور خرچ کے طریقہ کار کو مکمل دستاویزی بنایا جائے تاکہ غیر قانونی کام کی گرفت آسان ہو اور ان کو عدالتوں میں بھی قابل قبول بنایا جائے۔ اس طریقہ کار کو قابل عمل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے مدد لیں۔ اس کے لیے ہم NADRA کے ریکارڈ سے مستفید ہو سکتے ہیں جس میں تمام پاکستانیوں کا RECORD/DATA BASE موجود ہے لہذا اس طریقہ کار پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ تمام پاکستانیوں سے ایک فارم پر کروایا جائے جس میں درج ذیل تفصیلات درکار ہوں:

1- تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کی تفصیل

ترسیں اور وہ دوسروں کی صورت کو۔

دوستو! دستور زمانہ ہے کہ جب بچہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کی بڑی سواگت ہوتی ہے۔ اگر کوئی بچہ پہلی جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی پاتا ہے تو اسے بڑے انعام دیئے جاتے ہیں اور خاطر مدارت کی جاتی ہے لیکن جہاں تک ہمارا حافظہ کام کرتا ہے اس کے مطابق جب ہمیں انجینئرنگ کالج میں داخلہ ملا تو وہاں ذرا مختلف قسم کی ہی خاطر تواضع ہوئی۔ کالج کے باسی طالب علموں نے فرسٹ ایئر فول جان کر مذاقہ گفتگو سے استقبال کیا۔ کالج کی انتظامیہ نے ہاسٹل نمبر 4 یا نمبر 7 جیسے ڈاک بنگلوں جو کہ کالج سے کافی دور واقع تھے رہائش کا بندوبست کیا۔ بس خدا بھلا کرے الیکشن امیدواروں کا وہی ہمارے تنہا نمونے و ہمدرد تھے۔ جوں جوں الیکشن کے دن قریب آتے گئے توں توں ہماری خاطر مدارت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ان دنوں فراوانی سے ایک دوسرے کے گلے ملا جاتا ہے۔ جسے کچھ من چلے سیاسی پھردوں کا خطاب بھی دیتے ہیں۔ ان دنوں ایک امیدوار ایک ہی لڑکے سے فی یوم 30 بار تک گلے ملنے سے نہیں جھجکتا اور کئی بار چائے پلانے اور سیوا کرنے سے نہیں رکتا۔ ہم ہاسٹل نمبر 4 کا کارڈ لے کر کالج کے برآمدے میں لڑکھڑاتے قدموں سے چہل قدمی فرما رہے تھے کہ ایک لڑکے نے پوچھا کون سے ہاسٹل کا کارڈ ہے۔ ہم نے نہایت افسردگی اور بے چارگی سے کارڈ ہی آگے بڑھا دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ دو چار الفاظ ہمدردی کے ہی بول دے گا لیکن وہ فرمانے لگا کہ یہ سزا تو بھگتنی پڑے گی۔ ہم نے روہانسی آواز میں کہا آخر کیوں؟ کس جرم میں؟ بغیر کسی جرم کے۔ ہم نے بھی گزاری ہے، سب یونہی گزارتے ہیں۔ اس نے اپنا فلسفہ بھاڑا۔ ہم اپنا سا

منہ لے کر سوچتے رہ گئے۔ شاید انجینئرنگ کرنے کی یہی سزا ہے۔ ہاسٹل سے جان بچانے کے لیے ہم نے کافی ہاتھ پاؤں مارے لیکن بے سود و بے ثمر۔ سفارش اپنے پاس نہ تھی۔ ہمارا کوئی رشتہ دار کسی قریبی ہاسٹل کا وارڈن بھی نہ تھا۔ اقتدار بالا تک رسائی ناممکن تھی۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے ہمیں کالے پانی کی سزا ہوگئی۔ کیا پوچھتے ہو صاحبو! نماز فجر سے ہی اگر کالج کی تیاری میں مشغول نہ ہو جاتے تو بس ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور اگر کبھی بد قسمتی سے لیٹ ہو جاتے تو پانچ منٹ کے لیٹ ہونے کا خمیازہ یہ بھگتنا پڑتا کہ بس آگے اور ہم پیچھے ہوتے۔ اب ہم ہوتے اور ہمارا مقدر۔ اگر دوسری بس کا انتظار کرتے تو لیٹ ہوتے اور اگر پیدل مارچ کرتے تو تب بھی لیٹے ہوتے۔ کچھ بھائی نہ دیتا کیا کریں کیا نہ کریں۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ اوپر سے اگر محترم پاشا صاحب کا پیر بیٹہ ہوتا تو مت پوچھئے کس طرح ہمارا استقبال ہوتا۔ لیٹ تو ہم ہوتے ہی تھے۔ جب کلاس میں داخل ہونے کے لیے اجازت چاہتے تو معلوم ہے کہ پاشا صاحب کس پیار سے ہمیں خوش آمدید کہتے؟ فرماتے، حضور آپ تو دوسرے پیر بیٹے کے لیے بہت سویرے پہنچ گئے ہیں۔ یوں ہماری ساری محنت اکارت چلی جاتی اور ہم اپنا سامنہ لے کر رہ جاتے۔ جب کبھی ڈرائیونگ کا پیر بیٹہ ہوتا اور ہم اس کا ساز و سامان لیے پیدل مارچ کرتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے گور بلا جنگ پر جا رہا ہو۔ ٹی سکویئر، سیٹ سکویئر، پینانے، ڈرائنگ بورڈ شیٹ وغیرہ سے پوری طرح لیس ہوتے۔ یہ تو بھلا ہو کالج والوں کا کہ ڈرائیونگ بورڈ جیسی ڈھال سے بچائے رکھا۔ نہیں تو ہمارا حلیہ یقیناً مغلیہ خاندان کے سپہ سالاروں کا سا ہوتا۔

یہ اور بات ہے کہ کبھی گھنٹوں بعد بس ملتی اور کبھی ملتی ہی نہ۔ آخر کار ہم پیدل ہی چل پڑتے۔ بعض اوقات راستے میں ایک کی بجائے دو یا تین بسیں ہمارا دل جلاتی ہمارے قریب سے گزر جاتیں۔ ایسی جگہ پر لاکھ اشارے کرو بھلا ڈرائیور حضرات قانون کی خلاف ورزی تو ڈرا ہی کرنے والے ہیں۔ بھی قانون تو قانون ہوتا ہے اور ہوتا ہی ایسے مواقع کے لیے ہے۔ بس جی کیا پوچھتے ہیں کبھی بس آگے اور ہم پیچھے اور کبھی ہم آگے اور بس پیچھے ہوتی تھی۔ بس سٹاپ کی وہ گھڑیاں کس قیامت کی ہوتی تھیں آپ اس کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ بھائیو! تمہیں کیا معلوم کہ ہم بس سٹاپ پر بس کو پانے کے لیے کیا کیا جتن نہ کرتے تھے۔ بھی دعا میں مانگتے، کبھی پہل قدمی کرتے، کبھی بیروں فقیروں کی منتیں ماننے، کبھی شعر و شاعری کرتے، کبھی خواب خرگوش کے مزے لوٹتے لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بس کے آثار دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔ جب کبھی بس دور سے آتی دکھائی دیتی تو سارا ہجوم چونکا ہو جاتا۔ وہ جو نبی قریب آتی سب حملہ کر دیتے۔ اتنے میں معلوم ہوتا کہ یہ تو اسلامیہ کالج کی ہے۔ سب کھیانہ سامنے لٹکائے واپس وہیں پہنچ جاتے جہاں سے چلے تھے۔ بس کا یہ ٹانگ ہمارے ساتھ تو روزمرہ کا معمول تھا۔ جب شہر یا صدر کی کوئی بس ہمارے سامنے سے گزرتی تو آپ کو کیا معلوم ہمارے دل پر کیا گزرتی۔ بس انگاروں پر لوٹ جاتے۔ میں تو یوں کہوں کہ اگر قیس کو بھی کہا جاتا کہ تمہاری لیلیٰ 6 یا 7 نمبر ہاسٹل میں ہے اور تم روزانہ اس سے مل بھی سکتے ہو تو یقیناً وہ کہتا..... رٹو! وہی بھلا۔ اگر شاعر کو اپنی مصروفیات کے بعد روزانہ 6 یا 7 نمبر ہاسٹل جانا پڑتا تو یقیناً کرو اس کی یہ غزل کچھ اس

جب کبھی بھوک تنگ کرتی تو ہاسٹل کی دوری کا احساس شدت سے بڑھ جاتا۔ پڑھائی خاک ہوتی۔ ہم پریکٹیکل میں کھڑے ہو کر بھی ہاسٹل پہنچنے کے بارے میں سوچ رہے ہوتے۔ کبھی میس میں کھانا ختم ہونے کا منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا کبھی ٹھنڈا کھانا میز پر پڑا دکھائی دیتا۔ کبھی بس سٹاپ پر بس کے انتظار میں تین گھنٹے گزارنے کا کھن مرحلہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا کبھی گولڈن سٹاپ پر کھڑے ہجوم کی مظلوم صورتیں یاد آ جاتیں۔ جیسے ہی پیریڈ ختم ہوتا سیدھے بس سٹاپ پر جا پہنچتے۔ وہاں پہلے ہی سے بھوکے ہم جماعتیوں کا جم غیر انتظار کی گھڑیاں کاٹ رہا ہوتا تھا۔ ایک دن ہمیں روم میٹ نے مشورہ دیا کہ یہاں کیا گھنٹوں انتظار کریں گے اتنی دیر میں تو ہم پیدل کی ہاسٹل پہنچ جائیں گے۔ جوش میں آ کر مان تو لیا لیکن یہ بھی مہنگا پڑا۔ کافی دنوں تک تو پیدل آتے جاتے رہے لیکن بعد میں ہمارے پاؤں بھی ہمارے ارادوں کا ساتھ نبھانے سے انکاری ہو گئے۔ ہم نے لاکھ سمجھایا لیکن وہ نہ مانے۔ ایک دن جب ہم بہت زیادہ تھک گئے تو میرے روم میٹ نے کہا ٹھہرو یا رکھی کار والے سے لفٹ لیتے ہیں۔ اس ہمارے نے تین چار بار کوشش کی لیکن گاڑیاں ہمارا منہ چڑا کر آگے گزر جاتیں اور ہم دیکھتے ہی رہ جاتے۔ خیر وہ پھر بھی شکستہ خاطر نہ ہوا۔ ہم نے کہا حضور! لفٹ مانگنے میں ذرا احتیاط برسیے گا کہیں لفٹ کی جگہ کوئی لفٹی ہی تمہارے تھکے بدن کی مزاج پرسی کے لیے نہ آجائے۔ اس نے کہا بے فکر رہو۔ لفٹیاں آج کل بہت مہنگی ہیں۔ اب کچھ کہنے کا چارہ ہی نہ تھا۔

جب بیروں نے صاف صاف جواب دے دیا تو ہمیں پھر بس سٹاپ کی سوچی۔ جیسے ہی پیریڈ ختم ہوتے ہم فوراً انجینئرنگ بس سٹاپ پر پہنچ جاتے۔

معاملہ ہے۔ میں کیا کروں کچھ تو حل بتاؤ، مفت کے دوست بنے پھرتے ہو۔ ہم نے کہا ایک تجویز تو ذہن میں ہے اگر بُرا نہ متاؤ تو پیش کر دوں۔ پڑمردگی سے بولے بتا دو۔ ہم نے کہا کالج ٹائم کے بعد سائیکل مرمت کرنے کا کام شروع کر دو۔ وہ مجھے کھا جانے والی لگا ہوں سے گھورنے لگا۔ ہم نے کہا پہلے ذرا آنکھوں کو قابو میں رکھیں۔ اس نے فوراً قہقہہ کی۔ ہم نے پھر کہنا شروع کیا کہ فی الحال ایک کھوکھا ہاسل کے سامنے لگا دو۔ اوپر بورڈ لگا دو ”انجینئر ماسٹر“ پیٹنٹی رقم جو خرچ آئے گی تعمیر مسجد کے بہانے چندہ کی صورت میں جمع کر لیں گے یا پھر کسی پرانی گھڑی کی لاٹری نکالنے کے بہانے جمع کر لیں گے۔ دیکھنا ایک بار دکان چل نکلی پھر خرچ کی کوئی بات ہی نہیں۔ بس منافع ہی منافع ہے۔ پانچویں انگلیاں گھی میں ہوں گی۔ ہاسل کے تمام لڑکے، بیرے آس پاس کے دیہاتی آپ ہی سے سائیکل مرمت کروائیں گے۔ وہ ذرا ہنچکائے۔ ہم نے کہا اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اگر ہمارے انجینئر بھائیوں نے احتجاج کی خاطر پکڑے بیچے، جوتے پالش کئے اور گنڈھیری بیچنے جیسے احتجاجی ذرائع اختیار کئے تو اس کام کے کرنے میں کیا برائی ہے۔ پہلے لوگ کہتے کہ تم انجینئر بن کر پاشی بنو گے تو اب بھی کہیں گے کہ انجینئر بن کر سائیکل مرمت کرنے کا کام کرو گے۔ میری ماں تو بہت اچھا رہے گا۔ تھوڑے دن میں وارے نیارے ہو جائیں گے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ آمدن کی آمدن، احتجاج کا احتجاج یعنی آم کے آم ٹھیلیوں کے دام۔

امتحانوں کا موسم عروج پر تھا اور گرمی آسمانوں سے باتیں کر رہی تھی۔ ہماری ملاقات ”کالا پانی“ والے دوست سے ہوئی۔ انہوں نے شکوہ کے انداز سے شکم کیا کہ ہم ان کا حال نہیں پوچھتے۔ ہم نے کہا

پانی میں ذرا زیادہ دودھ ملاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس ہاسل میں پانی ہر وقت میسر ہوتا ہے۔ مزید برآں یہاں پڑھائی کے لیے بڑا آئیڈیل ماحول ہے۔ سکون و ٹیکوٹی میسر ہے وغیرہ وغیرہ۔ رہا مسئلہ آنے جانے کی تکلیف کا تو اس کے لیے میں گھر سے سائیکل لے آؤں گا اس طرح یہ مشکل بھی حل ہو جائے گی۔ ہم نے دست بستہ عرض کی حضور! گستاخی معاف آپ یہ بتائیں جتنے بھی پوزیشن ہولڈرز ہیں کیا وہ سب 7 یا 6 نمبر ہاسل کے رہائشی ہیں اور جو لڑکے قفل ہوتے ہیں کیا وہ نزدیک کے ہاسلز کے کیکن ہوتے ہیں؟ بہر کیف آپ کو یہ ماحول اور منصوبے مبارک ہوں۔ ہماری سزا تو مکمل ہو چکی ہے اور قفس میں خوشی سے بھلا کون رہتا ہے لہذا اللہ حافظ۔ رہی آپ کی بات تو لگتا ہے آپ کا جی قفس میں لگ ہی گیا ہے۔ بقول شاعر

لگتے لگتے جی میرا قفس میں بھی لگ جائے گا
ایک دن ہمارا پہلا پیریڈ فارغ تھا۔ ہم لان میں کھڑے لڑکوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہے تھے کہ ناگہاں ہمیں سابقہ روم ریٹ سائیکل کی معیت میں بیچے بیچے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ہم ان سے ملے، حال احوال پوچھا۔ پتیارے بہت دل گرفتہ تھے۔ کہنے لگے راستے میں سائیکل پچھر ہو گئی تھی اس لیے دیر سے پہنچا۔ پہلا پیریڈ بھی مِس ہو گیا ہے۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے میں تو اس سائیکل کے ہاتھوں عاجز آ گیا ہوں۔ کبھی راستے میں پچھر ہو جاتی ہے کبھی رات کو لڑکے اس کی ہوا خارج کر جاتے ہیں۔ اس پر ہی بس نہیں کرتے بلکہ ساتھ والے وغیرہ بھی لے جاتے ہیں۔ اسی ادھیڑ بن میں ہوں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ پہلے ہاسل پہنچنے کے لیے ایسکی جان کا غم ہوتا تھا اب سائیکل کو بھی ساتھ گھسیٹنا پڑتا ہے۔ یک نہ شد دوشد والا

ساگ (شام) چپیں یعنی آلو۔

ہم نے ان سے کہا حضور آپ ہمیں مٹیو کی تفصیل نہ ہی سنائیں تو بہتر ہے۔ وہ فغا ہو گئے اور غصے سے لال پیلے ہوتے ہوئے کہنے لگے کہ کیوں سچ برداشت نہیں کر سکے۔ کڑوا ہوتا ہے اس لیے گوارا نہیں۔ اب میں ساگ کو گھاس نہ کہوں جو ہمارے ننگ جڑوں سمیت اُبال کر پلیٹ میں سجا کر لے آتے ہیں اور وہ بھنا گوشت جو کہ اپنے لفظی معنی کا بالکل الٹ ہوتا ہے۔ پوری پلیٹ تو شوربے سے بھری ہوتی ہے جبکہ شوربہ پانی، مرچ اور نمک پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں گوشت کے باریک باریک ٹکڑے صرف حساس خوردبین سے ہی نظر آ سکتے ہیں۔ آپ لوگ چاہتے ہیں کہ میں دال ماش کو چکن کہوں اور ساگ کو مرغ مسلم بتاؤں۔ ان کے گبڑے تیر دیکھ کر ہم نے وہاں سے رخصت ہونے میں ہی عافیت جانی اور ان سے معذرت کرتے ہوئے آگے چل پڑے ورنہ دال بدمعاش کا غصہ شاید ہم پر ہی نکلتا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس دور کے کالج یونین کے صدر کی کوششوں سے فرسٹ ایئر والوں کو قریب کے ہاسلز میں جگہ مل گئی۔ ہم نے بھی جب اپنے کوچ کرنے کا ارادہ اپنے روم میٹ پر متکشف کیا اور پوچھا حضور آپ کا کیا ارادہ ہے تو وہ فرمانے لگے میرا ارادہ تو یہیں رہنے کا ہے۔ اب اس ہاسل سے پچھڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کے در و دیوار سے اُس ہو گیا ہے۔ ہم بڑے حیران کہ پہلے یہ حضرت ایسے تو نہ تھے۔ ہم نے ارادہ بدلنے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے اس ہاسل کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیے۔ فرمانے لگے دیکھو نا یہاں کے بیرے کتنے اچھے اور دیانتدار ہیں۔ دوسرے ہاسلز کے بیروں کی نسبت

طرح ہوتی۔ میں نے مانگی تھی یہ مسجدوں میں دعا کہ الٹی مجھے میری بس سے ملا جو میرا فرض تھا میں نے پورا کیا اب جو بس ہی نہ آئے تو میں کیا کروں ایک دن جو ہم تھے ہمارے ہاسل پہنچے تو ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ بھوک خوب لگی تھی۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ آج مٹیو میں کیا ہے۔ مزید یہ کہ آج مٹیو تبدیل ہونا تھا تو کیا کوئی مثبت تبدیلی آئی۔ سناؤ کیا رہا۔ فرمانے لگے اگر سننے کا حوصلہ ہے تو سنائے دیتا ہوں۔ ہم نے کہا یہ کیا مذاق ہے۔ وہ حضرت یوں گویا ہوئے۔

منگل (دوپہر) دال ماش (شام) اُبلے ہوئے چاول المعروف پشیل ڈش۔

دال بدمعاش..... جیسے ہمارے ذہن پر کسی نے حملہ کر دیا ہو۔ ہم سوچوں میں غوطہ زن ہو گئے۔ دال چنا، دال مسورہ، دال ماش وغیرہ۔ ہم نے ایک ہی سانس میں گن ڈالیں لیکن ہمیں اپنے جنرل نانچ میں دال بدمعاش کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ ہم ششدر و حیران، سراسیماء پریشان دال کی اس نئی قسم کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ ہمارے دوست نے ہماری بدلتی ہوئی رنگت اور حالت کو بھانپ لیا اور کہنے لگا حضور متشکر ہونے کی ضرورت نہیں یہ دال بدمعاش کوئی نئی ایجاد نہیں پہلے بھی ہم کھاتے رہے ہیں۔ میں نے یہ دال ماش کے نام سے ملتی ہے۔ گستاخی معاف یقیناً یہ بہت اچھی دال ہے لیکن پکانے والے اسے دال ماش سے دال بدمعاش بنا دیتے ہیں۔ کھانے کے بعد تقریباً دس بار دال ماش چاکا ہوں۔ کیا بتاؤں اس نے پیٹ میں کیا تہلکہ مچایا ہوا ہے۔ آگے سنیں اب دھ (دوپہر) گھاس یعنی

آپ بالکل پریشان نہ ہوں اور اس میں خفا ہونے والی کیا بات ہے۔ ابھی پوچھے لیتے ہیں۔ ویسے دیکھنے میں تو حال برا نہیں ہے۔ بڑے خوش و خرم اور تروتازہ دکھائی دے رہے ہو۔ فرمانے لگے۔ تمہیں اٹھکیلیاں سوچیں ہم ہزار بیٹھے ہیں ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہے ورنہ ان حضرت سے شاعری کی توقع عیب۔ ہم نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا یہ بتاؤ آج کا پیپر کیسا ہوا۔ جواباً فرمانے لگے کہ بیماری کی حالت میں پرچہ دینے آیا تھا تو خاک اچھا ہوتا۔ ہم بڑے حیران بلکہ پریشان ہوئے کہ خدا خیر کرے یہ امتحان کے دوران بیماری کہاں سے کود پڑی۔ کہنے لگے اس دن جب میں یکسوئی کا پیپر دے کر ہاسٹل 6 کے لیے بس سٹاپ پر پہنچا تو دو گھنٹے انتظار کرنے پر بھی جب بس نہ لی تو سوچا کب تک یہاں کھڑا رہوں گا۔ بھوک کے مارے برا حال تھا۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔ ادھر کڑا کے کی گرمی پڑ رہی تھی۔ جوں توں کر کے ہاسٹل تو پہنچ گیا۔ کمرے میں سامان رکھا اور پھر باہر نکلا۔ ابھی کمرے سے باہر قدم ہی رکھا تھا کہ یکدم چکر آیا اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو ہسپتال میں تھا۔ متواتر تین چار دن چار پانی کی قید میں رہا اور یوں اس پیپر کے لیے بالکل تیاری ہی نہ کر سکا۔ بس جو آتا تھا لکھ آیا ہوں۔ آگے کی کیا خبر؟ رب ہی جانے جو ہو گا۔ ہم نے کہا فکر نہ کریں انشاء اللہ اچھا ہی ہو گا یعنی۔

وہی ہو گا جو منظور خدا ہو گا وہ کافی دل گرفتہ تھے کہنے لگے اگر میں فیل ہو گیا تو اس کی تمام تر ذمہ داری کالج انتظامیہ پر ہو گی جنہوں نے ہمیں بغیر کسی جرم کے ”کالا پانی“ جیسے ہاسٹل میں رکھا۔ ہم نے کہا واہ بھی واہ۔ ایک تو

چوری اور سے سینہ زوری۔ بھی تمہیں آخر اتنی جلدی ہاسٹل پہنچنے کی کیا ضرورت تھی۔ بھوک ستا رہی تھی تو یہیں کہیں کینٹین پر کھانا تناول فرما لیتے لیکن جاتے بس پر ہی۔ اگر بس آنے کے آثار نہ تھے تو بس سٹاپ پر ہی قبولہ فرما لیتے۔ جب جا گئے تو تازہ دم ہوتے۔ گری بھی ختم ہو چکی ہوتی۔ پیدل بھی چلتے تو حرج نہ تھا۔ اب سوچیں نا اس میں بچاری کالج انتظامیہ کا بھلا کیا قصور ہے۔ غلطی آپ کی اپنی ہی ہے۔ فرمانے لگے ٹھیک ہے یہاں پر ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں لیکن حشر کے دن میں ان کا گریبان ضرور پکڑو گا۔ ہم نے دیکھا جوان بہت برا بیٹھتے ہیں۔ چننا چاہیے۔ اسی لیے اجازت چاہی اور کھسک گئے۔

اب کہاں تک اپنی پتا سناؤں۔ کالا پانی میں گزرا ہوا ایک ایک لمحہ نہایت تکلیف دہ تھا۔ کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں مزید برآں کھٹکا اس بات کا بھی لگا کہ تعلیم کے تمام خواہشمند طلباء عمومی طور پر اور انجینئرنگ کے طلباء خصوصی طور پر جو صاحبان اختیار کے دعووں کے برعکس پہلے ہی گونا گوں رکاوٹوں جیسے انٹری ٹیسٹ، میرٹ کا قتل، نا انصافی کا خوف، سلف فنانس وغیرہ وغیرہ سے دلبرداشتہ ہیں خدا نخواستہ ان کے کانوں میں ”کالا پانی“ جیسے مسائل کی بھنک بھی پڑ گئی تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے گی اور نتائج کافی خطرناک شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب تو علم کے پیاسے کالجوں میں داخلے کو ترس گئے ہیں کہ یہ نقشے الٹ نہ جائیں اور نتیجتاً کالجوں میں ہو کا عالم ہو اور ان کی عمارتیں جالعلوں کا انتظار کرتے کرتے آثار قدیمہ کا حصہ نہ بن جائیں۔ دعا ہے کبھی ایسا نہ ہو (آمین)۔



عمر تیر

فہمیدہ کوثر

میرے سینے میں جو بائیں طرف دل دھڑکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے دھڑکنا چھوڑ دیا ہے۔ میں بہت حیران ہوا۔ اگلے ہی لمحے دل اچھل کر قلع کے راستے باہر آ چکا تھا۔ میں نے اس کو لمبی میں جکڑ لیا۔ میں کافی دیر تک حیران و پریشان یہ ماجرا دیکھتا رہا۔ پھر میں نے مٹی کو کھول دیا۔

ایک شخص کی کہاں ایب روز اچانک اس کا دل غائب ہو گیا

کھڑا ہوں۔

وہ شام میری زندگی کی شاموں سے مختلف تھی۔ میں نے اسی قسم کے خیال کا اظہار جب احسن سے کیا تھا تو اس نے عجیب سی صورت بنا کر میری طرف دیکھا اور بولا:

”کیا خاص بات ہے اس شام میں بالکل

”جناب والا! میں بات کہاں سے شروع کروں؟ جب میں پہلی مرتبہ صبح راستے سے بھٹک گیا یا پھر جب میری قوت ارادی متزلزل ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ میں جہاں سے بھی بات شروع کروں گا بات وہیں پر جا پہنچے گی جس کی وجہ سے میں آج آپ کے سامنے کھڑے میں

سات برس کی تھی کسی سرکاری سکول میں پڑھتی تھی جبکہ تسکین کے شوہر کی کسی حادثے میں موت ہو گئی تھی۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ میں جلد ہی اس کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔ اسی دوران میں اپنے دل کو جو ایک مینڈک بن چکا تھا، بالکل فراموش کر چکا تھا۔

میری زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئیں لیکن تسکین میں نہ جانے کیا ایسی بات تھی کہ میں اس کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔

”میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے برملا ابا جان کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

”میاں تم پہلے اپنے اطوار تو بدلو، ہر محلے میں تمہاری کوئی نہ کوئی کہانی ہے، ایسی صورت میں کون سی لڑکی تم سے شادی کرے گی؟“

ابا جان نے برملا اپنی رائے کا اظہار کیا۔

میں نے تسکین کے بارے میں بتایا تو اماں جان کی خوشی سے باچیں کل گئیں جبکہ ابا جان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”کیا کہا..... ایک بچی کی ماں سے شادی کرو گے۔“ وہ حیرانگی سے بولے۔

میں انہیں کیسے بتاتا کہ میرے سینے میں اب دل نہیں تھا اور مینڈک کے ساتھ تو میرا بالکل بھی گزارا نہ تھا۔

”جناب والا! میں خود نہیں جانتا تھا کہ میں تسکین سے شادی کیوں کر رہا تھا۔ شاید میرے اندر جو خلا رہ گیا تھا، اسے بھرنا چاہتا تھا۔“

اور یوں تسکین میری دہن بن کر میرے گھر آ گئی۔

ایک شام میں پھر اسی جو بڑے کنارے کھڑا تھا۔ جو بڑے باہر ایک چھوٹا سا مینڈک مُردہ

ایک ایسی چیز بن گیا جس سے مجھے خود ہی کراہت محسوس ہونے لگی تھی۔

اگلی شام میں پھر اسی جو بڑے قریب کھڑا تھا جہاں پر میرا دل کم ہوا تھا۔ ایک بار تو خیال آیا کہ اس دل کو جو بڑے غرقاب چھوڑ کر واپس پلٹ جاؤں اور دوبارہ اس کی خبر نہ لوں۔ اس نے جو حرکت کی تھی مجھے اس پر شدید غصہ تھا۔

معاملہ ہی کچھ ایسا تھا کہ اگر میں کسی سے بات کرتا تو پانی پانی ہو جاتا لیکن پھر خیال آیا کہ دل کا معاملہ ہے اور دل کے بغیر تو جسم بالکل ادھورا تھا اور میں ادھورا جسم کہاں لیے لیے بھرتا۔

ابھی میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ کسی معصوم بچی کی آواز سنائی دی ”انکل سنئے۔“

میں نے پیچھے مڑ کر بچی کی طرف دیکھا۔

”انکل وہ آپ کو ماما بلا رہی ہیں۔“ اس نے سامنے ایک سفید سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے سامنے کی طرف نظر دوڑائی۔

ایک نازک اندام سی لڑکی جو کسی طور پر بھی بچی کی ماں معلوم نہ ہوتی تھی، گیٹ کے اس پار کھڑی تھی۔ میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا اس طرف بڑھ گیا۔

”سنئے جی یہ کچھ اشیاء بازار سے لا دیں۔“

اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

اور میں نے فہرست اس کے ہاتھ سے پکڑ لی۔

میرا یہ روز کا معمول بن گیا۔ میں دل تلاش کرنے کے بہانے وہاں جانے لگا اور وہ مجھے فہرست تھما دیتی۔

اس کا نام تسکین تھا۔ اس کی بیٹی جو کہ

ایک بار میں اپنے بستر پر سو رہا تھا۔ نہ معلوم کہاں سے ایک چھوٹا سا مینڈک میرے کبل پر آن بیٹھا۔ اگلے دن میں نے کبل کو دھلویا تاہم کئی دن تک مجھے کراہت محسوس ہوتی رہی۔

اب بھلا میں کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ جس چیز کو میں نے تمام زندگی ناپسند کیا وہ میرا دل بن جائے۔ میں نے گھبراہٹ میں ہاتھ کھینچ لیا۔ مینڈک چھلانگ لگا کر کسی جو بڑے میں چھپ گیا۔ اب میرے لیے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا کہ میں اس جو بڑے سے اپنے دل کو کیسے باہر نکالوں جو کہ مینڈک بن گیا تھا۔ میں مسلسل سوچ میں غرق تھا۔ میں گھر واپس آ گیا۔ گھر آ کر میں نے محسوس کیا کہ دل کے بغیر زندگی گزارنا تو بڑا مشکل کام ہے۔

”آج جلدی گھر لوٹ آئے ہو“ ابا جان کی طنزیہ آواز سنائی دی۔

”جی۔“ میں نے مختصر جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے ابا جان کی تلخ اور کڑوی باتیں سنائی دیتی رہیں لیکن اس وقت مجھے کسی اور بات کی ہوش کہاں تھی۔ میرا اصل مسئلہ تو دل کی گمشدگی کا تھا۔

ساری رات پریشانی میں گزر گئی۔ اگلی صبح میں دیر سے دفتر پہنچا جس پر باس سے خاصی ڈانٹ بھی پڑی۔

لیکن جب اس بات کا ذکر میں نے احسن سے کیا تو وہ بولا:

”تمہارا دل تو آلائشوں سے پاک اور صاف ستھرا دل تھا۔ پھر یہ مینڈک کیسے بن گیا؟“

یہی تو حیرانی کی بات تھی کہ کہاں میں اس قدر نفاست پسند، لباس کی پاکیزگی کا خیال رکھنے والا شخص تھا اور کہاں میرا دل جو کہ مرکز جسم تھا

کچھل شاموں کی طرح ہی تو ہے بلکہ آج تو گرمی اور جس بھی زیادہ ہے۔“

میں خاموش ہو گیا تھا۔ احسن بھی عجیب احمق شخص تھا۔ آج کی شام کو کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ میں جلد ہی سمجھ گیا کہ وہ جس زاویہ سے شام کو دیکھ رہا تھا وہاں اسے شام سے زیادہ دفتری مسائل کی فکر تھی۔

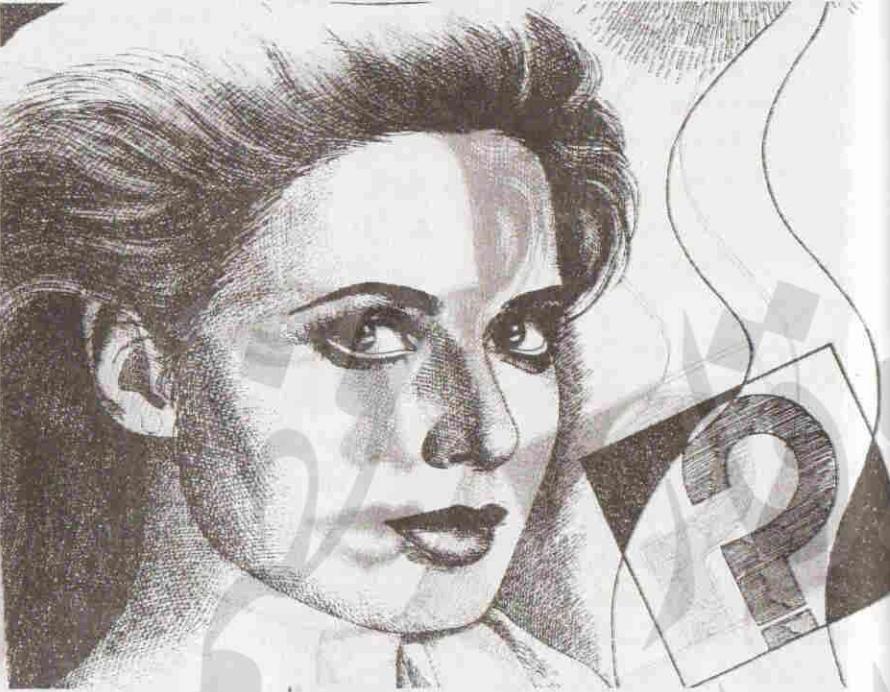
میں تو اس بات کا قائل تھا کہ ہر شخص اپنے مقام اور زاویہ سے چیزوں اور انسانوں کا مشاہدہ کرتا تھا۔ احسن کارل مارکس کے معاشی نظریہ کی بھی تعظیم کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک بھوکا پیٹ کبھی کبھی کسی اور کام کی طرف توجہ نہیں دے سکتا جبکہ میرا خیال تھا کہ پیٹ کی بھوک کے علاوہ ایک اور بھوک بھی ہے اور وہ ہوس کی بھوک ہے۔ جس کی لپیٹ میں آ کر سب کچھ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

جناب والا! میں بات شام کی کر رہا تھا۔ وہ شام واقعی مختلف تھی۔ اس کی وجہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔

میرے سینے میں جو بائیں طرف دل دھڑکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے دھڑکنا چھوڑ دیا ہے۔ میں بہت حیران ہوا۔ اگلے ہی لمحے دل اچھل کر حلق کے راستے باہر آ چکا تھا۔ میں نے اس کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ میں کافی دیر تک حیران و پریشان یہ ماجرا دیکھتا رہا۔ پھر میں نے مٹھی کو کھول دیا۔

میں اس بات پر ششدر رہ گیا کہ میرے ہاتھ میں دل کی بجائے ایک مینڈک تھا۔ یہ تو عجیب و غریب بات تھی۔ نہ کبھی پہلے کسی نے سنی اور نہ ہی میں نے کسی سے سنی تھی۔

میں تو ساری زندگی مینڈکوں سے خوفزدہ رہا۔



سوچ کے تجربے

میں بازو شروانی

میں پاکستانی قوم ہے، دودھ دل رکھتی ہے، سوز جگر جانتی ہے۔ تینوں کے سر پر ہاتھ رکھتی ہے۔ بیوہ کے آنسو پوچھتی ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ یہ کاروان مختلف سمتوں میں چل رہے ہیں۔ کیونکہ ”میر کاروان“ ”میر نہیں۔ کوئی رہنما نہیں جو ان ساری توانائیوں کو یکجا کر کے نشان منزل دے سکے۔

غور کریں ان کے لیے فکر رُخ کی باتیں، جن پر عمل سے معاشرہ بدل سکتا ہے۔

میر کاروان

محترم بزرگ عبدالستار ایڈی ایک روز فرما رہے تھے کہ ”پاکستانوں جیسی کوئی قوم دنیا کے تختے پر نہیں ہے۔ میں سڑک پر کھڑا ہوں جاؤں تو لاٹھوں رو پے اللہ کے نام پر رنج ہو جاتے ہیں۔“ محترم نے بالکل سچ کہا تھا کہ اس قوم کے دل ایک دوسرے کے لیے

حالت میں پڑا تھا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا تو یہ وہی مینڈک تھا جو ایک روز میری خواب گاہ میں میرے بستر پر تھا اور پھر ایک شام میرا دل ہی یہ چھوٹا سا مینڈک بن کر جو ہڑ میں جا چھا تھا۔

میں تو اس بارے میں کسی سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں ہی مورد الزام ٹھہرایا جاؤں گا۔

لیکن آج یہ مینڈک مر گیا۔ میں نے جلدی سے سینے پر ہاتھ رکھا۔ مجھے اپنے سینے میں دل کی دھڑکن سنائی دی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ مینڈک پھر سے دل بن کر میرے جسم میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی جگہ میرے سینے میں ایک ایسا دل دھڑک رہا تھا جو تسکین کی محبت سے لبریز تھا۔

جناب والا! ضمیر کی عدالت نے مجھے بہت پریشان کیا۔ یہاں تک کہ میں نے قبول جرم کر کے اس عدالت میں پیش ہونے کا فیصلہ کیا۔ اب آپ تمام واقعات و شواہد کو مد نظر رکھ کر فیصلہ کریں اور حقیقت کے آئینے میں دیکھیں تو میں تو سدا سے بے قصور تھا۔ اب جبکہ میں نے تسکین کی محبت کو پالیا ہے اور میرا دل بھی اپنی اصلی حالت میں واپس آ گیا ہے مجھے امید ہے کہ آپ میری حق گوئی کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسا فیصلہ صادر فرمائیں گے جو عدالت کی میز پر بجائے جانے والے ہتھوڑے کی طرح میرے دماغ پر ہتھوڑے نہیں برسائے گا بلکہ مجھے ایسی راہ سمجھائے گا کہ میں تسکین کے ساتھ محبت کے سفر میں کہیں دور نکل جاؤں اور وہاں اس کے ساتھ عرقید کا فیصلہ بھی مجھے منظور ہے۔

پہلا شو

یار! بڑی کوشش کی ایک بھکارن کو بھی پچاس روپے دینے کیلئے، ایک دولڑکیوں کو ”باجی“ بھی بنایا۔

مگر افسوس.....

یہ زندگی کا پہلا موقع ہے جو ناکامی ہوئی۔ ورنہ ہر جمعہ کو ہر فلم کا پہلا شو دیکھا ہے۔

کال

اماں جی صرف پچاس پیسے کا گز ہے۔ بہت مہنگا ہے بیٹا، ہمارے زمانے میں بھی کپڑا دو پیسے کا گز ہوا کرتا تھا۔

کتنا کپڑا دوں اماں جی؟

دونوں بہوؤں کے لیے ایک ایک جوڑے کا کپڑا دے دو۔

یہ لیجئے۔

کتنے پیسے ہو گئے؟

صرف دس روپے۔

کال ہے کال، اندھیر ہے اندھیر۔ دس روپے میں ہم سارے خاندان کے جوڑے بنا کر مینے بھر کا راشن بھی ڈال لیتے تھے۔

اماں جی زیادہ ہیں تو پانچ روپے دے دیجئے۔ دکھاندے نہ کہا اور اماں جی پانچ روپے دے کر چلی گئیں۔

جونہی اماں جی دکان سے اتریں تو مالک دکان ملازم سے کہہ رہا تھا:

گدھے تجھے کہا تھا زیادہ پیسے نہ بتانا۔

غلطی ہو گئی جی، ملازم نے کہا اور ایک سو ایک سالہ بوڑھی عورت کے بیٹے کے نام سے 16 سو روپے کا بل بنانے لگا۔

☆☆☆

گاتنی صدیاں؟ تم یا عافیہ؟

”آخر کار تمہارے دل سخت ہو گئے، پتھروں کی طرح سخت بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے جیسے پھوٹ جیتے ہیں، کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے اور کوئی خدا کے خوف سے بے لرز گرد گرد بھی پڑتا ہے۔ اللہ تمہاری کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے“ (سورۃ بقرہ)

6- کابل پر حملہ ہو یا بمبئی میں۔ امریکہ کے الزامات کی توپوں کے دہانے ہماری طرف کھل جاتے ہیں۔ ”ربانی صاحب“ کے قتل پر لمحہ ضائع کئے بغیر پاکستانی ”کونسل شوریٰ“ کا نام لیا گیا اور بر ملا لیا گیا اور آج بلیری کہہ رہی ہے کہ ہمیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ جب چاہا پکڑی اُچھال دی اور پھر بھی پاکستانیوں کے جذبات پر حیرت ہے!

7- آدمی رات کو امریکہ ہر اخلاقی اصول تو ذکر ہماری سرحدوں کی بے ادبی کرے۔ ”اسامہ بن لادن“ کا کھیل کھیلا جائے۔ مارے کہیں اور برآمد کرے پاکستان میں۔ ویسے ہی جیسے صدام حسین کو بہت پہلے پکڑ لیا گیا مگر بش نے ایکشن سے پہلے اسکے پکڑے جانے کا کھیل دنیا کے سامنے رکھا۔ ہمیں انہی سرحدوں کی بے حرمتی کے جواب میں بھلا تم سے کیسے محبت ہو سکتی ہے؟

8- ہمہ وقت پاکستان سے do more کے مطالبے ہیں لیکن مولوی فضل اللہ جو افغانستان کے دل میں بیٹھا پاکستان پر جنگ مسلط کرنے کے پروانے جاری کرتا ہے امریکہ نے کبھی کرزئی سے نہیں کہا کہ اسے پکڑ کر پاکستان کے حوالے کر دو کہ یہ شخص پاکستان میں امن کے لیے خطرہ ہے۔

9- امریکہ سے ہزاروں میل دور اٹھ کر آنا اور اپنے ساتھ خواخوہ ہمیں جنگ میں اُلجھا دینا،

اپنے عہدے کے حساب سے مل رہی ہے اس کا کوئی جواز بن سکے۔

امریکہ کو حیرت کیوں ہے؟

بلیری کلنٹن اور امریکہ کی حیرت نے پوری پاکستانی قوم کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ جب انہوں نے کہا ”انہیں پاکستان میں امریکہ کے خلاف جذبات کی شدت پر حیرت ہوئی“.....

1- اس سادگی پر کون نہ مر جائے اسے خدا 1- ہماری زمین سے اڑ کر ہمارے لوگوں پر امریکہ ڈرون برسا دے، جلائے، جھلسائے، زندہ درگور کر دے اور اس کے جواب میں کیا ہم حضور والا میں پھولوں کے ہار پیش کریں؟

2- ان کا ریڈنڈ ڈپوس یعنی پیشہ ور قاتل ہماری پرہجوم شاہراہ پر دن دھاڑے قتل و غارتگری کرے اور یہ ہمارے قانون کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے دودھ سے کھٹی کی طرح نکال کر لے جائیں اور اس معاملے میں ان کا فارن آفس جھوٹ پر جھوٹ بولے۔ یہاں تک کہ ”ادبانا“ بھی اسے ڈپلومیٹ کہہ کر اسٹی مانگے تو خود ہی بتائیں کہ انہیں کس اعزاز سے نوازا جائے؟

3- امریکہ کبھی ہمارے قومی کردار پر کچھ اچھالے، کبھی ہماری آرمی کو دہشت گرد قرار دے اور اس ذلت کے جواب میں ہم امریکہ کو محبت کے ثبوت جواب بھیجیں؟

4- ”گوانتانامو بے“ کی سیاہ کاریوں کے داغ ابھی ہمارے سینوں پر ہیں۔ امریکی بربریت کا کار ایک 14 برس کا پاکستانی بچہ بھی گوانتانامو بے میں ہے۔

5- پاکستانی بیٹی ”عافیہ“ نے دنیا میں اس لیے اہم لیا تھا کہ تمہارے قید خانوں میں اپنے ناکردہ گناہوں پر ”صدیوں پر محیط“ سزا کاٹے؟ کون جے

کام کر رہے ہیں وہ سب لیکس بچا رہے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں کہ ہم سب کو ایک لاکھی سے ہانک دیں۔ خدا کی زمین نیک اور دردمند انسانوں سے خالی نہیں ہے لیکن پاکستان میں لیکس کی ادائیگی کا شعور بیدار کرنا بہت ضروری ہے۔

”بے مشقت روزی“

ہماری ”پارلیمنٹ اور سینیٹ“ اپنے اراکین کے لیے بے مشقت اور بغیر حساب روزی کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ایکشن سے پہلے ڈیپیرین کر عوام کے ووٹ لوٹنے، سیٹ حاصل کی اور پھر ”تم کون تو میں کون“ انہیں سرکاری طرف سے سہولتیں ایسے ملتی ہیں کہ ”ثریا کو رشک آئے“، جواباً جو ملے کردار یہ ادا کرتے ہیں وہ محض سن کر شرم آئے۔ ان کا کام زیادہ تر پارلیمنٹ کا بائیکاٹ، واک آؤٹ، جوتہ بیزاری، گالم گلوچ، جھوٹی تسلیاں یا پھر ٹی وی چینلوں پر دست و گریباں ہونا ہے۔ ایک سینیٹر صاحب عمران خان کے جلے کی کامیابی کو سراہنے یا ہوش کے ناخن لینے کی بجائے اس جلے کی کرسیاں گنتے اور جم تاپنے میں مصروف بلکہ انتہائی مشغول دکھائی دیئے۔ بقول ان کے اتنے رقبے کے میدان میں اتنی کرسیاں آہی نہیں سکتی تھیں۔ شاید اس ایک موضوع پر انہوں نے تمام دن ہوم ورک کیا اور پھر پروگرام میں آئے۔ اپنی ذہانت کا اس سے اچھا گمراہ سے زیادہ بے کار استعمال شاید انہیں نہیں ملا۔ اگر یہ عوامی نمائندے جھٹلو پر آ کر یہ بتائیں کہ آج کا دن انہوں نے کس قومی خدمت میں گزارا؟ کہیں کوئی علمی لیکچر دیا؟ اپنے حلقے کے لوگوں کے لیے کوئی کام کیا؟ کسی سکول، کسی ہسپتال، کسی گلی، کسی محلے کے مسائل سننے؟ ضرورت مندوں کے بچوں کی تعلیم و روزگار کے لیے کچھ کیا تو شاید ان کے ووٹ لینے کا حق ادا ہو اور وہ جو ”بے مشقت روزی“ انہیں

ہسپتال اور غرباء اور متاثرین کے لیے گھر بنانے کا عمل جاری ہے، راشن کی تقسیم ہے، کچے ہوئے کھانے کی تقسیم ہے اور بہت سے ہاتھ خاموشی سے سفید پوشوں کی مدد میں مصروف ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو اپنے کاروبار سے چھٹی لے کر مکانات کی تعمیر میں مصروف ہیں۔

ہاں یہی پاکستانی قوم ہے، درد دل رکھتی ہے، سوز جگر جانتی ہے۔ یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھتی ہے۔ یتیم کے آنسو پوچھتی ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ یہ کاروان مختلف سمتوں میں چل رہے ہیں۔ ایک دھارے میں آ کر نہیں مل رہے کیونکہ ”میر کاروان“ میسر نہیں۔ کوئی رہنما نہیں جو ان ساری توانائیوں کو یکجا کر کے نشان منزل دے سکے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ نیکی اور تعمیر وطن کے اس لازوال جذبے کے ساتھ اگر لیکس ادا کرنے کا شعور بھی آ جائے تو جو چیز خیرات کے زمرے میں آ رہی ہے لیکس کی صورت میں بھی ادا ہو تو ان غریب اور بے آسرا لوگوں کو پروقار ملازمتیں، کاروبار اور سہولتیں حاصل ہوں۔ وہ زندگی جینے کے لیے دوسروں کے ہاتھوں اور امداد کی طرف نہ دیکھیں بلکہ محنت کی کمائیں اور کھائیں۔ بیروزگاروں، بوڑھوں، یتیموں اور محتاجوں کے لیے سوشل سیکورٹی سسٹم رائج ہو سکے۔ لیکس ادا کرنے سے معیشت کی مضبوطی لازمی ہے۔ نئے کاروبار اور انڈسٹری لگانے میں مدد مل سکتی ہے۔ بجرانوں پر قابو پایا جاسکتا ہے اور محروم طبقہ برابری کے حقوق حاصل کر کے باوقار زندگی گزار سکتا ہے۔ سر جھکا کر خیرات وصول کرنے کی بجائے سر اٹھا کر جی سکتا ہے۔ لیکس بچا کر خیرات کے عمل میں یوں بھی کراہت ہے کیونکہ یہ ریاست کا حق ہے اور عوام کے لیے کام کرنا ریاست کا فرض ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تمام لوگ جو بھلائی کے

ہمارے گلے کوچوں میں اپنے اپنے بھیلے کر ہمارا امن۔ انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے کچاند
 خراب کرنا، پاکستان کی ہزاروں قربانیوں کے جواب کے جواب ہمیں تو یہ سوچی گئی سازش ہی لگتی ہے۔ حقانی
 میں do more کے بے درد مطالبے، سیلاب اور سیلاب اس زمین کے باشندے ہیں۔ ان سے خون خرابے
 بارش کی تباہ کاریوں سے جب سندھی بے آسرا اور بے آسرا کا مطلب ہے پاکستان کی سالمیت کو ہمیشہ کے لیے
 بے یار و مددگار سڑکوں پر آبیٹھے تو ان دنوں ایڈمرل ملر خطرے میں ڈالنا۔ اپنے لوگوں کو اپنے خلاف کر
 غصے سے ہم پر چلا رہا تھا اور پوری پاکستانی قوم حیرت میں رہ رہی رہے ہیں۔ ہم
 میں جلتا تھی۔ یہی حیرت غم و غصے میں بدل گئی۔ ہم
 اسے بھی بکاؤ نہیں کہ اپنی فوج کی شہادتوں کو بھول
 جائیں یا ہم وطنوں کی جان کے زیاں کو فراموش کر
 دیں۔ کاش کہ بلیری کلنٹن کے دورہ پاکستان کے
 موقع پر اسے کوئی آری کے ہسپتالوں اور صیہالی سینٹر
 میں لے جاتا۔ کیسے کیسے جوان آفیسر، سپاہی، ہاتھوں
 پیروں سے محروم، حیران آنکھوں سے مستقبل کی بے
 یقینی دیکھ رہے ہیں۔ امریکہ کے do more کے
 مطالبے پر ان کے اور ان کے خاندانوں کے دلوں پر
 جو گزرتی ہوگی وہ ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ جنگ
 ہماری نہیں تھی اس لیے امریکہ کو بھجوا ہمارے
 احکامات سے آگاہ ہونا چاہیے۔

10- امریکہ کے ہر مطالبے پر کام آنے والا

پاکستان اور اس کی قوم اندھیروں میں ڈوبی ہوئی

ہے۔ توانائی کے شدید بحران میں جلتا ہے اور صنعتی

اسکی توانائی کے معاہدے اٹھایا سے ہو رہے ہیں۔

ہمارے کاروبار بند ہو گئے ہیں، فصلیں تباہ ہو چکی

ہیں، معیشت ہچکچاہٹ لے رہی ہے مگر ہم ہی سے

قربانی کے مطالبے ڈھٹائی سے کئے جاتے ہیں۔

ہماری قربانیوں کے جواب میں تو آڑیں اٹھایا پر ہیں

یا کر زنی پر۔ ایسے میں ہمیں تو امریکہ کی حیرت پر

حیرت ہے۔ آخر اسے ہمارے ہاں کے انسانی امریکہ

جذبات کی وجوہات کیوں معلوم نہیں؟

11- اور اب یہ مطالبہ کہ حقانوں کے خلاف

پھر پور کارروائی کی جائے۔

چاہتے ہیں۔

عاقبت اسی میں ہے کہ یہاں سے پلٹ جاؤ

اپنی حفاظت اپنے ملک میں بیٹھ کر کرو۔

12- ہمیں اس بات پر بھی تاراجی ہے کہ

کی سپلائی لائن سے ہمارا انفراسٹرکچر، سڑکیں، پل

پہلے ہی مشکل سے تعمیر ہوتے ہیں تباہ ہو چکے ہیں

نیٹو سے اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لیا جاتا۔

قربانی کا بھی کسی کو کوئی احساس نہیں اور عنایات

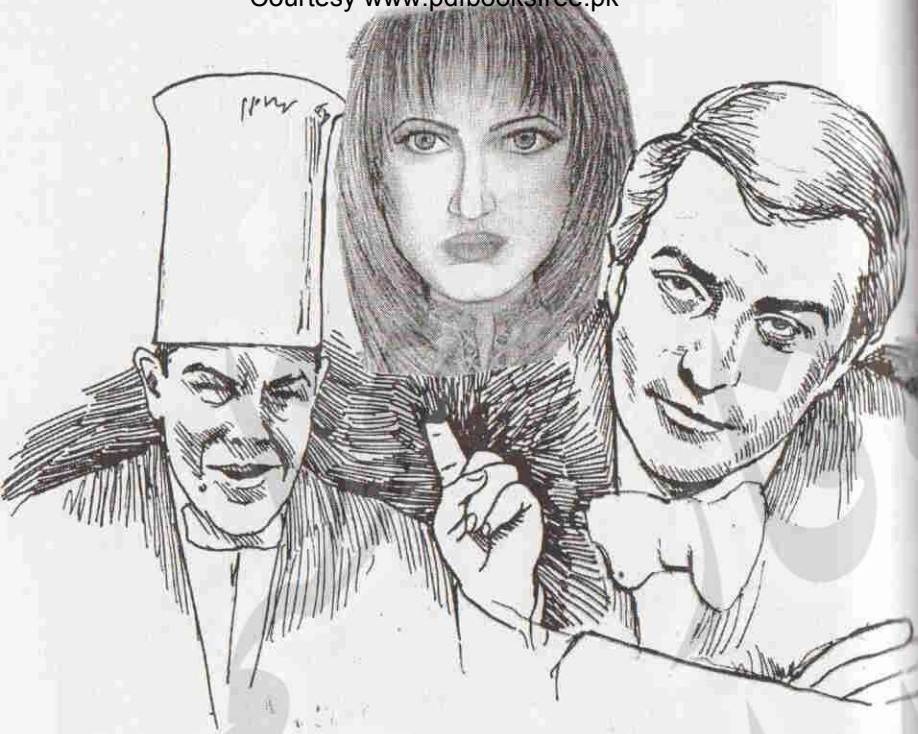
سلسلے اٹھایا اور کر زنی کے لیے جاری ہیں۔

امریکہ سے شکایات کی یہ تفصیل ختم ہو

نہیں آئی۔ یہ تو امریکہ کا کام ہے کہ وہ

جذبات کی وجوہات کا اندازہ کرے مگر اس کے لیے معاملہ

درکار ہے جو وہاں نہیں ہے۔



فوزیہ ظہیر

نسخہ قتل

لاج اور ہوس میں گرفتار ایک بھتیجی کا قصہ جس نے اپنے مفاد کی خاطر شفیق چچا کی محبت اور خوبی رشتے کو بھی فراموش کر دیا اور اپنے شوہر کے ساتھ مل کر ایک سفاک منصوبہ بنایا!

چوری کرنے آئے ہیں..... اس سلسلہ میں اس نے سنجیدگی سے سوچا اور اندازہ لگایا کہ اگر انہوں نے ضروری سمجھا تو اسے قتل بھی کر سکتے ہیں۔

اینڈریو ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا درمیانے قد کا آدمی تھا۔ تقریباً گنجا ہونے کو تھا۔ وہ کبھی کبھی مذاق میں اپنے گنجے پن کی وجہ اپنی ٹوپی کو گردانتا تھا۔ شیف کی ٹوپی جو کافی سالوں تک اس کے جسم کا حصہ بنی رہی۔

اینڈریو کو اپنی بھتیجی اور اس کے شوہر پر یہ شبہ تھا کہ شاید وہ اس کے پاس کچھ قرضہ لینے آئے ہیں تاکہ وہ بیس میں ایک گورے ریٹائرمنٹ کھول سکیں۔ جب وہ گاؤں کے جنرل سٹور سے ضرورت کی چیزیں لے کر واپس آیا اور اس نے دیکھا کہ کھانوں کی تراکیب کے کارڈز کا ڈبہ چکن کے شیلیف سے غائب ہے تب اس کو پتہ چلا کہ وہ دونوں تو اس کا بیش قیمت خزانہ

”ایک اور صلیبی جنگ“

مغرب نے ایک اور صلیبی جنگ جیت لی۔ وہ کہتے ہیں قذافی آمر تھا، عوام کے لیے دہشت تھا، اس کے بیٹے بہت سے جرائم میں ملوث تھے اس لیے اس کی حکومت کا ختم ہونا اور اس کا ماریا جانا بہت ضروری تھا۔ ”یہ مغربی طاقتوں کا فیصلہ تھا مگر وہ لیبیا کا لیڈر اور صدر بھی تھا۔“ مغرب justice کی بات کرتے نہیں تھکتا۔ امریکہ جمہوریت کا راگ الاپتے نہیں تھکتا۔ یہ کیسا justice تھا؟ یہ کیسی جمہوریت تھی کہ ”قطر“ کی آرمی میں سے ”لیبیا کے لیے باغی“ تیار کر کے بھیجے گئے۔ نیٹو سے بمباری کروائی گئی۔ نہ کوئی مقدمہ چلا نہ ٹرائل ہوا نہ فیصلہ آیا۔ کیا حق پہنچتا تھا ایک بھاگتے انسان پر حملے کا؟ جمہوریت اور انصاف کی بات کرنے والے، قذافی کے ظلم کی داستانیں بیان کرنے والے، اگر حکم جاری کرتے کہ اسے کوئی گزند پہنچائے بغیر گرفتار کیا جائے تو شاید ان باپ بیٹے کی موت اس سفاکی سے نہ ہوتی۔ کیا مغرب کے انصاف اور جمہوریت کے نظریوں کا تقاضا یہی ہے کہ وہ جب چاہیں جیسے چاہیں اسلامی ملکوں کو کبھی اکٹھے ہو کر تو کبھی امریکہ اکیلے نشانہ بنائے اور ان کے عوام پر بم برساتا رہے اور کہے کہ ہم صرف دہشت گردوں کو مار رہے ہیں۔ جتنے بڑے خوشحال شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے اور پھر تعمیر کے نام پر ٹھیکے حاصل کر لے۔ ”یاد رہے“ سیرنی“ ایک آباد اور خوشحال شہر تھا جہاں عوام رہتے تھے۔“

کہاں جاتی ہے نیٹو جب اسرائیل بربریت کی کہانیاں رقم کرتا ہے؟ کہاں بھی نیٹو جب 2 اسرائیلی قیدیوں کے بدلے میں اس نے لبنان پر جنگ مسلط کی اور پورے ملک کو کھنڈر کر دیا؟

اب یہ کہنا کہ قذافی کی موت کی تحقیقات ہوں گی۔ اس کا کیا فائدہ؟ اور یہ بھی نہیں کہ اس کے باقی بیٹوں کے لیے حفاظت کے انتظامات کئے گئے ہوں۔ ایسا کوئی بیان نہیں آیا۔ بات ہی نیت کی ہے۔ اوباما کو الیکشن جیتنا ہے اور اسلامی ملکوں کے سربراہان کو اپنی کرسیاں اور اقتدار بچانا ہے۔ افسوس صد افسوس۔ ان میں سے کچھ لیڈران کی قذافی کے بیٹوں کے ساتھ سرسالی رشتہ داریاں ہیں۔ کسی کی طرف سے ایک حرف احتجاج بھی زبان پر نہیں آیا۔ مقام افسوس ہے کہ امریکہ کے حکم پر قطر کی آرمی، باغیوں کا روپ دھار کر لڑی اور اتنے خوشحال شہروں کو برباد کر دیا۔ اس کا مطلب لیبیا کے مٹھی بھر باغی اس جنگ کو لڑنے کا کوئی جواز نہیں رکھتے تھے۔ انڈیا میں اس طرح کی 29 سے زیادہ باغی تحریکیں ہیں مگر کوڑا برستا ہے مسلم ممالک پر۔ اقتدار کی تبدیلی بغیر خون خرابے اور تباہی کے بھی ممکن تھی۔ آج قذافی کے بیٹے جان بچاتے چھپتے پھر رہے ہیں۔ ان میں سے ”سیف الاسلام“ مغرب کا ”ڈارلنگ“ رہ چکا ہے۔ سرکوزی کی تمام انتخابی مہم انہیں لوگوں نے سپانسر کی تھی اور سب سے پہلے مخالفت کے لیے سرکوزی اور برٹش پرائم منسٹر لیبیا پہنچے۔

”قرآن پاک کی حکمت، رب کائنات کا حکم کہ یہودی و نصاریٰ کبھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے“ کتنی درست ہے، کتنا وزن رکھتی ہے، آج ہم روز مشاہدہ کرتے ہیں۔“

اوباما کی یہ نئی ڈاکٹرین ہے کہ شامل ہوئے بغیر، اپنی فوج بھیجے بغیر مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ذریعے کمزور کیا جائے اور کرانے کی نیٹو سے کام لے جائیں۔ آج کل نیٹو کے نشانے کتنے صحیح ہیں۔ سریوں کے ظلم پر یونینیا کی مدد کو آتے تو کوئی نشانہ صحیح نہ لگتا۔ زمین میں گڑھے ڈال کر چل دیتے۔ ہوئے تم دوست جسکے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو

رینائر ہونے سے پہلے وہ دنیا کا مشہور شیف تھا۔

رینائر ہونے کے بعد وہ پیرس سے اٹلی کے گاؤں ٹوسی گاؤں میں آکر آباد ہو گیا۔ ایک بڑی زمین خرید کر اس پر پھول اور بنریاں کاشت کرنے لگا۔

جب اس نے بچن کے اس شیف کو خالی دیکھا جہاں کھانے کی ترکیبوں کا ڈبہ رکھا تھا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس کو اپنی بیٹی پر رحم بھی آیا اور شرم بھی آئی کیونکہ دنیا میں اس کی صرف ایک بیٹی ہی تھی جس سے اس کا خونی رشتہ تھا۔ وہ اس کے مرحوم بھائی کی بیٹی تھی اور اب اس نے گناؤ سے شادی کر لی تھی۔

وہ لوگ ایک کرائے کی گاڑی میں ایریزونا سے روانہ ہو کر وین، میلان، فلورنس اور روم سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ ماریا نے بتایا تھا کہ انکل میں آپ کو تلاش کرتی ہوئی یہاں پہنچی ہوں۔ میں 13 سال سے آپ سے نہیں ملی تھی لیکن رشتہ داری کے اس بندھن کو پھر سے مضبوط کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے اپنے شوہر سے بھی اینڈریو کا تعارف کروادیا۔

اینڈریو نے خوشدلی سے ان کا استقبال کیا۔ اس کو اپنی بیٹی سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ رینائر منٹ کے بعد تہائی اسے کاٹنے لگتی تھی۔ اس نے سوچا ان کی وجہ سے گھر میں رونق ہو جائے گی۔ ماریا شہر رنگ بالوں اور نیلی آنکھوں والی خوبصورت دو شیزہ تھی لیکن اس کا شوہر گناؤ اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ دیکھ کی طرح بھاری بھر کم کرخت آواز والا بد شکل آدمی تھا جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جو کبھی جھپکتی نہیں تھیں گدلا پانی بہتا رہتا تھا۔ اس کے جسم سے پسینے کی گندی بو آتی رہتی تھی۔ بہر حال وہ اس کی بیٹی کا شوہر تھا اس لیے اسے بھی خوش آمدید کہنا پڑا۔ کافی دیر باتیں کرنے کے بعد اس نے اپنا واحد بیڈروم اس کے حوالے کر دیا اور خود رہائش گاہ کے پس صوفے پر

سوئے کا فیصلہ کیا۔

گناؤ نے کمرے میں ہر طرف نظر دوڑائی جو ایک روایتی کسان کے کمرے جیسا ہی تھا لیکن اس کی سب سے اہم چیز دھاتی تعریفی تختیاں تھیں جو فریم میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ نقشِ ثرافیاں اور تنھے تھے جن سے کمرے کی دیواریں بھی ہوئی تھیں۔ یہ چیزیں گناؤ کی توجہ کا مرکز بن گئیں اور وہ بے اختیار ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے پوچھ بیٹھا ”یہ سب کیا چیزیں ہیں؟“

اس سے پہلے کہ اینڈریو جواب دیتا ماریا نے قہقہہ مارا اور غریب انداز میں کہا ”گناؤ! ان کو پڑھو یہ ایوارڈز ہیں جو انکل کو دنیا کی تمام گورے سوسائٹیز کی طرف سے بہترین کھانا پکانے پر ملے ہیں۔“

گناؤ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اٹھا اور قریب جا کر تمام دستاویزات کو غور سے پڑھنے لگا۔

”کیا تم شیف تھے؟“ اس نے مزکر پوچھا۔

”ہاں میں نے کافی عرصہ شیف کا کام کیا لیکن کافی عرصہ پہلے رینائر ہو چکا ہوں۔ اب میں صرف ایک کسان ہوں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ پھول اور بنریاں اگاتا ہوں۔“

ماریا زور سے ہنس کر بولی ”دیکھا گناؤ۔ میرے پیارے انکل اینڈریو اس ملک کے سب سے بڑے شیف تھے۔ میں نے تمہیں پہلے اس لیے نہیں بتایا تھا کیونکہ میں تمہیں سر پرانز دینا چاہتی تھی۔“

گناؤ مسکرا کر بولا ”بے شک یہ بہت بڑا surprise ہے کہ ہمارے خاندان میں اتنا بڑا شیف ہے۔“

ماریا اپنے انکل سے مخاطب ہو کر بولی ”انکل آپ کو پتہ ہے دنیا کا سب سے بڑا الطیف کیا ہے؟“

یہ کہ گناؤ بھی ایک شیف ہے۔ ایک خاندان میں

شیف۔ اس نے اینڈریو کا ہاتھ پکڑا اور خوشی سے تپنے لگی۔ قہقہے لگانے لگی۔ اینڈریو کو چکر دینے لگی۔ اینڈریو ہنسا اور احتجاج کرتے ہوئے بولا ”ماریا بیٹا بس کرو۔ میں اب ان بچکانہ حرکتوں کے قابل نہیں رہا ہوں۔“

اس نے گٹاؤ کی طرف دیکھا، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی تاثر سے خالی تھیں۔ اس نے پوچھا:

”گٹاؤ تم کہاں کام کرتے ہو؟ کیا تمہارا ریسٹوران بیکس میں ہے؟ شاید وہ میرے علم میں ہو۔“

”آج کل میں بیروزگار ہوں۔“ گٹاؤ نے کہا۔
”اوہ! bad luck تمہاری آخری نوکری کہاں پر تھی؟“

”سیونج ریکس میں۔“
”اچھا ریسٹوران ہے۔ میری جوانی میں خاصا مشہور تھا۔ اس کا کھانا بہت اچھا ہوتا تھا۔ ہائینچن، صحت مند کھانا جو قابلِ فہم بھی ہو اور مزیدار بھی ہو اور اس کی پیشکش کا طریقہ بھی جاذبِ نظر ہو۔ یہ ان کے کھانوں کی خصوصیات تھیں اور شیف میں ان خصوصیات کی کمی کو وہ برداشت نہیں کرتے۔ ہمارے شعبے میں یہی تو مشکلات ہیں لیکن تم پریشان نہ ہو انشاء اللہ جلد ہی نوکری مل جائے گی۔ تم نے کہیں درخواست دی ہے؟“

گٹاؤ کی بجائے ماریا نے جواب دیا۔ ”جی انکل گٹاؤ نے تمام اچھے ریسٹورانوں میں درخواستیں دی ہیں۔ ہمارے اس ٹرپ کا مقصد ہی یہی ہے۔ اس کے انٹرویوز بھی ہو رہے ہیں لیکن ہم سوچ رہے ہیں کہ ہمیں کہیں سے تھوڑی سی امداد مل جائے تو ہم اپنا ریسٹوران کھول لیں۔“ اس نے اُمید بھری نظروں سے اینڈریو کو دیکھا۔ اینڈریو نے اس کی نظروں کا

مطلب سمجھتے ہوئے سوال کیا ”گٹاؤ تمہارے انٹرویوز کا جواب کیا ملا؟“

”بہ نسبتی سے کہیں کامیابی نہیں ملی۔“ اس نے زخمی آواز میں کہا پھر سختی خیز آواز میں ماریا کی طرف دیکھا پھر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اینڈریو کی طرف گھما کر دوبارہ بولا ”مجھے اس شعبے میں

speciality چاہیے جو میرے پاس نہیں ہے۔ ان کی بس یہی ڈیمانڈ ہے۔“

”گٹاؤ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہارت ہونا ضروری ہے۔ ایک اچھا شیف اپنے مزیدار کھانوں سے کسٹمرز کو ایک ٹوپ لیس ویٹرز کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔“

گٹاؤ بولا ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل۔ آپ سے بہتر کون جانتا ہے۔ آپ کی شہرت بھی تو آپ کی speciality کی وجہ سے تھی۔ کوپن ہیگن میں

جہاں میں نے ٹریننگ لی وہاں ملکہ الزبتھ دوئم کے نام کے مقابلہ میں آپ کی شہرت زیادہ تھی۔“

”شکریہ تمام کھانوں میں ایک سوپ کی وجہ سے میری بڑی شہرت رہی ہے۔“ اینڈریو نے خوش ہو کر کہا۔

”صرف ایک سوپ؟“ ماریا نے حیرت سے کہا۔
”ایسا کہنا میرے genius انکل کی توہین ہے۔ وہ دیوتاؤں کا دیومالائی سوپ ہے اور پوری دنیا میں صرف آپ ہی وہ سوپ بنا سکتے ہیں۔ میرے والد اکثر بڑے فخر سے آپ کی خدا داد تخلیقی صلاحیتوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جب میں پندرہ سال کی تھی تو وہ مجھے بیکس لے گئے۔ وہاں ”پیئر میری ریسٹورنٹ“ میں ڈنر کے ساتھ وہ فرحت بخش سوپ پلا یا تھا۔ انکل آپ کو یاد ہے؟“

”ہاں مجھے یاد ہے۔ اس وقت تم ایک پرکشش بیاری بن چکی تھیں۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔ اس وقت تم ایک پرکشش بیاری بن چکی تھیں۔“

بیاری بن چکی تھیں۔“

”گناؤ تمہیں پتہ ہے وہ سوپ پی کر میں اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔“

”مجھے یقین ہے ماریا حالانکہ میں نے وہ سوپ کبھی نہیں پیا لیکن ہر شیف جانتا ہے کہ وہ سوپ بہت اعلیٰ تھا۔“

”میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں ماریا جو میں نے کبھی کسی کو نہیں بتائی حتیٰ کہ تمہارے باپ کو بھی نہیں بتائی حالانکہ وہ میرا بھائی تھا، یہ سوپ میری اپنی تخلیق نہیں ہے۔ اس سوپ کا نسخہ مجھے باپ دادا سے وراثت میں ملا تھا لیکن میں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ میرا اپنا ایجاد کردہ ہے۔“ اینڈریو نے رازداری سے بتایا۔

وہ دونوں اس کو حیرت سے دیکھتے رہے پھر گناؤ اپنی آنکھوں میں ایک حریص چمک لئے بولا ”آپ کو کس نے یہ نسخہ وراثت میں دیا تھا؟“

”میرے باپ نے اور ان کو ان کے باپ نے۔ ہمارے خاندان میں سوپ بنانے کا یہ نسخہ بڑی رازداری کے ساتھ نسل در نسل چلتا آ رہا ہے۔ اس طرح اب تک اس نسخے کو تقریباً پانچ سو سال ہو گئے ہیں۔“ اینڈریو نے بہت محظوظ ہوتے ہوئے بتایا۔

”تو میرے بچو سمجھ میں آیا کہ یہ ایک اطالوی سوپ تھا جو ایک اہلی کے شیف کی دریافت تھا جو وہ اہلی کے ایک نواب کے لیے بنایا کرتا تھا۔“

”کیا ہمارے خاندان میں کوئی اور شخص آپ کی طرح مشہور ہوا؟“ ماریا نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”بہت کم لوگوں میں اتنا صبر ہوتا ہے کہ وہ سوپ کے نسخے ترکیب پر پوری طرح عمل کر سکیں اور خطیر رقم لگا سکیں کیونکہ سوپ تیار کرنے میں پانچ دن لگتے ہیں۔“

گناؤ نے متاثر ہو کر کہا ”پانچ دن۔ اب تو شک کی گنجائش نہیں رہی کہ آپ کیوں مشہور ہوئے۔“ اور پھر ماریا کی طرف متنی خیز نظروں سے دیکھا۔

”انکل آپ کی تنخواہ کتنی تھی؟“ گناؤ نے پوچھا۔

”تین سو ہزار فرانک۔“

گناؤ نے اپنا کچھ جیسا سرائیے ہلایا جیسے سر میں درد ہو رہا ہو۔ ”صرف ایک سوپ کی وجہ سے؟“

”نہیں صرف سوپ کی وجہ سے نہیں۔“ اس نے اعزازات کی طرف اشارہ کر کے کہا جو دیوار پر لٹکے ہوئے تھے۔ ”یہ اعزازات مجھے دوسرے کھانوں پر ملے ہیں۔“

”آپ ان کھانوں کی ترکیب کا کیا کریں گے آپ کا تو نہ کوئی بیٹا ہے نہ کوئی بیٹی صرف ایک بیٹی ہے کیا آپ اسے وراثت میں یہ نسخہ دیں گے؟“

اینڈریو نے نفی میں سر ہلایا اور بولا ”مجھے افسوس ہے ماریا میں تمہیں یہ نسخہ نہیں دے سکتا۔ میں اپنی وصیت لکھوا چکا ہوں جس میں یہ کھانا پکانے کی ترکیب کے نسخے حکومت کی امانت ہیں۔ میرے مرنے کے بعد یہ نسخہ جات ”انٹرنیشنل میگزین“ کے حوالے کر دیئے جائیں گے جن کو وہ ایک تاریخی ورثہ کی حیثیت سے اپنے میگزین میں شائع کریں گے

اس طرح ہر کھانا پکانے کا شوقین ان سے استفادہ حاصل کر سکے گا اور میں نے قسم کھائی ہے کہ میرے مرنے سے پہلے کوئی انہیں حاصل نہیں کر سکتا۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے اور دوبارہ گویا ہوا۔

”جب میں نے یہ وصیت تیار کروائی تھی تو میرے علم میں نہیں تھا کہ میری بیٹی کسی شیف سے شادی کرے گی۔“

”لیکن اب تو آپ کو پتہ ہے۔ کیا آپ اپنی وصیت میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے؟“ گناؤ نے غمگین لہجے میں کہا۔

”وصیت لکھی جا چکی ہے۔“ اینڈریو نے سادگی سے کہا۔

”اگر آپ اپنے سوپ ”ڈوپاؤ“ کی ترکیب اور اس کے مصالحہ جات مجھے بتا دیں تو میں بھی ایک مشہور شیف بن جاؤں گا اور فرانس کا ریٹورنٹ بھی مجھے بخوشی ملازمت دے دے گا۔“ گناؤ نے التجائی کی۔

”مجھے افسوس ہے کہ یہ ناممکن ہے۔“

یہ کہہ کر اینڈریو اٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا لیکن ساری رات ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ جب بھی اس کی آنکھ کھلتی اسے اپنے بیڈروم سے کھسک پھسکی آوازیں سنائی دیتیں۔ اینڈریو یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ شاید وہ دونوں اس کی کھانے کی ترکیب حاصل کرنے کا کوئی منصوبہ بنا رہے ہیں۔

صبح ناشتے میں اینڈریو نے اپنے مہمانوں کے لیے اپنا مشہور زمانہ آلیٹ بنایا۔ گناؤ نے تخمینہ آمیز انداز میں اپنے موٹے موٹے ہونٹوں کو سیٹی بجانے والے انداز میں سکیز اور بولا ”لا جواب۔“

اینڈریو بولا ”گناؤ بیٹا میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہیں نوکری حاصل کرنے کے لیے مہارت کی ضرورت ہے میں تمہیں درجنوں بہترین ترکیب بتا سکتا ہوں۔“ پھر وہ ناشتے کی میز سے اٹھا اور کچن میں سنک کے قریب ایک شیف سے ایک دھاتی ڈبہ اٹھا کر لایا جس میں کھانا پکانے کی ترکیب کے کارڈز تھے۔

اینڈریو نے اپنے بہترین کھانوں کی ترکیب اسے بتائیں لیکن وہ ہر نسخہ پر تنقید کرتا رہا۔ کسی کے لیے کہا ”یہ تو بہت عام ہے“ کسی کے لیے کہا ”یہ تو ہزاروں شیف بنا سکتے ہیں“ کسی کے لیے کہا ”یہ نسخہ پرانے زمانے کا ہے آج کے جدید دور میں مناسب نہیں۔“

آخر دل کی بات اس کی زبان پر آئی گئی۔ وہ سر

کھاتے ہوئے بولا ”انکل مجھے تو بس آپ کے آفاقی سوپ کا نسخہ چاہیے۔ میں اور ماریا زندگی بھر آپ کا احسان نہیں بھولیں گے۔“

اینڈریو نے اپنا ریسی کارڈز کا ڈبہ بند کیا اور تیسری دفعہ کہا ”مجھے افسوس ہے یہ ناممکن ہے اور اس ڈبے میں بھی سوپ کی ترکیب کا کوئی کارڈ نہیں ہے۔ وہ یا تو میری وصیت کے ساتھ ہے یا پھر یہاں۔“ اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی اپنی پیشانی پر رکھ کر کہا۔ پھر ترکیب کے کارڈز کا ڈبہ کچن کے شیف پر رکھا اور اپنے مہمانوں کی خاطر مدارت کے لیے اشیائے ضرورت کی خریداری کے لیے گاؤں کے بازار چلا گیا۔

جب وہ خریداری کے بعد واپس گھر آیا اور کچن میں قدم رکھا تا کہ ایک گلاس پانی پی لے کیونکہ شدید گرمی میں اسے تقریباً چار میل پیدل چلنا پڑا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس کی ترکیب کا ڈبہ غائب ہے۔ غصے اور صدمے سے اس کا رونے کو دل چاہنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ اس کی اپنی بیٹی اپنے سست، ناکارہ اور کارٹون جیسے بد شکل شوہر کے لیے چچا کے ساتھ دھوکہ کر رہی تھی۔ کوئی بات نہیں، اس نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی اور ان کو متلاش کرنے کے لیے دوبارہ چلچلاتی دھوپ میں باہر نکل گیا۔ وہ بہت خاموشی اور محتاط انداز میں کھیتوں کی طرف گیا اور آخر انہیں تلاش کر لیا۔ وہ اس کے پھولوں کے باغ میں ایک درخت کے سائے میں بیٹھتے تھے۔ وہ چپکے چپکے ان کے پیچھے گیا اور کئی ہوئی لکڑیوں کے ایک بہت بڑے ڈھیر کے پیچھے چھپ کر ان کی باتیں سننے لگا۔ گناؤ کھانا پکانے کی ترکیب کا ڈبہ اپنی گود میں رکھے اس کے کارڈز کو باری باری غور سے پڑھ رہا تھا۔ اینڈریو نے اس کو ماریا سے کہتے سنا، جو قریب ہی بیٹھی تھی ”ماریا مجھے یقین ہے کہ سوپ کی ترکیب کا

کارڈ بھی اسی ڈبے میں ہو گا۔۔۔۔۔ یہ تقریباً 100 کارڈز ہیں ان میں سے سوپ کا کارڈ تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔“

ماریا نے ہنس کر پوچھا ”ڈارلنگ! کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ بڑھا یہ کارڈز انٹرنیشنل میگزین کے سپرد کر دے گا؟“

”وہ بوڑھا بکرا جھوٹ بول رہا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شہرہ آفاق شیف جو تین سو ہزار فرانس سالانہ کماتا ہو وہ اتنا بیوقوف ہو سکتا ہے کہ بغیر کسی معاوضہ کے اپنی قیمتی ترکیب ایک گورے سوسائٹی کو دے دے۔ وہ ضرور ان کی بہت بڑی قیمت لگائے گا۔“

اب اینڈریو سے غصہ برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ ایریڈونا پولیس کو فون کرے اور رپورٹ لکھوائے کہ ڈاکوؤں نے اسے لوٹ لیا ہے۔ پھر اس کو احساس ہوا کہ پولیس اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اسے مصلحت سے کام لینا ہو گا۔ وہ خاموشی سے گھر کے اندر گیا اور مہمانوں کے لیے کھانا تیار کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ باہر شیڈ میں گیا جہاں وہ جانوروں کا چارہ رکھتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اٹھا شیخ کر کے شیف میں کچھ تلاش کرتا رہا۔ آخر مطلوبہ چیز اسے مل ہی گئی جو گتے کے ایک ڈبے کی شکل میں تھی۔ وہ اسے لے کر کچن میں آ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کے مہمان واپس آئے اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔ دونوں کے رویے میں کھردرا پن اور نفی تھی۔ کھانے کے بعد ڈرنک ختم کر کے گٹناؤ اپنی کرسی سے اٹھا اور جارحانہ انداز میں اینڈریو کی طرف بڑھا۔

اینڈریو اس کا انداز سمجھتے ہوئے گھبرا کر بولا ”غصہ۔ تمہیں میرے سوپ کی ریسپی چاہیے نا؟“

گٹناؤ نے کوئی جواب نہیں دیا اور اینڈریو کی طرف بڑھتا رہا۔

اینڈریو بولا ”تم لوگوں نے میرا ریسپی باکس چوری کیا بڑے شرم کی بات ہے۔“

”تم نے رات کو جن کھانوں کی ترکیب بتائی تھیں ہم وہی تلاش کر رہے تھے۔ تم نے خود ہی کہا تھا سوپ کی ترکیب اس میں نہیں ہے۔“

”لیکن تم نے میری بات پر یقین نہیں کیا اور میری اجازت کے بغیر اس باکس کی تلاشی لیتے رہے۔“

گٹناؤ اینڈریو کا کارڈ پکڑ کر غرا کر بولا ”میں اب اس آنکھ پھولی سے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے تمہارے سوپ کی ترکیب چاہیے بس۔“

اینڈریو نے قہقہہ لگایا اور بولا ”اور تم کسی طرح بھی اسے چوری کرنا چاہتے ہو لیکن میرے دماغ سے کیسے چوری کرو گے۔“

”میں اسے حاصل کرنے کے لیے تمہیں جان سے بھی مار سکتا ہوں۔“ گٹناؤ دھاڑا۔

اینڈریو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ خوفزدہ ہو کر نرمی سے بولا ”اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو سوپ کی ترکیب کیسے حاصل کرو گے؟“

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں تمہیں فوراً مار دوں گا۔ اب مجھے تم کو بتانا ہی پڑے گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ اپنا فولادی گھونٹہ اٹھا کر بولا ”یہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔“ اور ایک زوردار گھونٹہ اس کی کینٹنی پر دے مارا۔ اینڈریو کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور وہ ہوش کھو بیٹھا۔

شام کے قریب اسے ہوش آیا۔ وہ اپنے بیڈروم میں اپنے بیڈ پر لیٹا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو حرکت دینا چاہی لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا کیونکہ اس کے ہاتھ اور پاؤں پلنگ کے پالوں سے مضبوط ڈوری کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا سر گھمایا جو درود سے پھٹا جا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر اپنی جیبی پر

پڑی جو پلنگ کے پاس رکھی آرام کرسی پر بیٹھی اطمینان سے سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہمدردی کی ذرا سی بھی رقت نہیں تھی۔ اس کے ٹیلیفون کی تار بھی کاٹ کر دور پھینک دی گئی تھی۔ ”ماریا“ اس نے کراہ کر اسے پکارا۔

اس نے منہ سے دھواں نکالتے ہوئے لا پرواہی سے کہا ”ہائے انکل۔ مجھے افسوس ہے کہ گناؤ نے آپ کو مارا لیکن اسے مجبوراً ایسا کرنا پڑا کیونکہ آپ بہت ضدی ہیں۔“ پھر تھوڑا سا ہنچکا کر دوبارہ بولی ”میں آپ کو مشورہ دیتی ہوں کہ آپ گناؤ کے ساتھ پوری طرح تعاون کریں کیونکہ اسے ہر حال میں سوپ کی ترکیب چاہیے۔ اس کے لیے چاہے جو بھی طریقہ اختیار کرنا پڑا وہ کرے گا۔ چاہے ایسے چاہے ویسے۔ وہ آخر ہمارا خاندانی ورثہ ہے۔ اس پر آپ کی اجارہ داری نہیں ہے اور میں آپ کی سبچی ہونے کے ناطے اس کی حقدار ہوں۔“

”اب تم میری سبچی نہیں رہیں اب تم میرے لیے اجنبی ہو۔“ اینڈریو نے ڈکھ سے کہا۔ اس نے اپنا سگریٹ والا ہاتھ نچاتے ہوئے کہا ”تو مجھے بھی ایک قیمتی ترکیب حاصل کرنے کے لیے اپنے چچا کو ضائع کرنے کا کوئی افسوس نہیں ہو گا کیونکہ آپ خود غرض ہیں۔“

اینڈریو چپ رہا۔ اسنے میں گناؤ ٹھٹھٹا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پوچھا ”انکل ہوش میں آگئے؟ ٹھیک ہے اب میں تمہیں تین منٹ دوں گا۔ تم اپنی یادداشت کو تازہ کر لو اور ماریا کو سوپ کی ترکیب لکھانا شروع کر دو ورنہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا؟“ خوف نے پھر اینڈریو کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

”میں تمہیں پھر سے موت کے منہ میں جانے کا ایک چھوٹا سا مظاہرہ کر کے دکھاؤں گا لیکن اس دفعہ وہ

پہلے کے مقابلہ میں زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔“

”اگر میں تمہیں سوپ کی ترکیب بتا بھی دوں تو تمہیں کیسے پتہ لگے گا کہ یہ بالکل original ہے۔“

”میں خود وہ سوپ بناؤں گا۔ یہاں اس گھر میں۔ میں شیف ہوں پہچان سکتا ہوں۔ ویسے ماریا نے تو اس کا مزہ چکھا ہوا ہے وہ تصدیق کرے گی۔“

اینڈریو نے دیکھا کہ ماریا اپنی گود میں پیپر پیڈ رکھے بال پین ہاتھ میں لیے لکھنے کے لیے تیار بھی ہے۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے ایک قہقہہ مارنے کے لیے تیار کیا اور کہا ”مجھے یقین نہیں آتا گناؤ کہ تم سنجیدہ ہو؟“

”میں بہت سنجیدہ ہوں۔ لکھواؤ۔“ وہ دھاڑا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ ہر گز نہیں۔“ اینڈریو نے آخری دفعہ انہیں آزمانے کے لیے کہا۔

پھر کیا تھا۔ غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر ماریا نے اپنی جلتی ہوئی سگریٹ گناؤ کو تھما دی اور بولی ”انہیں ذرا تماشا تو دکھاؤ ڈارلنگ۔“

گناؤ نے جلتے ہوئے سگریٹ کو اینڈریو کی بائیں آنکھ کے نیچے رکھ کر لا پرواہی سے دبا دیا۔ اینڈریو نے ایک چیخ ماری اور تکلیف سے بلبلانے لگا اور بستر پر دیوانوں کی طرح اچھلنے لگا۔

”اب پتہ لگا؟“ گناؤ نے آخر کار وہ جلتا ہوا انگارہ اٹھایا اور بیوی کو دیتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ ماریا نے اسے اپنے جوتے کے نیچے دبا کر مٹل دیا۔

”میں لکھنے کے لیے تیار ہوں انکل۔ شروع ہو جائیے۔“ ماریا نے بے رحمی سے مکرار کیا۔

اینڈریو دانت بھینچ کر گال کا درد برداشت کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ اگر میں نے سوپ کا نسخہ نہیں بتایا تو یہ لوگ مجھے تڑپا تڑپا کر مار دیں گے۔ اس نے نفرت سے گناؤ کو دیکھا اور افسوس سے سبچی کی

طرف۔ پھر ہلکی آواز میں بولا ”تم چکن کی بخنی سے شروع کرو۔۔۔۔۔“

جب اس نے اپنے سیشل سوپ کا چھیدہ فارمولا لکھا دیا جس میں چھین اجڑا تھے تو وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کی سانس پھولنے لگی تھی اور تھابت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کہا ”میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی اب مجھے آزاد کر دو۔“

گناؤ نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا اور کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا ”ماریا جاؤ اپنے انکل کے فارم سے تین مرغیاں پکڑ لاؤ اور ان کو ذبح کر کے صاف کر کے میرے پاس لے آؤ۔ میں ابھی اسی وقت سے سوپ کی تیاری شروع کرتا ہوں۔“ پھر وہ اینڈریو کی طرف مڑا اور بے تابی سے پوچھا ”کیا تم نے مرغیوں کے علاوہ بطنیں بھی پالی ہوئی ہیں؟“

”میرے فارم کے نزدیک جو نہر بہتی ہے اس میں چنڈلیں ہیں۔“

”اوہ گناؤ! ماریا تین چھوٹی بطنیں بھی۔۔۔۔۔ اور جلدی۔“

اینڈریو نے پوچھا ”اور میرے متعلق کیا خیال ہے؟“

گناؤ نے طیش میں آ کر اپنے اُلٹے ہاتھ کا ایک گھونسلہ اس کے بائیں گال پر مارا جو پہلے ہی سگریٹ سے جلتے کی وجہ سے سو جا ہوا تھا اور دھاڑ کر بولا ”شٹ اپ! جب تک میں سوپ تیار کر کے تصدیق نہ کر لوں تم اپنا منہ بند رکھو۔“

”لیکن اس میں تو پانچ دن لگیں گے۔“

گناؤ نے کندھے اچکاے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچن سے فریج کھولنے، الماریاں کھولنے، مصالحہ جات کی الماری ٹٹولنے، کنستروں کے ڈھکن اٹھانے، پتلے کھڑکانے اور کیتلی اٹھانے کی آوازیں

آتی رہیں۔ کچن میں دھماچوڑی مچی ہوئی تھی۔ کافی دیر گزرنے کے بعد اینڈریو تھک کر گہری نیند سو گیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا لیکن رات میں اس کی بندشیں کھول دی گئی تھیں۔ اس نے اٹھڑائی لی اور بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا تھا۔ وہ کمرے سے ملحقہ باتھ روم احتیاجات ضروری کے لیے گیا۔ فارغ ہونے کے بعد وہ کمرے کے دروازے کے قریب آیا۔ پورے گھر میں چکن کی بخنی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے پکار کر کہا ”کیا میں باہر آ سکتا ہوں؟“

”گناؤ مارننگ انکل آپ اٹھ گئے؟“ ماریا نے چپک کر کہا۔

”کیا مجھے کچھ ناشتہ مل سکتا ہے؟“

”سواری انکل گناؤ آئے گا تو فیصلہ کرے گا۔“

”گناؤ کہاں ہے؟“

”وہ گاؤں میں مصالحہ جات خریدنے گیا ہے جو کچن میں نہیں تھے۔“

”مجھے بخنی کی خوشبو آ رہی ہے۔“

”بے شک مرغی کی بخنی تقریباً تیار ہو گئی ہے۔ ہم ساری رات کام کرتے رہے ہیں۔“

دوسرے دن صبح جب وہ جاگا تو کچن میں سے کام کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور مرغی اور بطنوں کی آمیزش سے ملے سوپ کی اشتہا انگیز خوشبو بھوک میں اضافہ کر رہی تھی لیکن اس نے ناشتہ نہیں مانگا۔ دوپہر میں وہ کچھ رول اور کافی لے کر آئے۔ گناؤ نے فاتحانہ انداز میں اطلاع دی کہ ہم اب سوپ میں کھیرا ملانے جا رہے ہیں۔

اس رات اینڈریو پوری رات سو نہیں سکا۔ وہ کسی انہونی کا انتظار کرتا رہا۔ ابھی رات کے تین بجے تھے کہ دروازے کے قفل میں چابی گھمانے کی آواز آئی

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی یوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

(تحریر: صائمہ عمران)

مچھلی:

سرکہ:

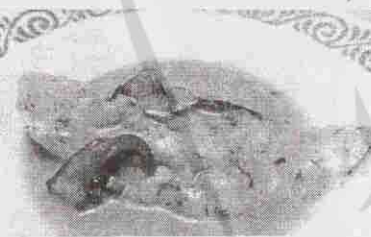
ہر رُت اور موسم کے اپنے میوے ہوتے ہیں۔ سردی کا موسم بھی اپنے ساتھ ایسے ہی مزیدار میوے لے کر آتا ہے۔ ان میں سے قدرت کا ایک انمول تحفہ ”مچھلی“ بھی ہے۔ سردی میں مچھلی سے لطف اندوز نہ ہوا جائے تو خود سے بھی ناانصافی ہے اور قدرت کی اس نعمت سے بھی۔ مچھلی کو فرانی بھی کیا جاتا ہے اور گریوی کے ساتھ بھی کھایا جاتا ہے۔ آج ہم آپ کے لیے مچھلی بنانے کے کچھ نئے انداز لے کر آئے ہیں جو بنانے میں تو آسان ہیں ہی لیکن ذائقے میں بھی بہت ہی منفرد اور لا جواب ہیں۔

کھٹی میٹھی مچھلی

وانٹ ساس کے ساتھ

اجزاء:

750 گرام
3 کھانے کے چمچ



3 کھانے کے چمچ
3 کھانے کے چمچ
5 کھانے کے چمچ
2 کھانے کے چمچ
تلنے کے لیے
حسب ذائقہ

سویا ساس:

کارن فلاور:

شکر:

چلی ساس:

تیل:

نمک:

مل رہی ہے لیکن میں اتنا عالم نہیں ہوں۔ کچھ کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اینڈریو نے گٹاؤ کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور سہارا دے کر سیز جھون کی طرف لے جانے لگا جو جگہ میں بے پورچ میں ختم ہوتی تھیں۔
”آپ اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔“ ماریانے بے اختیار پوچھا۔

”میں اسے ایریزونا ہسپتال لے جا رہا ہوں جہاں اس کا پیٹ پمپ کے ذریعہ واش کیا جائے گا لیکن ہمیں جلدی کرنی چاہیے ورنہ۔۔۔“
”پیٹ پمپ سے واش کیا جائے گا لیکن کیوں؟“

”کیونکہ میں نے اسے زہر دیا ہے۔“
وہ تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور گاڑی کی ہینڈ لائٹس جلاتے ہوئے بولی ”آپ ایسا کیسے کر سکتے تھے کیونکہ آپ تو کمرے میں مقفل تھے۔“

اینڈریو نے بتایا ”جب گٹاؤ نے سوپ کی ترکیب معلوم کرنے کے لیے مجھے دھمکیاں دینا شروع کی تھیں تو میں نے نمک کی بوتل میں جو ہے مار دواملا دی تھی۔“

ماریانے گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور پچھلی نشست پر بڑے ہوئے اپنے شوہر کو دیکھا اور اپنی سسکیوں کو دبا کر بولی ”بیچارہ گٹاؤ! اپنا کیرئیر بنانے کے چکر میں اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ اس کے سر پر speciality حاصل کرنے کا بھوت سوار تھا۔“

اینڈریو نے ایک انگلی اپنے گلے ہونے والی پر رکھی اور مسکرا کر بولا ”ماریا! اس نے ایک speciality تو حاصل کر لی ہے اور اس کو کچل سوپ کا نام ہے“ تازہ پھنڈل کا کچل سوپ ہلکے نمک میں چونے باز ہر کے ساتھ۔

اور ماریا جھٹ کر کمرے میں داخل ہوئی۔
”انکل! وہ چلائی۔ پلیز میری مدد کریں۔ گٹاؤ کی طبیعت بہت خراب ہے۔“
اینڈریو نے کمرے کے اسے دیکھا اور پوچھا ”گٹاؤ بیمار ہے؟ کیا ہوا اسے؟“ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

”اچانک ہی اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا اور وہ درد سے بے حال ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ مرنے والا ہے۔ آپ کو اپنی بیٹی سے محبت کا واسطہ۔ خدا را رحم کیجئے۔ ہماری مدد کیجئے۔ اس کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیے۔“

اینڈریو اٹھا۔ ڈرائیونگ گاؤں پہنچا اور پچھلی کے ساتھ کچن میں گیا۔ گٹاؤ کچن کے فرش پر پڑا پچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ پیٹ پکڑے ہوئے گرا رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ کچن کے بلب کی روشنی میں زرد نظر آ رہا تھا اور جسم پسینے سے بیگا ہوا تھا۔

اینڈریو نے کچن میں ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ ایک بڑا پتلا چوبیسے پر رکھا تھا جس میں بخنی ابل رہی تھی۔ اس نے گٹاؤ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بیٹی پر نظر ڈالی جو ہسپتالی انداز میں رو رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اس کے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا ہوا۔ اس نے پوچھا۔

”کیا گٹاؤ نے سوپ چکھا تھا؟“
”ہاں جب اس نے کچرے کا رس بخنی میں ڈالا تو یہ دیکھنے کے لیے کہ گوشت اور سبزی مل کر کیسا ذائقہ بنتا ہے اس نے تھوڑا سا سوپ چکھا تھا۔“

اس نے خاموشی سے سر ہلایا اور گٹاؤ پر جھک کر دیکھا۔ ماریانے اپنے شوہر کا سر اٹھائی گویا وہ کھانا اور ذرا وقار دیتے ہوئے اس کی ”پلیز“ کی آواز سن رہی ہو۔
”میری ماریا۔“

اسے قدرت کی طرف سے اپنے کچے کی ہزا

کی تراکیب فراہم کر رہے ہیں۔ یہ ڈشز بے حد لذیذ اور صحت بخش بھی ہیں اور انہیں چھوٹے بڑے سب بے حد پسند بھی کریں گے۔

☆☆☆

چکن ویجیٹیل

ود اسپانسی سوس

اجزاء:

چکن: 400 گرام
پھول گوشت: ایک عدد
گاجر (کٹی ہوئی): 2 سے 3 عدد
ادرک (باریک کٹی ہوئی): 2 چائے کا چمچ
لہسن (پسی ہوئی): ایک چائے کا چمچ
پیاز (کٹی ہوئی): 2 عدد
آئل: 2 کھانے کے چمچ

ہری پیاز (کٹی ہوئی): 2 عدد

سیزننگ کیلئے:

نمک: حسب ذائقہ
چینی: ایک چائے کا چمچ
سویا سوس: ایک چائے کا چمچ
اویٹر سوس: 1/2 چائے کا چمچ

اسپانسی سوس کیلئے:

نمک: حسب ذائقہ
چینی: 2 چائے کے چمچ
سویا سوس: ایک چائے کا چمچ
اویٹر سوس: ایک چائے کا چمچ
کٹی ہوئی ادرک: ایک چائے کا چمچ
کٹی ہوئی لہسن: ایک چائے کا چمچ
چھوٹی کٹی ہوئی پیاز: ایک چائے کا چمچ
لوبیا: ایک چائے کا چمچ
لال مرچ (کٹی ہوئی): 1/2 چائے کا چمچ
گرم پانی: 1/4 کپ

پین میں مکھن ڈال کر میدہ ڈال دیں اور اچھی طرح مکس کریں۔ اب چینی ڈال دیں اور Pineapple کے چھوٹے چھوٹے چکس ڈال کر 5 منٹ پکائیں اور ٹھنڈا کر کے پین ایک پر pour کر دیں۔ اوپر Cream سے گارنش کر کے تھوڑے سے اخروٹ ڈال دیں اور پودینے کے پتوں سے سجادیں۔

چائے یا کافی کے ساتھ پیش کریں۔

☆☆☆

Cold Coffee



اجزاء:

دودھ: 1 کپ
چینی: 1 چائے کا چمچ
Coffee: 1 چائے کا چمچ
چاکلیٹ آفس کریم: 1 کھانے کا چمچ
کریم: 1 کھانے کا چمچ
برف: 2 یا 3 کیوب

ترکیب: دودھ، چینی، Coffee اور برف کو گرائنڈر میں اتنا بلینڈ کریں کہ جھاگ سی بن جائے۔ گلاس میں ڈال کر چاکلیٹ آفس کریم اور کریم ڈال کر مکس کریں۔ Cold Coffee تیار ہے۔

☆☆☆

تحریر: مریم فرحان

آپ کو ہم گزشتہ مہینوں میں متحدہ عرب امارات کی مخصوص ڈشز کے علاوہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے حوالے سے خصوصی تراکیب پیش کر چکے ہیں۔ اس ماہ ہم آپ کے لیے ذرا ہٹ کر چٹ پٹی اور سپانسی ڈشز

وانٹ ساس کے لیے:

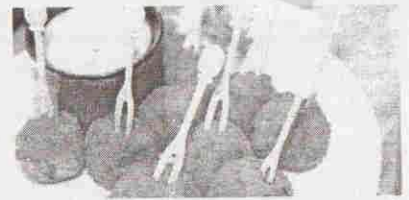
میدہ: 2 کھانے کے چمچ
دودھ: 1 کپ
مسٹرڈ پاؤڈر: 1/4 چائے کا چمچ
مکھن: 1 کھانے کا چمچ

نمک، کالی مرچ: حسب ذائقہ

ترکیب: مچھلی صاف کر کے ٹکڑے کر لیں۔ ایک پیالے میں تمام اجزاء ڈال کر آمیزہ بنالیں۔ اس کو اچھی طرح مچھلی پر لگا لیں۔ اب گرم تیل میں ہلکا بادامی ہونے تک تلیں۔ وائٹ ساس کے لیے ایک پین میں مکھن گرم کریں۔ اس میں میدہ بھونیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو چولہے سے اتار لیں اور دودھ ملا لیں۔ خیال رہے کہ گھٹلیاں نہ پڑیں۔ نمک کالی مرچ بھی ڈال دیں۔ گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ مچھلی کے اوپر وائٹ ساس ڈالیں اور گرم گرم نوش کریں۔

☆☆☆

فش بالز



اجزاء:

مچھلی (بغیر کانٹے کی): 750 گرام
انڈا: 1 عدد
ہری پیاز (باریک کٹی ہوئی): 1 پیالی
نمک، کالی مرچ: حسب پسند
سویا ساس: 2 کھانے کے چمچ
چائیز نمک: 1 کھانے کا چمچ
سرکہ: 1 کھانے کا چمچ
بریڈ کریمز: 1 پیالی
تیل: تیلنے کے لیے

ترکیب: مچھلی کو فوڈ پروسسیر میں ڈال کر قیرہ بنالیں۔ اب اس میں تمام اجزاء ڈال کر بالز بنالیں۔ انڈا چھینٹ لیں۔ فش بالز کو انڈے میں لپٹیں پھر بریڈ کریمز سے coat کریں اور گرم تیل میں گولڈن براؤن ہونے تک فرائی کر لیں۔

☆☆☆

(تحریر: فاطمہ قیوم)

Pineapple Pan Cake



اجزاء:

میدہ: 1 کپ
انڈہ: 1 عدد
نمک: 2-3 چمکی
چینی: 1 کھانے کا چمچ
بیکنگ پاؤڈر: 1 چائے کا چمچ
کونک آئل: 2 کھانے کے چمچ
دودھ: 1 پیالی
میٹھا سوڈا: 1/2 چائے کا چمچ
تازہ کریم: 3 کھانے کے چمچ
اخروٹ: تھوڑے سے
مکھن: 1 1/2 کھانے کا چمچ
میدہ: 1 کھانے کا چمچ
چینی: 1 کھانے کا چمچ

ترکیب: میدہ میں چینی، انڈہ، بیکنگ پاؤڈر، کونک آئل، دودھ، میٹھا سوڈا اچھی طرح مکس کر کے پین میں تھوڑا سا آئل ڈال کر چھوٹے چھوٹے پین ایک بنالیں۔



چہرہ اور آپ کی صحت

فاطمہ قیوم

اگر ہم ذرا سی توجہ ان علامات پر دیں جو ہمارا چہرہ وقتاً فوقتاً ظاہر کرتا رہتا ہے تو ہمیں اپنی صحت کے حوالے سے بے شمار حقائق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

چہرے پر نظر آنے والی علامات جنہیں نظر انداز کرنا خطرناک ہو سکتا ہے!

ان علامات کو نظر انداز کر دینا انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ ذیل کی سطور میں ہم ایسی ہی علامات، ان کی وجوہات، اثرات اور تدارک کے حوالے سے تفصیلات بیان کر رہے ہیں۔

آنکھ میں سرخی اترنا

آنکھوں میں غیر معمولی طور پر سرخ لکیروں یا

آئینہ دیکھتے ہوئے ہم میں سے زیادہ تر لوگ محض اپنے خدوخال ظاہری حالت اور خود کو زیادہ پرکشش بنانے پر ہی توجہ مرکوز رکھتے ہیں لیکن اگر ہم ذرا سی توجہ ان علامات پر دیں جو ہمارا چہرہ وقتاً فوقتاً ظاہر کرتا رہتا ہے تو ہمیں اپنی صحت کے حوالے سے بے شمار حقائق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات

فروژن پراٹھے: 4 عدد
کالی مرچ: ایک چائے کا چمچ
سفید زیرہ: ایک چائے کا چمچ
گرم مصالحہ: 1/2 چائے کا چمچ
اورک لبسن کا پیسٹ: ایک کھانے کا چمچ
سویا سوس: ایک کھانے کا چمچ
سرکہ: 2 کھانے کے چمچ
نمک: حسب ذائقہ
آئل: حسب ذائقہ

املی کی سوس بنانے کیلئے:

املی کی پیسٹ: ایک کپ
ہری مرچ: 8 سے 10 عدد
پودینا: 1/2 کپ
ہرا دھنیا: 1/2 کپ
ٹماٹر: 2 عدد
پیاز کٹی ہوئی: ایک عدد
نمک: حسب ذائقہ
لال مرچ کا پاؤڈر: ایک کھانے کا چمچ
زیرہ پاؤڈر: ایک چائے کا چمچ
لیموں کا رس: 2 کھانے کے چمچ
(نوٹ: تمام اجزاء کو کس کر لیں)

ترکیب: چکن کو نمک، ایک کھانے کے چمچ سرکہ، لیموں کے رس اور سویا سوس لگا کر پوری رات فریج میں رکھ دیں۔ پین میں آئل گرم کریں اور اس میں اورک لبسن کی پیسٹ فرائی کریں۔ اب اس میں چکن، کالی مرچ، گرم مصالحہ اور سفید زیرہ ڈال کر اچھی طرح پکائیں۔ پیاز اور کھیرے کو باقی بچے سرکہ میں ڈال کر رکھ لیں۔

پراٹھے کو توڑے پر فرائی کر لیں۔ اب پراٹھے میں پیاز، کھیر اور چکن رکھ کر تھیں (Layers) بنائیں۔ اوپر املی کی چٹنی ڈالیں اور رول کر لیں۔ پراٹھا رول تیار ہیں۔

ترکیب: پھول گو بھی کاٹ لیں۔ چکن کو 10 منٹ کے لیے اُبلتے پانی میں ڈال کر ابال لیں۔ کسی برتن میں ایک کھانے کا چمچ آئل گرم کریں اور اس میں اورک، لبسن کا پیسٹ اور پیاز ڈال کر فرائی کر لیں۔ اب اس میں گو بھی کے پھول ڈال دیں۔ 30 سیکنڈ تک فرائی کریں۔ اب اس میں نمک، چٹنی، سویا سوس، اووینسٹر سوس اور گرم پانی مکس کر دیں۔ سبزیاں گلنے تک انہیں فرائی کریں۔ پھر ایک سوس پین میں ایک کھانے کا چمچ آئل ڈالیں۔ سائسی سوس کے لیے اس میں اورک، لبسن کا پیسٹ اور پیاز ڈالیں۔ ایک منٹ تک فرائی کرنے کے بعد کٹا ہوا لوبیا اور لال مرچ ڈال دیں۔ اب نمک، چٹنی، سویا سوس اور اووینسٹر سوس ڈال کر مکس کر لیں اور تھوڑا سا گرم پانی بھی ڈال لیں۔

ایک ابالا آنے پر چکن اور سلاٹس کی ہوئی گاجر ڈال دیں۔ گاڑھا کرنے کے لیے ایک کھانے کا چمچ کارن فلور ملا لیں۔ پھر اس میں ہری پیاز اور سویا سوس شامل کریں۔ ایک منٹ تک پکا کر اُتار لیں۔ پھر سرونگ پلیٹ میں چکن نکال کر ریش اور کناروں پر سبزیاں ڈال کر پیش کریں۔

چکن پراٹھا رول



اجزاء:

بونیس چکن: 1/2 کلو گرام
باریک کٹی پیاز: ایک عدد
لیموں کا رس: 2 چائے کے چمچ
کھیرا: ایک عدد

لیں کہ آنکھوں کی سوجن کی یہ علامت ان میں سے کسی ایک بیماری کا آغاز ہو سکتی ہے۔



ناک کا سرخ رہنا

اگرچہ جلد کی سرخی کو عام طور پر صحت اور خوش و خرم ہونے کی علامت تصور کیا جاتا ہے تاہم ناک کا مسلسل سرخ رہنا کسی پیچیدہ صورتحال کے باعث ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ بہت زیادہ الکحل استعمال کر رہے ہیں۔ الکحل چھوٹی چھوٹی خون کی نالیاں بناتی ہے جو ناک کے قریب خون جمع کرنے کا باعث بن جاتی ہیں اور اس سے ناک سرخ نظر آنے لگتی ہے۔ اس علامت کا ظاہر ہونا اس وقت تک تشویش کا نہیں جب تک کہ یہ مستقل صورت اختیار نہ کرے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سرخی وقتی ہو جو جلد ہی غائب ہو جائے لیکن اگر آپ الکحل استعمال کرتے ہیں تو فوری طور پر اسے بند کر دیں۔ ناک کا مستقل سرخ رہنا ایک اور بیماری lupus کا بھی پیش خیمہ ہو سکتا ہے جو بدن درد اور جوڑوں میں پٹھن کا باعث ہے اور اس کے نتیجے میں ناک کے قریب تھلی کی شکل کے rashes نمودار ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہائی بلڈ پریشر کی صورت میں بھی چہرے پر بشمول ناک سرخی پیدا ہو سکتی ہے۔

قاعدگی اور بلاشبہ ایکٹی شامل ہیں۔ اس بیماری کا علاج ممکن ہے لہذا یہ علامات ظاہر ہونے پر اپنے ڈاکٹر سے رجوع کریں کیونکہ اسے نظر انداز کرنا دیگر عوارض کا باعث بن سکتا ہے۔ جیسے کہ ہائی کالیسٹرول اور ذیابیطس وغیرہ۔



آنکھوں کی سوجن

جب آنکھوں کے نیچے کا حصہ سوجا نظر آئے تو عام طور پر ہم کھیرے کا ٹکڑا رکھتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ زود اثر خاص طور پر اگر بہت زیادہ روتے رہنے کی وجہ سے آنکھیں سوج گئی ہوں تو ٹھنڈی بخائی بیگز رکھ کر سوجن کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دونوں نسخے کارآمد ہیں لیکن اگر ان سے افادہ نہ ہو اور صورتحال زیادہ تشویشناک لگے تو یہ اس بات کی علامت ہو سکتی ہے کہ آپ کے گردے اس طرح کام نہیں کر رہے جیسے انہیں کرنا چاہیے۔ گردے ہمارے بدن سے فالتو ذرات اور پانی کو نکال کر ہمیں صحت مند رکھتے ہیں نیز ایسے ہارمون پیدا کرتے ہیں جو ہمارے بلڈ پریشر کو تادل رکھنے اور خون کے سرخ ذرات پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ اگر گردے یہ کام ٹھیک سے نہ کر سکیں تو ہائی بلڈ پریشر، ایسیا، ہڈیوں کی کمزوری اور اعصابی کچھاؤ جیسی بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔ یہ بیماری موروثی طور پر بھی ہو سکتی ہے لہذا اگر آپ کے خاندان میں گردوں کی بیماری پائی جاتی ہو یا ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر کی بیماریاں عام ہوں تو جان

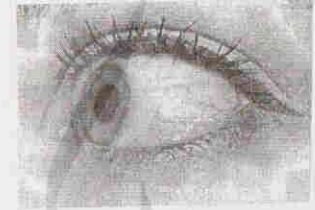
کی عادت کا نتیجہ نہیں بلکہ صورتحال زیادہ گھبر بھی ہو سکتی ہے۔ ایک ممکنہ وجہ نیم محرک تھائی رائیڈ گلیٹنڈ بھی ہو سکتا ہے جو اس وقت ممکن ہے جب آپ کا جسم تھائی رائکسن کی مطلوبہ مقدار پیدا نہ کر رہا ہو۔ یہ ہارمون آپ کے جسم کو درکار قوت کا ”پہرے دار“ ہے اور اگر یہ قوت مطلوبہ ضرورت کے مطابق مہیا نہ ہو رہی ہو تو آپ کے ہاضمے کی قوت میں کمی واقع ہو جائے گی اور وزن بڑھنے لگے گا۔ یہ علامات زیادہ خطرناک نہیں اور قابل علاج ہیں تاہم اس کے ساتھ دیگر علامات پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے جیسے کہ تھکاوٹ یا ڈپریشن وغیرہ۔ گالوں پر سوجن سائنوسس کی بھی علامت ہو سکتی ہے جو اگرچہ زیادہ مضر نہیں تاہم پریشان کن ضرور ہے۔



ایکینی

عام طور پر چہرے پر نکلتے والے دانوں اورکیل مہاسوں کو جوانی کی علامت تصور کیا جاتا ہے لیکن اگر یہ بار بار نمودار ہوں تو یہ نہ صرف انسان کے لیے انتہائی پریشان کن ہوتے ہیں بلکہ یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ کو ایک خاص ہارمونل ابتری کا سامنا ہے جسے polycystic ovary syndrome کہا جاتا ہے۔ انگلستان میں ہونے والے ایک سروے کے مطابق ہر دس میں سے ایک خاتون اس مسئلے کا شکار ہے۔ اس کی علامات میں وزن کا بڑھنا، جسم پر بالوں کا نمودار ہونا، ماہواری میں بے

نشانات کا اُبھرنا یا خون کی طرح کا جال نظر آنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ حد سے زیادہ غیر محتاط ہیں



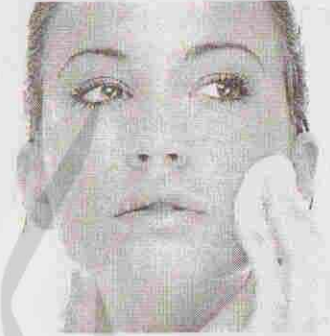
اور اپنی صحت سے قطعی لاپرواہی کا مظاہرہ کر رہے

ہیں۔ بعض اوقات یہ صورتحال کسی الرجی یا انفیکشن وغیرہ کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے جس کے لیے آپ کو ماہر امراض چشم سے رابطہ کر کے ادویات استعمال کرنی پڑ سکتی ہیں۔ خاص طور پر اگر آنکھوں میں تکلیف یا بصارت میں کمزوری محسوس ہو۔ تاہم آنکھوں میں خون نما لکیروں یا لقطوں کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ آپ انتہائی تھکن کا شکار ہیں اور اس وجہ سے آپ کو بار بار اپنی آنکھیں ملنا پڑتی ہیں۔ اس صورت میں آپ کو صرف آرام کی ضرورت ہے۔ آنکھوں میں سرخی تیز بخار یا دیگر الرجی کی علامات کے باعث بھی ہو سکتی ہے جس کے لیے معمولی ادویات لی جاسکتی ہیں تاہم اس کے ساتھ شدید درد ایک خطرناک صورتحال کو ظاہر کرتا ہے جس کے لیے فوری طور پر ڈاکٹر سے رابطہ کرنا ضروری ہے۔



سوجے گال

اگر آپ کو اچانک اپنا چہرہ سوجا ہو محسوس ہو تو یہ علامت صرف زیادہ چکنائی یا رات گئے سنیک کھانے



جلد کی خشکی

بعض اوقات چہرے کی جلد کا خشک ہونا محض ایک مہنگا مہاجر انز خریدنے سے زیادہ توجہ کا مستحق ہوتا ہے۔ گزشتہ کچھ برسوں سے دنیا بھر میں eczema کے مریضوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ پولن، فضا میں آلودگی، گردوغبار، جانوروں کے بال، صابن، ہارموئل تبدیلیاں اور مخصوص خوراک اس کا سبب ہو سکتے ہیں لہذا یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ آپ کو خشک کریں اور تجربات سے جاننے کی کوشش کریں کہ آپ کے لیے کیا چیز اس کا سبب بن رہی ہے۔ eczema کا ایک اور اہم سبب ذہنی دباؤ یعنی stress ہے لہذا جلد کا اچانک خشک ہو جانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ فوری طور پر ذہنی دباؤ کو کم کرنے کی کوشش کریں۔

آنکھوں کے گرد دائرے بننا

بوڑھے اور معمر حضرات میں آنکھوں کے گرد سفید دائرے نمودار ہونا عام بات ہے اور اسے خطرناک تصور نہیں کیا جاتا کہ بڑھتی عمر کے باعث جلد کے خلیوں



میں توڑ پھوڑ سے ایسا ہو جاتا ہے لیکن جوان لوگوں میں یہ علامت ظاہر ہونا بلاشبہ تشویشناک ہے اور اگر آپ کو ایسی علامت نظر آئے تو فوری طور پر ڈاکٹر سے رجوع کر کے باقاعدہ تشخیص کروائیں۔ چہرے کے گرد یہ دائرے دراصل چکنائی کی مقدار کو ظاہر کرتے ہیں اور اس بات کا اشارہ ہیں کہ آپ کے بدن میں کالیشرول لیول بڑھ گیا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے جلد از جلد قابو میں کرنا انتہائی ضروری ہے۔ تاہم آنکھوں کے گرد نظر آنے والے یہ دائرے صرف کالیشرول لیول کے باعث ہی نہیں بنتے بلکہ تھائی رائیڈ کی بیماری، جسم میں نمک کی مقدار کا بڑھ جانا، ذیابیطس اور جگر کا مرض بھی اس کا سبب ہو سکتا ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ دائرے چکنائی کی زیادہ مقدار کی وجہ سے آنکھ میں تکیسیم جمع ہو جانے کے سبب بھی ہو سکتے ہیں۔



مسوڑھے سو جانا

دانتوں کو اچھی طرح صاف کرنا، کھانے کے ذرات سے فوری نجات اور ماؤتھ واش کا استعمال نہ صرف آپ کے دانتوں کو ظاہر سفید اور چمکدار بناتا ہے بلکہ یہ آپ کی جان بچانے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ مسوڑھوں کی بیماریاں یا ان سے خون آنا اس وقت ہوتا ہے جب دانتوں کو باقاعدگی سے اور پوری طرح صاف نہیں کیا جاتا۔ اس کے باعث مسوڑھوں کی سطح پر plaque کی تہہ جم جاتی ہے۔ اس کی علامات میں مسوڑھوں کی سوجن، سرخ ہونا یا مسوڑھوں

کمی اینیما کا شکار کر سکتی ہے۔ آئرن کی کمی سے ہونے والے اینیما کی علامات کو پہچاننا ذرا مشکل ہے۔ خاص طور پر اگر آپ جسمانی طور پر صحت مند ہیں۔ تھکن، سر درد وغیرہ منہ اور گلے میں خشکی پیدا کرتے ہیں جس سے ہونٹوں پر کٹھاؤ نمودار ہو جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے آئرن کی گولیاں کھانے سے اس بیماری کو باآسانی رفع کیا جاسکتا ہے لیکن آپ کو سب سے پہلے ایسی صورتحال سے بچنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ متوازن غذا (بالخصوص آئرن کی زیادہ مقدار والی غذا جیسے گوشت، انڈے اور ڈرائی فروٹ وغیرہ) استعمال کریں اور آئرن سپلیمنٹ استعمال کریں۔

کمزور بال

اگر آپ کے بال اچانک سروں سے اوپر کی جانب بے حد کمزور ہو جائیں تو اس کی وجہ آپ کی جسمانی صحت ہو سکتی ہے۔ سب سے پہلی وجہ ذہنی دباؤ ہے، ذہنی دباؤ یا سٹریس بالوں کو کمزور کرتا ہے۔ ایک تحقیق کے

دوران معلوم ہوا ہے کہ نفسیاتی دباؤ انسان کی جلد اور بالوں کی



صحت خراب کرنے میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ اگر ذہنی یا نفسیاتی دباؤ اس کی وجہ نہیں ہے تو اس کے باوجود آپ کے بالوں کی خراب حالت اس بات کا اشارہ ہو سکتی ہے کہ آپ کا بدن مناسب غذا نہ ملنے، کھانے پینے میں اعتدال نہ ہونے اور نظام ہضم کی خرابیوں کا شکار ہے۔

سے خون آنا شامل ہے۔ ایسی صورت میں سانس بھی بدبودار ہو جاتی ہے اور ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے کے بعد بھی بدبو ختم نہیں ہوتی۔ اس صورت میں آپ کو فوری طور پر اچھے دندان ساز سے علاج کروانا چاہیے کیونکہ مسوڑھوں کی بیماری کو نظر انداز کرنا نہ صرف آپ کے دانتوں کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ اس کے باعث مسوڑھوں پر جمع ہونے والی plaque کی تہہ منہ کے راستے خون میں شامل ہو کر دل کے دورہ یا انجائنا کا سبب بن سکتی ہے۔ امریکہ کے ایک جریڈے ”جرنل آف وی امریکن ہارٹ ایسوسی ایشن“ میں شائع ہونے والی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں کے منہ میں ایک مخصوص جراثیم کی زیادہ مقدار جمع ہو جاتی ہے ان کی شریانوں میں خون جمنے کے انتہائی زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔



کٹے ہونٹ

ہونٹوں پر کٹھاؤ نمودار ہونا بالخصوص عورتوں میں بہت عام ہے اور اس کی وجہ آئرن کی کمی ہے۔ یہ دوران حمل یا ماہواری کی زیادتی کے باعث بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے بدن کو خون کے سرخ ذرات پیدا کرنے کے لیے آئرن (دنا من پی 12 اور فولک ایسڈ کے تعاون) کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی

اولین سمجھتی ہے لیکن آپ تو نہ صرف انہیں چوگا ڈال رہے تھے بلکہ ان سے پیار بھی کر رہے تھے۔ ان کے جسوں پر نرم نرم ہاتھ بھی پھیر رہے تھے اور وہ آپ سے کسی قسم کا خوف بھی نہیں کھا رہے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہو گیا؟ آپ نے تو ایک انہونی کر دکھائی۔ جواب ملا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ان کی خدمت آج سے نہیں ایک طویل عرصے سے کر رہا ہوں اسی لیے یہ مجھ سے کسی قسم کا خوف نہیں کھاتے۔

مگر آپ ان کی خدمت کیوں کرتے ہیں؟

یہ بھی تو اللہ کے ”جی“ ہیں ناجی!

مگر یہ تو خطرناک بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔

بالخصوص ”طاعون“ کے!

کم از کم تیس سال سے میں ان کی خدمت کر رہا ہوں۔ آج تک مجھے کچھ نہیں ہوا بلکہ اللہ کریم کی بے پناہ رحمتیں مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔

سبحان اللہ! میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی مجھے یاد آ گیا۔

ایک روز میں اپنے ایک دوست کے گھر گیا۔ وہ اپنے صحن میں دو سال سے رکھی ہوئی ایشیں بڑی پھرنی سے ہٹا رہے تھے اور تقریباً غصے میں بھی تھے۔

پوچھا ماجرا کیا ہے.....؟

جواب ملا: یاران چوہوں نے بڑا پریشان کر رکھا ہے۔ ان اینٹوں میں انہوں نے گھر بنا رکھے ہیں۔

آج میں ان کو چھوڑوں گا نہیں۔

وہ کہتے چلے جا رہے تھے اور تیزی سے ایشیں بھی ہٹاتے چلے جا رہے تھے۔ آخر ایشیں نہیں تو چوہوں کا ٹھکانہ سانسے آ گیا۔ خوشی سے چلائے.....

مل گیا مل گیا..... چوہوں کا ٹھکانہ مل گیا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر چوہوں کا ٹھکانہ دیکھا اور

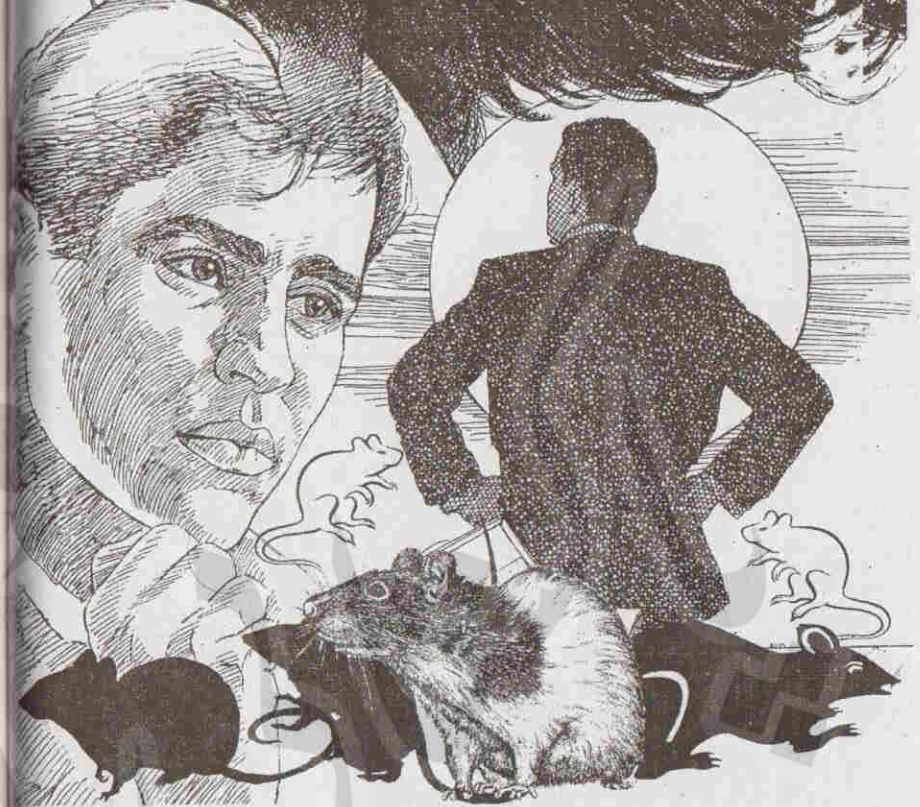
ساتھ ہی زور دے کر کہا: ”مارواں..... کو“

اور میں وہیں پر آف آف کرتا ہوا بیٹھ گیا۔ میرا پاؤں بُری طرح جھلس گیا تھا۔

زندگی کے طویل سفر میں قدم قدم پر نت نئی چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان سے آسائش بھی ملتی ہیں اور صعوبتیں بھی۔ مجھے ایتھنز (یونان) میں جن ”بلاؤں“ سے واسطہ پڑا تھا وہ صحیح معنوں میں یہ موٹے موٹے، پلے ہوئے چوہے تھے جن سے میں سخت تنگ تھا اور ہر لمحہ انہیں مارنے کی سکیس میں سوچتا رہتا تھا۔ یہاں مجھے چوہوں کے حوالے سے ایک واقعہ یاد آ گیا۔

میں ایک گھر میں مہمان تھا۔ میزبانوں نے رات کو میرے سونے کا بہترین انتظام کر رکھا تھا اور اب میں گہری نیند کے مزے لے رہا تھا کہ رات کے پچھلے پہر میری سوتے میں آنکھ کھل گئی۔ عجب تماشہ تھا میرے سامنے۔ میں نے ذرا نیند سے جھجھل آنکھیں کھول کر فور سے دیکھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ایک اچھا نظر آیا۔

گھر کے نگران صاحب چپکے چپکے ان کی خدمت کر رہے تھے جنہیں ہم عام حالت میں بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ جی ہاں وہ چوہوں کی خدمت کر رہے تھے۔ وہ چوہوں کو روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈال رہے تھے اور وہ جی جی جی کی آوازیں نکالتے ہوئے مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔ چھ سات چوہے ان کے سامنے نہایت نازل حالت میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے اور حد یہ بھی رہی کہ وہ حضرت ان کی کمر پر ہاتھ پھیر کر انہیں پیار بھی کر رہے تھے اور کوئی بھی چوہا ان سے بدکنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ میں حیرت سے انہیں کافی دیر تک دیکھتا رہا لیکن اپنے منہ سے بولا کچھ نہیں۔ ہاں صبح ہونے پر میں نے ان سے یہ سوال ضرور کیا تھا کہ لوگوں کی اکثریت پلید چوہے کو مار دینا اپنا فرض



اقبال قسم

اپنا ہی لگا پردیس میں

میں انہونی پر بہت خوش تھا کہ شکار خود شکاری کے قابو میں آ گیا تھا۔ ہوا یوں کہ میں جونہی ٹیکسٹری سے واپسی پر بھوک کی شدت سے باورچی خانے میں داخل ہوا اور باورچی خانے میں رکھے برتنوں کی طرف بڑھا تو مجھے ایک خالی دپٹی میں سے کھرچ کھرچ کی آواز آئی، دپٹی کے اوپر ”ادھ کھلا“ سا ڈھکن بھی پڑا ہوا تھا۔

دیار غیر میں ”خاص مہمانوں“ سے ملاقات کا دلچسپ احوال

”تو نے“ کو صاف کر کے ڈبل روٹی نکالی اور اس کے پیس بنا رہا تھا کہ دھم سے میرے کندھے پر چوہا آن گرا۔ میں اس اچانک حملے سے بُری طرح بوکھلا کر جو اچھلا تو چوہے پر رکھی دپٹی سے ہاتھ جالگا اور وہ ایک دھماکے سے اُچھلی اور میرے پاؤں پر آگری

اس روز تو کمال ہی ہو گیا۔ میں ڈیوٹی پر پہنچنے کے لیے صبح چار بجے ہی اٹھ گیا اور فریش ہونے کے بعد اپنے لیے ناشتہ تیار کرنے کے لیے سیدھا کچن میں جا گھسا۔ چائے کی دپٹی میں پانی ڈالا، گیس کا ”چولہا“ جلایا اور دپٹی اس کے اوپر رکھ دی اور

ماموؤں کے گھر سے

ایک بچے سے یہ جب پوچھا کسی استاد نے
آتی ہے بجلی کہاں سے؟ کیا تمہیں معلوم ہے؟
بچہ یہ بولا کہ سر! بالکل ہے مجھے اس کا پتہ
میرے ماموؤں کے گھر سے بجلی آتی ہے سدا
پوچھا جب استاد نے حیرت سے تم نے کیا کہا؟
بچہ یہ بولا جناب! ایسا ہمیشہ ہی ہے ہوا
جب بھی مٹی گئی تو میرے ابا نے کہا
لو! پھر ان سالوں نے بجلی بند کر دی دیکھنا۔

☆☆☆

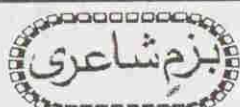
مگر یہاں بھی یوں سمجھئے کہ انہونی ہوئی۔ ان صاحب نے چوہوں کو مارنے کی بجائے انہیں نہ صرف چھوڑ دیا بلکہ اینٹوں کو چار اطراف میں اس طرح رکھ دیا کہ درمیان کا حصہ خالی رہے یعنی ان کے لیے ”ایزی ہوم“ بنا دیا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا: یہ کیا ہے بھئی.....؟
جواب ملا: چوبیا کے بچے ہیں یار..... اس لیے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ انہیں بھلا کیا مارنا؟ یہ تو بچہ مارے معصوم ہیں۔

سبحان اللہ! میں نے کہا اور میرے دوست نے ساری اینٹیں واپس رکھ دیں لیکن جس غصے اور ناراضگی کے ساتھ انہوں نے اتاری تھیں اسی غصے میں نہیں بلکہ بڑے پیار سے۔ سنبھل سنبھل کر، نہایت تحمل کے ساتھ کہ چوبیا کے بچوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

اجنبی جو بھی ملا پردیس میں
ہم کو اپنا ہی لگا پردیس میں
(خادم حسین خاکسار)
اس شعر کی طرح کچھ میری بھی اتھنر میں ایسی

ہی صورتحال رہی۔ میں اتھنر کے علاقہ کلنٹھیا میں ایک کمرے میں تنہا رہتا تھا۔ کمرے کے ساتھ کچن بھی تھا جس میں اپنے لیے صبح سویرے ناشتہ بنایا کرتا تھا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ باورچی خانے کے اندر درجنوں چوہے آباد تھے۔ ہر وقت کھڑ بڑ کھڑ بڑ بچائے رکھتے تھے۔ یہی نہیں جگہ جگہ میٹنیاں بھی کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان سے سخت تنگ تھا۔ ادھر میں نے باورچی خانے کا دروازہ کھولنا ادھر چوہے دندناتے ہوئے آن و وارد ہوتے تھے۔ کبھی پاؤں میں بھاگتے پھر رہے ہیں تو کبھی چولہا رکھنے والی تھڑی پر اور کبھی چھت پر۔ گویا کوئی جگہ نہیں تھی جہاں چوہوں سے دبدو جنگ نہ ہو۔ ہر لمحے ہر گھڑی میں ان چوہوں کے خاتے کا سوچنا تھا کہ ان کا کیسے یا کس طرح صفایا کروں لیکن بس سوچتا ہی رہ جاتا تھا۔ ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے روزانہ سات بجے ڈیوٹی پر پہنچنا ہوتا تھا۔ اس لیے میں گھڑی پر صبح پانچ بجے کا الارم لگا کر سویا کرتا تھا اور اکثر صبح چار بجے ہی سوتے سے اٹھ جایا کرتا۔ غسل وغیرہ کر کے جونہی میں کچن کی طرف آتا دندناتے ہوئے چوہوں سے ٹک بھیر ہو جاتی۔ ایک روز تو ایسا بھی ہوا کہ چھت سے چوہا نیچے گرا اور سیدھا میرے کندھے پر آ رہا۔ میں اس اچانک حملے سے بُری طرح ہلکا کر جو اُچھلا تو چولہے پر چائے کے لیے رکھی دیکھی بھی میرے ہاتھ لگنے سے اُچھل کر میرے پاؤں پر آ گری۔ پاؤں بُری طرح جھلسا۔ اس کے نتیجے میں میں لنگڑااتا ہوا فیکٹری پہنچا۔ یہ صورتحال کم از کم دس روز تک رہی۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، صبح الارم بجنے کا انتظار کرنے کی بجائے خود ہی چار بجے بستر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ چوہوں کی بھگدڑ میں جلدی جلدی ناشتہ تیار



یہ سب اردو سے محبت کا اعجاز ہے قاضی
تیرے وسیع مطالعہ سے شاعری کو بنیاد مہیا ہو جاتی ہے
(قاضی محمد یوسف، مسقط)

غزل

اسرارِ باطن سے جو ذی روح بیدار ہے
دردِ عشق وہاں زندہ و پائیدار ہے
گر قائم ہے رشقِ جسم و جاں
تو تڑپ اس دل کی نمودار ہے
آب و تابِ بزمِ حسنِ دو جہاں
چشمِ بینا ہی سے برقرار ہے
خراما خراما چلے جو باوِ صبا
تو خوشبو و ہستی کلی کی آشکار ہے
اک قطرہ آب ہے شبنمِ فضا
پھول سے جب تک وہ بے کنار ہے
یہ باعثِ خوش گوشتی ہے مری کہ
کوکلِ جہاں کی سریلی گلوکار ہے
اگر نہیں سخن میں اثر جو تڑپا دے
تو قلمِ اہلِ نکتہ چیں بے رحم تلوار ہے
عینِ جیت کی قدر تو کرتا ہے دہن
ہارِ جیسی لذت سے جو آشکار ہے
(عصمت اقبال عین، منگلا ڈیم)

غزل

میں پل دو پل کا شاعر ہوں
پل دو پل میری کہانی ہے
پل دو پل میری ہستی ہے
پل دو پل میری جوانی ہے

میرے اللہ میں کیا کروں
تو ہی مجھے راستہ بتا
بھٹک نہ جاؤں کہیں پھر
اپنی رحمت کا اشارہ دکھا
میری ہر دعا ہوئی قبول
جب میں تیرے سامنے جھکا
امتِ رسول ﷺ کی ہے پریشان
آس کا اب اک دیا جلا
ترے در کا سوالی ہوں
مانگنے کا مجھے سلیقہ سکھا

(وسیم اختر، راولپنڈی)

میری شاعری

کچھ دھندلے دھندلے خاکے ذہن میں آتے ہیں
جب من کی بات زبان پر آ کر نوکِ قلم ہو جاتی ہے
ایک عجب تقاضا پھیلتا ہے سینے کی دیواروں میں
سخنوں کی محفل میں جب اپنی رسائی ہو جاتی ہے
یہ پھولِ اقبال کی ہستی کے یہ درختے میر و غالب کے
ان کے ناطے سے محفل میں اپنی رسائی ہو جاتی ہے
مدت سے شعر و ادب کا ذوق تو ہے تاہم کبھی کبھی
اچھا شعر نہ کہنے پر جگ ہنسی ہو جاتی ہے
تب خود سے کہتا ہوں رنجیدہ نہ ہو یہ تو
اللہ کا احسان ہے کہ محفل میں پذیرائی ہو جاتی ہے
جب اچھا شعر کہہ لیتے ہو تو محفل میں
تالیاں ہنپتی ہیں اور واہ واہ کی دہائی ہو جاتی ہے

برآمد ہوگا جوتے کے ایک ہی وار سے اگلی دنیا میں
پہنچا دوں گا۔ لیکن یہ کیا.....؟
چوہا تو اندر سے برآمد ہی نہیں ہوا لیکن دیکھی کو
کھرپنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ میں حیران ہوا
کہ دیکھی کے اندر چوہا نہیں تو پھر کیا ہے؟ اب جو
میں نے تھوڑا سا ڈھکن ہٹا کر دیکھی کے اندر جھانکا تو
پہلے لمبے تو مجھے اندر کے شکار کو دیکھ کر سخت غصہ آیا
اور جی چاہا کہ اندر کی مخلوق کا صفایا کر دوں مگر
دوسرے ہی لمحے مجھے ان کی معصوم اور بھولی بھالی سی
صورتیں دیکھ کر ان پر پیار آنے لگا کہ عین اسی لمحے
میرے ذہن کی سکرین پر یہ خیال ابھرا کہ جس طرح
ان بچوں کی ماں چوہیا اپنے ننھے منے سے چار بچوں
کو دیکھی میں چھوڑ کر ان کے لیے ”دانہ دنگا“ تلاش
کرتی گئی ہے اسی طرح میں بھی اپنے معصوم اور چار
ہی بچے پاکستان میں چھوڑ کر ان کے لیے ”دانہ دنگا“
تلاش کرنے نکلا ہوں۔ اللہ نہ کرے ان پر کوئی جوتا
تانے۔ میرا درد دس میں بیٹھے ہوئے کیا حشر ہوگا؟
بس مجھے یہی باتیں سوچتے ہوئے چوہیا کے بچوں پر
ترس آ گیا اور میں نے دیکھی سمیت چوہیا کے بچوں
کو باہر سڑک پر رکھے ”کنٹینر“ میں نہایت محفل، آرام
اور بڑے پیار سے رکھ دیا اور کوشش کے ساتھ سچی
بات میں نے انہیں پیار بھی کیا۔ آپ یقین کر لیں
انہیں کنٹینر میں رکھنے کے بعد مجھے ایسا پرسکون سا
احساس ملا جیسے میں نے اپنے بچوں کو ان کی ”ماں کی
گود“ میں دے دیا ہو۔ ہاں مجھے یہ احساس بھی ملا کہ
میں نے چوہیا کے بچوں کو ان کی ماں کی گود سے
علحدہ کر دیا ہے لیکن ان پر یہ احساس غالب رہا کہ
بچے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

ابھی جو بھی ملا پردیس میں
ہم کو اپنا ہی لگا پردیس میں

کرنا، بچن میں کھڑے کھڑے ناشتہ کرنا، بچن اور
کمرے کو تالے لگانا اور پھر بھاگ بھاگ کلیجھیا
ریلوے سٹیشن پر پہنچنا، ریل کا انتظار کرنا، ریل میں
سوار ہونا اور ٹھیک پونے سات بجے انٹرنر ریلوے
سٹیشن پر پہنچنا، سٹیشن کی سڑھیاں چڑھنا، سٹیشن سے
باہر نکلنا اور بھاگ بھاگ ٹھیک سات بجنے میں ایک
دو منٹ کم پر فیکٹری کے اندر داخل ہونا اور ”مسی پتو“
(آدھے منٹ) کے اندر اندر ڈیوٹی پر کھڑے ہو
جانا۔ فیکٹری سے واپسی پر بھی اسی طرح کے مسائل
سے دوچار۔ شام گئے ڈیرے پر پہنچنا۔ ہفتہ اتوار
چھٹی ہوتی تھی لیکن دو دنوں میں سب سے پہلے اپنی
نیند پوری کرتا پھر کپڑے دھوتا، کھانا لکھتا اور غسل
صحیح فرماتا، برتن وغیرہ دھوتا اور بھی مختلف کام
نہاتا۔ یہ سب میری ذمہ داریوں میں شامل تھا۔
ایسے میں بھلا کس طرح چوہوں کا قلع قمع کرتا؟ بس
باقی دنوں میں تو میں سوچ ہی سکتا تھا اسی لیے وہ
دندانے پھرتے تھے۔ دگر دگر کرتے پھرتے تھے
لیکن ایک دن تو کمال ہو گیا۔

میں انہونی پر بہت خوش تھا کہ شکار خود شکاری
کے قابو میں آ گیا تھا۔ ہوا یوں کہ میں جونہی فیکٹری
سے واپسی پر بھوک کی شدت سے باورچی خانے
میں داخل ہوا اور باورچی خانے میں رکھے برتنوں کی
طرف بڑھا تو مجھے ایک خالی دیکھی میں سے کھرچ
کھرچ کی آواز آئی، دیکھی کے اوپر ”ادھ کھلا“ سا
ڈھکن بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑا
کر دیکھی کے اوپر ڈھکن پورا کر دیا اور سختی سے اوپر
ہاتھ بھی رکھ دیا کہ چوہا باہر نہ نکلے پائے۔ اب میں
نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہ شکار خود
میرے قابو میں آ گیا ہے پاؤں سے چوتا اُتار کر
ہاتھ میں پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ تھوڑا سا دیکھی کا ڈھکن
ہٹایا اور جوتے کو عین نشانے پر رکھ دیا کہ جونہی چوہا

پوچھتے ہو کیا مجھ سے چاندنی کے بارے میں
باہمی محبت کو دشمنی نے گھیرا ہے
آدی نہیں سمجھا آدمی کے بارے میں
قتل عام ہوتا ہے ہر نفس ہی روتا ہے
اور کیا بتاؤں میں بے حسی کے بارے میں
کوئی اس کو سمجھائے یہ کنول ہے دیوانی
کون جان پایا ہے ہر کسی کے بارے میں
(یاسمین کنول، پسرور)

غزل

بس گیا میری آنکھ میں وہ خواب کی طرح
گزر رہی ہے ہر شب میری عذاب کی طرح
میرے سامنے سے وہ پھر ایسے گزرے آج
میں لفظ در لفظ پڑھوں اسے کتاب کی طرح
میں کیسے اسے اپنے دل سے پھر بھلا دوں
میری چاہت کو گھیرے ہے وہ گرداب کی طرح
لحہ در لحہ اس کے احساس کی خوشبو بہکے
برس جائے وہ میرے جیون پر سحاب کی طرح
میں راہ وفا کے اس مقام پر ہوں جہاں جاوید
کانٹے بھی گلے ملتے ہیں گلاب کی طرح
(محمد اسلم جاوید، فیصل آباد)

غزل

نہ ایسے جلاؤ مجھے بیٹے ہوئے لہو!
نہ ایسے رلاؤ مجھے بیٹے ہوئے لہو!
چاہت کا انوکھا سا وہ انداز کسی کا
نہ یاد دلاؤ مجھے بیٹے ہوئے لہو!
وہ پلی جو ٹکل ہی گئے ہاتھوں سے نہ ان کا
پچھتاوا دلاؤ مجھے بیٹے ہوئے لہو!
کچھ میری اذیت کی انہیں جا کر خبر دو

ساس اور سر جی اور اپنی بیوی ہی یہ ہے مرنا
جس ماں نے ہے ہمیں پالا پورا جس نے ہمیں جواں کیا
حیثیت کیا ہوگی اس کی، یہ ہے بیوی نے ہمیں بتایا
ہرگز اماں کی نہیں چلے گی اور ایک نہیں ہے سننا
اسے حکم حاکماں سمجھ کر، پیچھے کبھی نہیں ہے ہٹنا
پہلی کو لاؤ گے جب تنخواہ، میری ہتھیلی ہی یہ رکھنا
اماں ہو، ندیا ہو باوا، تمہیں ہی ہے ان سے بھی نمٹنا
مبسم شادی کو ہوئے میری دس سال
شامت پڑی ہے گھر پہ ایسی، مٹی ہوئی ہے نہ منا
(اقبال تبسم، راولپنڈی)

غزل

تبصرہ کروں میں کیا زندگی کے بارے میں
سوچتی میں رہتی ہوں بس اسی کے بارے میں
آپ کتنے اچھے ہیں، آپ کتنے پیارے ہیں
آپ کو بتاؤں کیا آپ ہی کے بارے میں
زندگی کو کیا سمجھوں، زندگی کو کیا جانوں
جانتی ہی کیا ہوں میں زندگی کے بارے میں
خط میں لکھ دیا ہے اب جو سمجھ میں آیا تھا
آپ سے شکایت ہے آپ ہی کے بارے میں
اس قدر بدل جائے بات سے مگر جائے
کچھ بھی کہہ نہیں سکتے ہم کسی کے بارے میں
خواب، شعر اور نغمہ کون خوبصورت ہے
دلکشی بتائے کیا دلکشی کے بارے میں
بات گہری جانی ہے احتیاط لازم ہے
کوئی کچھ نہیں کہتا خاموشی کے بارے میں
جو نظر کو بھا جائے اس پہ بات کرتے ہیں
تبصرہ نہیں کرتے ہر کسی کے بارے میں
خواب خواب راتوں میں زندگی سی لگتی ہے

وہی بے جا تصرف تھا نظر کا
فلک پر چاند اور تارے نہیں تھے
ہوئے بے سایہ جب ہم دوپہر میں
تو ہمسائے بھی ہمسائے نہیں تھے
لگے تھے بن کے پتھر مرے سر میں
انہوں نے پھول جو پھینکے نہیں تھے
گلابوں کو ہدایت کون کرتا
ہم کانٹوں سے جب الجھے نہیں تھے
اچھا ہوا خود کھینچ گئے وہ امتیاز
مرے حالات بھی اچھے نہیں تھے
(ایس۔ امتیاز احمد، کراچی)

غزل

اپنی ہی غلطیوں کا جب احساس ہوا معنی خیز
اشکِ ندامت سے ہوا سارا بدن عرق ریز
یہ کس کی مہک روح کی گہرائیوں میں بس گئی
یہ کس کے جبرو کے سے ہوا آئی عطر بیز
بھائی کو بھائی سے الگ کرنے کی چال ہے
پھیلا رہا ہے کون یہ افواہیں شرانگیز؟
آپس کی دشمنی کا انجام ہو گا کیا؟
پیالہ ہمارے صبر کا ہونے لگا لبریز
رہ میرے! تو ہم کو عقل دے کچھ بھی ہو
اختر کی اس دعا کو بنا دے اثر انگیز
(رشید اختر قادری)

پھولوں دیوی

تعریف ہے اس لباس کی، جس نے بیگم کو بے بنایا
خوبصورتیوں کے ساتھ جس نے، پانی کا بے اک بلبند بنایا
کبھی اپنی مرضی نہیں چلے گی، یہ بیوی سے ہم نے سیکھا
ساس ہے بھلا یہ کیسی، اور کیسا ہے یہ سر بنایا
”پھولوں دیوی“ سے ہے ہم نے سیکھا، دنیا کے ساتھ جینا

مجھ سے پہلے کتنے شاعر
آئے اور آ کر چلے گئے
کچھ آپس بھر کر لوٹ گئے
کچھ نئے گا کر چلے گئے
وہ بھی اک پل کا قصہ تھے
میں بھی اک پل کا قصہ ہوں
کل تم سے جدا ہو جاؤں گا
مگر آج تمہارا حصہ ہوں
میں پل دو پل کا شاعر ہوں
میں پل دو پل کا شاعر ہوں
کل اور آئیں گے نفوس کی
کھلتی کلیاں چنے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے
تم سے بہتر سننے والے
کل کوئی مجھ کو یاد کرے
کیوں کوئی مجھ کو یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لیے
کیوں وقت اپنا برباد کرے
میں پل دو پل کا شاعر ہوں
میں پل دو پل کا شاعر ہوں
(شاعر: ساحر لدھیانوی۔ انتخاب: قاضی محمد یوسف)

غزل

سب اپنے تھے مگر اپنے نہیں تھے
ہری شاخیں تو تھیں پتے نہیں تھے
ہر اک پتھر براہ راست آیا
کسی کھڑکی میں بھی شیشے نہیں تھے
سب ہی کچھ تھا مری قسمت میں لیکن
نجوی کے لیے پیسے نہیں تھے
بڑا ناداں تھا پتھر کا زمانہ
کھلونے بھی تو مٹی کے نہیں تھے

اب مان بھی جاؤ مجھے بیٹے ہوئے لحو!
خاتم کو نہ کچھ یاد رہیں ماضی کی باتیں
کچھ ایسے بھلاؤ مجھے بیٹے ہوئے لحو!
(فریدہ خاتم، لاہور)

اسے دفتر جاں سے
خود ہی مٹا دوں
بھلا کس طرح
کیسے ممکن ہے یہ
دل نہیں مانتا

(اختر شمار۔ راولپنڈی)

ایک خواہش

تمام عمر اسی اضطراب میں گزری
کہ تو گلابوں سے اپنے لدے ہوئے بازو
مرے گلے میں حائل کر کے بکھر جائے
تو میرے ہاتھوں میں پھر ہاتھ دے اتنا بنے
کہ زندگی تری آواز سے نکھر جائے
خمار وصل سے سرشار ہو کر میں بھی مہکی
سمیٹ لوں تجھے اور مجھ میں تو سما جائے
(یوسف کامران)

اس ماہ کا شاعر

میر انام لکھنوی اللہ خان اور تخلص کیلئے نیازی ہے۔
شاعری کی ابتدا میٹرک سے پہلے کی۔ مزاج میں سچائی کو



پسند کرنے والا ہوں اور
اپنے وطن کی صورت حال سے
ہمیشہ متاثر ہوا ہوں۔ میری
پسندیدہ شخصیت عمران خان
ہیں۔ ان کی نیت کی صفائی،
رہنمائی کی خصوصیات اور

کردار کی سچائی سے مجھے محبت ہے اور میری خواہش
ہے کہ وہ وزیراعظم بن کر اس ملک کی تقدیر بدل دیں۔
میں انقلابی لوگوں کو اور مثبت انقلاب کے لیے
جدوجہد کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ میری
تعلیمی قابلیت M.Sc. کمپنری ہے۔ 2011ء میں

دل نہیں مانتا

تو نے خط میں لکھا ہے

بھلا دوں تجھے
ایک چھڑا ہوا خواب سمجھوں
جو آنکھوں کے میلے میں
اک بار مل کے
کہیں کھو گیا ہے
مگر میں تجھے ایک چھڑا ہوا
خواب کیسے لکھوں
جو میری آنکھوں میں

تیرے آنسو سجے ہیں

یہ میری محبت کے تازہ کنول ہیں
جو جھیلوں سے نکلے تو مرجائیں گے
اور اگر یہ مرے تو

یہ جھیلیں بھی یونہی اجڑ جائیں گی

بھلا دوں تجھے

کیسے ممکن ہے یہ

دل نہیں مانتا

دل نہیں مانتا

وہ زمانہ ترا

وہ فسانہ ترا

جو مری داستاں ہے

جو دل کے آجائے میں

لکھی ہوئی، آنسوؤں کی زباں ہے

مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا۔ میانوالی کے زرخیز خطہ موچھ سے میرا تعلق ہے اور ہمارا قبیلہ نیازی پٹھان قبیلہ ہے۔
کیکیا کے علاوہ Bio، ہسٹری اور اردو پسندیدہ مضامین ہیں۔ مسلمانوں کی سنہری تاریخ کا بھی ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔

اگر اس کو تمنا تھی ہمارے ساتھ رہنے کی تو ہم سے دور جانے سے ذرا پہلے بتا دیتے اقبال کی لکھی ہوئی یہ غزل میری پسندیدہ غزل ہے:

پسندیدہ کلام

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا اثر
میرے ثمر سے مئے لالہ قام پیدا کر
مرا طریقِ امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ سچ، غریبی میں نام پیدا کر

میرے کلام کا ایک نمونہ درج ذیل ہے:
ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو دنیا کو ہلا دیتے
مظالم کی سبھی شمعیں اشارے سے بجھا دیتے
ہماری اس غریبی نے ہمیں مجرم بنا ڈالا
وگرنہ ہم محبت کا دیا کوئی جلا لیتے
ہمارے ملک پہ ظالم کی گرچہ تھی حکومت پر
لبو اپنا جلا لیتے وطن اپنا سجا لیتے
اگرچہ اس نے چاہت میں بہت قربانیاں دی ہیں
مگر ہم بھی سمندر سے کوئی پیٹی چرا لیتے
نہ اس کے نقشِ بھولے ہیں نہ اپنی عادتیں ہم کو
وطن اپنے کی مٹی کو گلوں سے ہم سجا لیتے

خاص اعلان

محترم قارئین! ہزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف ہمو تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم/پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کو پتہ پر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 میں مارکیٹ ریو از گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوین برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی

تصویر

منسلک کریں

نام:.....

علاقہ قابلیت:.....

عمر:.....

پسندیدہ غزل/نظم:.....

مشاغل:.....

شادی شدہ/غیر شادی شدہ:.....

ای میل:.....

نوٹ: اپنی پسند ناپسند شاعری کی ابتدا مزاج اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجیے۔

مہذب طریقہ

محمد سلیم اختر

”تو پھر مختصراً یہ کہ مجھے اس سے شادی کر لینی چاہیے تاکہ حالات بالکل معمول کے مطابق ہو جائیں۔“ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ پھر جیسے لیزا کی دورانہ نشی اس پر آ جا کر ہو گئی۔ سینئر نے اس کی طرف دیکھا..... لیزا کے لبوں پر وہی شوخ مسکراہٹ رقصاں تھی.....

فرانس کے طبقہ اشرافیہ کے ایک معزز رکن کا قصہ، مغرب سے درآمد شدہ شاہکار

اور چال کا مظاہرہ کرتی رہتی تھی۔ اس کے نزدیک ایک عورت کے لیے اس سے دلچسپ کوئی اور پیشہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لیزا اپنے خوبصورت اور چمکدار جسم کی وجہ سے گاہکوں میں بہت مقبول تھی اور اس

لیزا کا تعلق فرانس سے تھا۔ وہ ایک عرصہ سے ماڈلنگ کے پیشہ سے وابستہ تھی۔ وہ دن میں کئی گھنٹے عمدہ اور دیدہ زیب لباس میں ملیوں مہمانوں اور گاہکوں کے سامنے اپنے متناسب جسم کی نمائش

کی وجہ سے موٹی، دبلی، لمبی، ٹھنکی، بوڑھی، غیر متناسب اور سیدھی سادی عورتیں لیزا کے خوبصورت جسم پر بچے ہوئے لباس سے متاثر ہو کر بخوشی زیادہ قیمت دے کر وہ لباس خرید لیتی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی شگفتگی تھی اور اس کے عنابی ہونٹوں کے کناروں پر مخصوص مسکراہٹ ہر وقت کھلتی رہتی تھی۔ اپنی بیگم کے ساتھ بیٹھا ہوا سینئر مارٹن بھی اس کی دلچسپ مسکراہٹ سے متاثر ہوا تھا۔

وہ ایک بڑی سی کرسی پر رعونت سے بیٹھا ہوا تھا اس کے برابر مادام مارٹن بیٹھی تھی۔ مادام بڑی مشکل سے اپنے شوہر کو اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہوئی تھی کیونکہ سینئر مارٹن ایک بہت ہی مصروف اور اہم شخصیت تھی۔ اس کے ذمے گھنٹوں ایک جگہ بیٹھ کر خواتین کے ملبوسات کی نمائش دیکھنے سے زیادہ اہم کام تھے۔ پھر بھلا ان عورتوں میں اس کے لیے کیا کشش ہو سکتی تھی۔ جو عورت اس کی زندگی کی ساتھی بن سکتی تھی وہ اس وقت بھی اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔

مادام مارٹن خوبصورت بالکل نہیں تھی۔ ہاں صحت مند اور متناسب جسم کی مالک ضرور تھی۔ یوں بھی سینئر نے مادام کی شکل و صورت سے شادی نہیں کی تھی بلکہ اس کا مقصد مادام کو ملنے والی فولاد کی فیکٹری اور اپنی نئی قائم شدہ کاروں کی فیکٹری کا انتظام تھا اور اس مقصد میں اسے خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ پھر مادام نے اسے ایک ایسا بیٹا دیا تھا جو کسی بھی کھلنڈرے رئیس سے کم نہ تھا اور جس کی مقبولیت روسا کی نوجوان اور حسین لڑکیوں میں عام تھی۔ پھر مادام نے ایک حسین و جمیل بیٹی کو جنم دیا تھا جس کی عمدہ پرورش اور رکھ رکھاؤ نے اسے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ ایک

شہزادے سے شادی کر سکے۔ سینئر کو اپنی اولاد پر بجا طور پر فخر تھا۔

اس کی شہرت اور خوشحالی کا راز اس شکر کے کارخانے اور ایک اخبار کی ملکیت میں بھی پنہاں تھا جس کا وہ اپنی کاروباری حکمت عملی کی وجہ سے مالک بن گیا تھا۔ اپنی ان ہی خوبیوں کی بنا پر وہ اپنے علاقے سے ایوان نمائندگان میں نمائندگی کے لیے منتخب ہوا تھا۔ گو وہ بچپن سال کا تھا لیکن اپنی چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ سے کسی جوان کنوارے سے کم نہ تھا۔ رہی جوانوں جیسی شوخی اور کھلنڈراپن تو عہدے اور منصب کی وجہ سے اس کی طبیعت میں سنجیدگی اور تہذیب کا عنصر کچھ زیادہ شامل ہو گیا تھا اور وہ کسی بھی نوجوان کے مقابلے میں بروقت فیصلہ کرنے میں زیادہ مہارت رکھتا تھا۔

جب گھر لوٹے ہوئے اس کی بیوی نے درزی کی دکان پر جانے کی خواہش ظاہر کی تو سینئر نے چہل قدمی کو صحت کے لیے مفید قرار دیتے ہوئے پیدل گھر جانے کی خواہش ظاہر کی اور اس کی بیوی تباہی درزی کی طرف چلی گئی اور وہ فیشن ہاؤس کی طرف پھر واپس آ گیا جہاں غالباً ابھی کچھ لوگ باقی تھے۔ وہ کوئی بیس منٹ تک ادھر ادھر ٹھہرتا رہا۔ آخر کار ادارے میں کام کرنے والی لڑکیاں دو دو اور تین تین کی ٹویوں میں گھر جانے کے لیے نکلنے لگیں۔ سینئر ایک دکان کے شوکیں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ باہر آنے والی ہر لڑکی کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ بالآخر لیزا اپنی ایک سہیلی کے ساتھ باہر نکلی۔

سینئر کو بخوبی احساس اور اپنی ذات پر اعتماد تھا کہ عمر زیادہ ہونے کے باوجود وہ اپنی وضع قطع اور ظاہری شان و شوکت سے ان لڑکیوں میں سے کسی کو بھی متاثر کر سکتا تھا۔

رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اکثر وہ بہت جلد دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر بہت گہری نیند سو جایا کرتا تھا۔

تین دن بعد اسے پرائیویٹ سراغ رساں نے لیزا کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کر دیں۔ اس کا نام لیزا رابرٹ ہے، پیرس کے نواح میں وہ اپنی بیوہ خالہ کے ساتھ دو کمروں کے ایک معمولی فلیٹ میں رہتی ہے۔ اس کا باپ جنگ عظیم کا زخمی ہیرو ہے۔ حکومت نے اس کی خدمات کے عوض اسے تباہی فروشی کا پرمٹ دے رکھا ہے۔ لیزا سادہ زندگی بسر کر رہی ہے لیکن اسے فلم بنی کا بے حد شوق ہے۔ انیس سال کی ہونے کے باوجود غالباً اب تک وہ کسی محبوب کے چکر میں نہیں پڑی تھی۔ اس کے پڑوسی اس کے لیے اچھی رائے رکھتے ہیں اور ماڈلنگ شوڈیو میں بھی اس کے ہم پیشہ اس کی خوش اخلاقی کے معترف ہیں۔ بحیثیت مجموعی ظاہر وہ ایک خوش اخلاق اور نیک سیرت اور سینئر کے نزدیک ایک ایسے شخص کی تہائیوں کے مداوے کے لیے لیزا بہترین ساتھی ثابت ہو سکتی تھی جسے ملک کی فکر اور "بڑے کاروبار" کے ہنگاموں نے گھیر رکھا ہو۔

یہاں یہ ذکر کچھ غیر ضروری ہو گا کہ سینئر نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور چونکہ ایک ذمہ دار اور مصروف شخصیت ہونے کی وجہ سے وہ بذات خود اس کام میں زیادہ وقت صرف نہ کر سکتا تھا اس لیے اس نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو اس کام پر معمور کر دیا جسے اب لوگوں کی رائے بدلنے کے کام میں خاصی مہارت ہو گئی تھی کیونکہ وہ اکثر سینئر کے احتیاطی امور کے سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ سیکرٹری نے بہت جلد لیزا کی خالہ سے رابطہ قائم کیا اور اسے قائل کیا کہ سینئر جیسے انسان دوست شخص کی دوستی لیزا

"آداب بجا لاتا ہوں۔" سینئر نے جیسے بلا سوچے سمجھے کوئی فیصلہ کیا اور بڑھ کر لیزا اور اس کی سہیلی کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ لیزا نے لا پرواہی سے سینئر کی طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھ گئی۔ اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ سینئر خاموشی سے ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ کچھ دور جا کر وہ دونوں ایک بس میں سوار ہو گئیں۔ سینئر نے اس ٹھوڑی سی دیر میں بہت کچھ اندازہ لگا لیا تھا مثلاً یہ کہ لڑکی غیر شادی شدہ ہے۔ اس کا کوئی محبوب بھی نہیں ہے۔ وہ غریب ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ حد درجہ خوددار۔ اسے اپنے حسین ہونے کا احساس ہے لیکن اس میں شرم و حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

سینئر کے دل میں کسی سوئے ہوئے احساس نے گدگدائی کی۔ ایک عرصہ سے وہ اس احساس سے بیگانہ تھا لیکن وہ اس احساس کو فوراً ہی پہچان گیا۔

"محبت! یہ یقیناً محبت ہی ہو سکتی ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ اسے توقع نہ تھی کہ یہ احساس اس کے دل میں پھر بھی زندہ ہو سکے گا۔ اس نے شانے اچکائے اور زیادہ اعتماد سے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کے دفتر پہنچا اور اس سے لیزا نامی ایک ماڈل گرل کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا۔ اور پھر جیسے اچانک اسے یاد آ گیا کہ اسی وقت سیٹیٹ میں امریکی قرضے سے متعلق بحث ہوئی تھی۔ اس نے ایک ٹیکسی روکائی اور ایوان نمائندگی کی عظیم الشان اور خوبصورت عمارت میں پہنچا۔ لفٹ کے ذریعے وہ بیسویں منزل پر پہنچا اور ایک بڑے سے دروازے سے ایک ہال میں داخل ہو گیا جس کے دروازے پر موٹے موٹے حروف میں "لائبریری" لکھا ہوا تھا۔ وہ سیدھا ایک کونے میں چلا گیا جہاں

کے لیے بہر طور سودمند ثابت ہوگی۔ اس کے علاوہ سیکرٹری کی دوراندیشی نے خالہ کے سامنے کچھ ایسے منصوبے بھی رکھے جن میں خالہ کو اپنی بھانجی کے مستقبل کے لیے بہت کشش دکھائی دی۔ ان منصوبوں میں فلم سازی بھی شامل تھی۔ سیکرٹری نے مادام کو بیٹے کی رات کھانے کی دعوت بھی دی تاکہ سینئر خود لیزا کی ”سکرین بیوٹی“ ہونے کے بارے میں تجزیہ کر سکیں۔

مادام نے جب لیزا کے سامنے یہ منصوبہ رکھا تو اس نے حقارت سے صرف اتنا کہا:

”اس ذلیل بڑھے کی یہ ہمت!“

”وہ بڑھا ذلیل ہی سہی لیکن اگر تمہیں اس ذلیل بڑھے کے ذریعے فلموں میں کام کرنے کا موقع مل جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟“

مادام نے لیزا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ پھر جیسے ہمت ہار کر بولی:

”خیر تمہاری مرضی..... لیکن اگر ایک بار چل کر اس کے ساتھ ڈنر کر لیا جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟“

”کس ہوٹل میں دعوت دی ہے؟“

”کیفے ڈی میڈرڈ میں۔“ سینئر بھلا اس سے کم درجے کے ہوٹل میں کہاں جاتا تھا۔ پھر ان مہمانوں کو بہر صورت متاثر بھی کرنا تھا۔

لیزا اپنے موتیوں جیسے خوبصورت دانتوں کی بھرپور نمائش کرتے ہوئے مسکرا دی۔ مادام بھی اس کی رضامندی جان کر مسکرا دی۔

کچھ دنوں بعد سینئر کا پرائیویٹ سیکرٹری انہیں لے کر کیفے ڈی میڈرڈ پہنچا جہاں سینئر ان کا پہلے سے منتظر تھا۔ اس کا رویہ معمول کے مطابق تھا۔ بالکل ایسا جیسے وہ اپنے دفتری کام کے سلسلہ میں دو معزز خواتین سے عوامی سطح پر ملاقات کر رہا ہو.....

وہ ڈنر خوبصورت باتوں سے شروع ہو کر کچھ زبانی عہد و بیان پر ختم ہوا اور پھر ایک ماہ بعد لیزا ایک نئے، خوبصورت اور آرام دہ فلیٹ میں منتقل ہو گئی جو اس کی ماڈلنگ کمپنی کے قریب تھا۔ سینئر کی خواہش تھی کہ لیزا اس ادارے میں اپنی ملازمت جاری رکھے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس طرح لیزا کا دماغ مصروف رہے گا کیونکہ وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ جس عورت کا کوئی کام نہیں ہوتا وہ پیسے خرچ کرنے میں بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتی ہے اور ایک عقل مند شخص کو بہر حال ان تمام پہلوؤں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔

فضول خرچی تو درکنار لیزا نے اب کفایت شعاری اور بچت کی عادت ڈال لی تھی۔ اس کے علاوہ سینئر کو اپنے ذریعے سے یہ معلومات بھی حاصل ہوتی رہتی تھیں کہ لیزا کے فلیٹ آنے جانے والوں میں صرف اس کی خالہ اور اس کے ساتھ کام کرنے والی چند ایک لڑکیاں تھیں۔

سینئر اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی اتنا خوش نہیں رہا تھا۔ اسے یہ سوچ کر سکون ملا تھا کہ اچھے کام کا بدل اس زمانے میں بھی اچھا ہی ملتا ہے کیونکہ جس روز وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس کے اصرار پر ماڈلنگ کمپنی گیا تھا تو اس کا مقصد محض اپنی بیوی کی خواہش پوری کرنا تھا اور بہر حال اس کی یہ نیکی اس کے کام آئی اور لیزا جیسی حسین و جمیل دوشیزہ سے اس کی ملاقات ہو گئی۔

اب وہ دن بدن لیزا کے قریب ہوتا جا رہا تھا کیونکہ وہ صرف خوبصورت ہی نہ تھی بلکہ ایک بہترین دوست اور اچھی ہمزائ بھی تھی۔ اس میں بڑی خوبیاں تھیں۔ سینئر بڑی بے تکلفی کے ساتھ اس سے ملکی صورتحال پر بھی بات چیت کر سکتا تھا۔ وہ اس کا خراب موڈ بہتر بنا سکتی تھی اور اس کے اچھے

”تم اسے اسی وقت گھر سے نکال دو۔“ پھر وہ غصہ سے نوجوان سے مخاطب ہوا ”تمہاری اتنی ہمت کیسے ہوئی کہ تم.....“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیونکر لیزا سے اپنے کسی رشتے کا اظہار کرے۔

نوجوان بڑے اطمینان سے بستر سے اٹھا۔ اس نے سینئر کا شب خوابی کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ سینئر آگ بگولا ہو رہا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ نوجوان نے اندر کے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کیا اور پھر بجلی کی سرعت کے ساتھ دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

”تمہارا دوست بالکل جاہل معلوم ہوتا ہے۔“ سینئر نے حقارت سے کہا۔

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے وہ تمہاری طرح مہذب نہیں۔“

”کیا وہ مجھ سے عقل مند ہے؟“

”نہیں بالکل نہیں!!“

”کیا دولت مند ہے؟“

”نہیں۔ وہ تو بیچارہ بالکل فقیر ہے۔“

”پھر تمہیں اس میں کیا نظر آ گیا؟“ سینئر غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

”وہ جوان ہے۔“

سینئر کا سر جھک گیا۔ اس کی ہلکوں کے کنارے بھیگ گئے اور ایک موٹا سا آنسو اس کے دائیں گال پر سے ہوتا ہوا زمین پر گر گیا۔ لیزا اسے رحم دلی سے دیکھ رہی تھی۔

”میرے دوست! اس دنیا میں انسان بیک وقت ہر چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔“

”مجھے معلوم تھا کہ میری عمر بہت زیادہ ہے لیکن میری حیثیت، میری عزت، میری دولت اور

موڈ پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتی تھی۔ سینئر کے دوست ان دنوں اس پر جملہ کتے نہ چوکتے تھے کہ سینئر کچھ دنوں سے بہت سرور اور کم عمر دکھائی دے رہا ہے۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو جوان محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے اپنی خوش قسمتی کا احساس تھا۔ وہ باوجود کوشش کے اس خیال سے انکار نہ کر سکتا تھا کہ ملکی ذمہ داریوں اور سخت محنت کے بعد چند لمحوں کی یہ خوشیاں اس کا حق ہیں۔

دو سال اسی سکون و اطمینان سے گزر گئے لیکن ایک صبح جب سینئر غیر متوقع طور پر اپنے کام سے دو دن پہلے ہی باہر سے لوٹ آیا تو اسے اپنی زندگی کا بدترین صدمہ پہنچا۔ سینئر لیزا کو اپنی غیر متوقع آمد سے حیرت میں ڈالنے کے ارادے سے چوری چھپے فلیٹ کی ڈپلیکیٹ چابی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جب اس نے لیزا کو شب خوابی کے لباس میں ایک وجہ نہ نوجوان کے برابر دراز دیکھا۔ لیزا اس کی غیر متوقع آمد سے کچھ پریشان ضرور ہوئی لیکن پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی:

”ارے کہاں آسمان سے ٹپک پڑے؟ مجھے تو اُمید تھی کہ تم دو دن بعد آؤ گے۔“

”کابینہ توڑ دی گئی ہے۔ مجھے نئی کابینہ میں شرکت کے لیے بلاوا آیا ہے..... وزارت داخلہ کی پیشکش کی گئی ہے۔“

وہ اس وقت یہ سب کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے نوجوان کی طرف غصہ سے دیکھا اور بولا:

”یہ نوجوان کون ہے؟“

”میرا محبوب۔“ لیزا نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”تم بکیتی ہو۔“ سینئر غصہ سے چیخ کر بولا۔

”کیا میری عمر ایسی نہیں کہ کوئی مجھے چاہے؟“

میری شخصیت نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کچھ عورتیں ایک مخصوص عمر کے مردوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ پھر اکثر اداکارائیں کسی بھی وزیر سفیر کی دوست بن کر رہنا پسند کرتی ہیں۔ میں تمہیں آئینہ دکھاؤں گا لیکن یاد رکھو کہ کل تک تم ایک معمولی ماڈل گرل تھیں اور آج عظیم الشان آبادی میں تم اس خوبصورت سے فلیٹ میں عیش کی زندگی بسر کر رہی ہو۔

بینیٹر نے حسب عادت تقریر جھاڑ دی۔
”میں غریب لیکن ایماندار والدین کی بیٹی ہوں۔ مجھے اپنی حیثیت پر کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے آئینہ دکھا کر بھی تمہیں کچھ حاصل نہ ہو گا۔“ لیزا کے لیے میں بلا کا اعتماد تھا۔

”کیا تم اس لڑکے سے محبت کرتی ہو؟“

”ہاں۔“

”مجھ سے نہیں؟“

”تم سے بھی کرتی ہوں..... میں تم دونوں سے محبت کرتی ہوں لیکن تمہارے لیے میرے دل میں کچھ اور محبت ہے۔ میں تمہیں اس لیے چاہتی ہوں کہ تم اچھے دوست ہو۔ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ ساتھی ہو۔ تمہاری گفتگو دلچسپ اور معلومات افزا ہوتی ہے لیکن اس نوجوان کو میں اس لیے چاہتی ہوں کہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں مجھے بہت پسند ہیں۔ اس کے ہنسنے والے سنبھلے بال کتنے شاندار ہیں اور پھر جب میں اس کے ساتھ رقص کرتی ہوں تو مجھے دنیا..... اور اپنا ہوش تک نہیں رہتا۔“ لیزا جذباتی انداز میں بولی۔

”لیزا! میں تمہیں اپنی نازک حیثیت اور عہدے کی وجہ سے رقص گاہوں میں ساتھ نہیں لے جا سکتا..... پھر جب وہ میری عمر کو پہنچے گا تو یقیناً جانو کہ اس کی کھوپڑی پر مجھ سے کم بال ہوں گے۔“

”یقیناً تمہاری باتیں صحیح ہیں۔“ لیزا نے اس سے اتفاق کیا مگر وہ ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہی تھی۔

”تمہاری خالہ کو جب معلوم ہوگا تو وہ کیا کہے گی؟“

”انہیں پہلے ہی سب کچھ معلوم ہے۔“

”تمہارے باپ نے وطن کی خدمت کرتے ہوئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور پھر ملک نے اسی کی خدمت کے عوض اسے تمباکو کی فروخت کا لائسنس جاری کیا۔ تم یہ مت بھولو کہ مجھے وزارت داخلہ ملنے والی ہے اور ایسے لائسنس کی منسوخی میرے دائرہ اختیار میں ہوگی۔“ بینیٹر نے اسے دوسرے پہلو سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”تم ایک شریف آدمی ہو۔“ لیزا نے بھی جیسے پہلے سے جواب سوچ کر رکھا تھا۔ ”اور ایک شریف آدمی سے مجھے کسی ذلیل حرکت کی توقع نہیں ہے۔“ ”گھبراؤ نہیں..... میں ایک بیوقوف لڑکی کے لاپاہلی پن کی وجہ سے اس کے باپ کو اس کی خدمات کے صلے سے محروم نہیں کروں گا۔“ پھر رفتہ رفتہ اس کا موڈ بہتر ہوتا گیا اور اس کا غصہ افسوس میں بدلتا گیا اور پھر اس نے ایک آخری حربہ استعمال کرنے کی کوشش کی یعنی کسی طرح لیزا کو ترس کھانے پر مجبور کیا۔

”میں اپنی مصروف ترین زندگی سے چند لمحات چرا کر یہاں آ جایا کرتا تھا اور یہ لمحات میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ کیا تمہیں ذرا بھی افسوس نہیں؟“

”یقیناً۔“

بینیٹر نے گہری سانس لی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے بڑے دھوکے کی مرتکب ہو سکتی ہو۔“

”یہ دھوکہ نہیں ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”مرد بھی



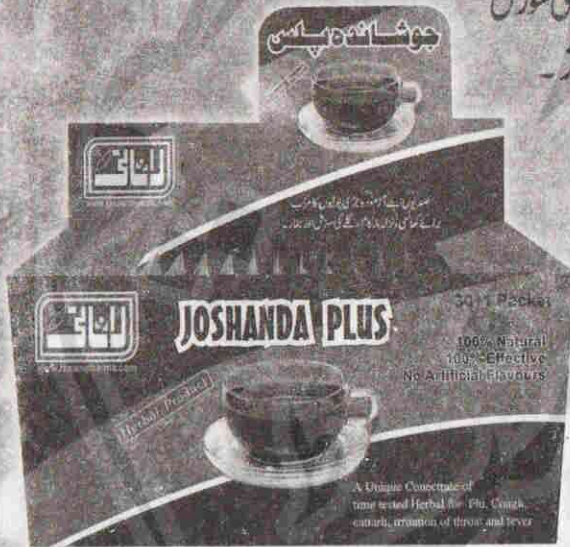
www.lashanipharma.com

م بھی لاشان معیار بھی لاشان

صدیوں سے آزمودہ جڑی بوٹیوں کا مرکب

جوشانڈہ پلس

کھانسی، نزلہ، زکام، گلے کی سوزش اور بخار کے لیے موثر۔



100% نیچرل
100% موثر

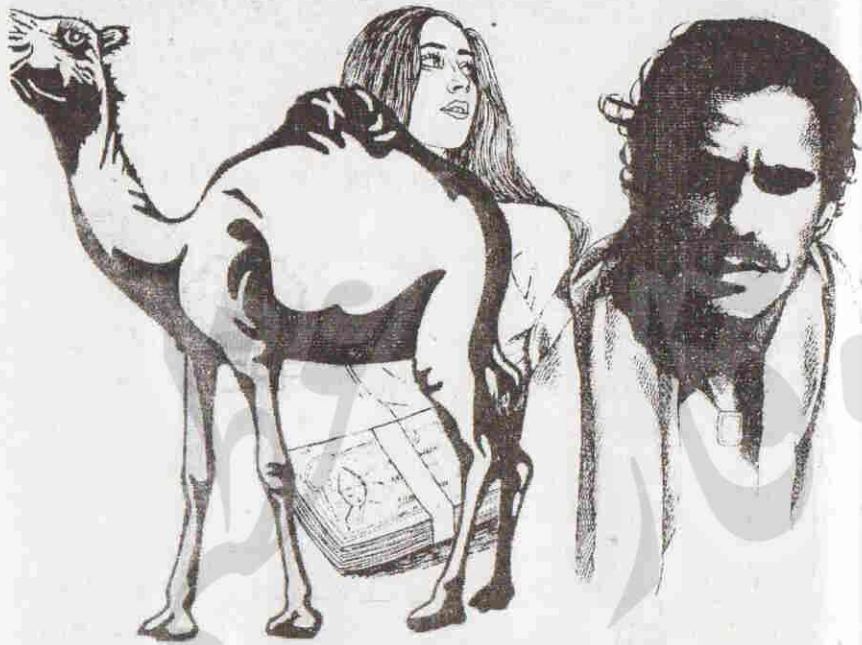
کے مصنوعی فلیور سے پاک

تمام دواؤں میں نیچرل کی صفائی سے دور رکھیں طبیعت زیادہ خراب ہو جانے سے بچیں۔

لاشان فارما سیٹ

لاہور، پاکستان، سوبال: 0321-0300-8448699

فیکس: 042-36581200-36581300-37024649



ان۔ اشک

ڈالچی

اس وقت باقر کے سامنے اپنی مرحومہ بیوی کا تصور آ گیا۔ اسکی آخری خواہش باقر کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اس نے محن میں کھیلتی ہوئی رضیہ پر ایک پیار بھری نظر ڈالی۔ اسکے لبوں پر ایک اُداس مسکراہٹ آ گئی۔ ساہا سال کی مشقت اور محنت کے بعد وہ اپنی طویل آرزو کو پورا کر سکا تھا۔ ڈالچی کی تکمیل اس کے ہاتھ میں تھی!

ایک محنت کش کا فسانہ وہ بیٹی کی خواہش پوری کرنے چلا تھا

چودھری کا چھٹا طویل قد، بھرا ہوا بدن اسے دیکھ کر غرور سے اُکڑ گیا۔ جسم کے اکڑنے سے اس کے گرتے کے بدن ٹوٹ گئے۔ موٹی کھدر کے کرتے سے اس کا کشادہ اور عریاں سینہ اور مضبوط شانے واضح نظر آنے لگے۔

باقر چلتا ہوا قریب آ گیا۔ اس کی مٹی دھول سے

تصہ پی سکندر کے باقر جاٹ کو اسے مولیشیوں کی طرف متنا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے چودھری مندو نے اپنی بلند آہنگ اور گونج دار آواز میں کہا،
”ابے ادھر کیا کر رہا ہے۔“ بڑے گھنے درخت کی آڑ سے باقر جاٹ کا وجود اس کے سامنے آ گیا۔

فریک کا فائدہ ہے تو وہ کسی صورت میں بھی انکار نہیں کرے گا۔ وہ ایک کہنی کا تجارتی نمائندہ ہے اور ہفتے میں صرف ایک دن یہاں گزارا کرے گا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر شادی کے انتظامات مکمل ہو گئے۔ اسی دوران سینئر کو کاہنہ میں رکنیت بھی حاصل ہو گئی اور اس طرح لیزا کی شادی میں ایک وزیر نے شرکت فرما کر اس تقریب کی رونق میں چار چاند لگا دیے۔ علاقے کے لوگ وزیر کی اس غریب نوازی سے متاثر ہوئے۔ شادی کی دعوت کیفے ڈی میڈرڈ میں دی گئی تھی۔ دو لہا کو تحفے کے طور پر بہت سی چیزیں ملی تھیں جن میں وزیر کی طرف سے ملی ہوئی سپورٹس کار سب سے قیمتی اور شاندار تھی جس کی آواز ایک فرلانگ دور ہی سے سنائی دیتی تھی۔

تیسرے ہی دن نوجوان جوڑا اپنی مون کے لیے روانہ ہو گیا۔ رخصت کرنے کے لیے آنے والے مہمانوں میں وزیر بھی شامل تھا۔ خالہ نے اپنی سعادت مند اور خوش نصیب بھانجی کو دعائیں دیں اور ساتھ ہی الوداعی بوسہ بھی دیا۔ اسی طرح وزیر نے بھی رسوم پوری کیں۔ جوں ہی وہ دہلیں کے قریب گیا اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دینے لگا۔ تو لیزا نے آہستہ سے کہا:
”پیر کو پانچ بجے ملاقات ہوگی۔“
”ضرور۔“ وزیر نے سرگوشی کی۔

جوڑے کے روانہ ہو جانے کے بعد وزیر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ایوان نمائندگان کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ملکی ذمہ داریاں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اب اسے اطمینان تھا کہ اس کی محبوبہ اس کی داشتہ کوئی معمولی ماڈل گرل نہیں بلکہ ایک شادی شدہ معزز خاتون تھی۔

کتنے عجیب ہوتے ہیں کہ وہ بیوقوف بنانا تو پسند کرتے ہیں لیکن بیوقوف بنایا جانا پسند نہیں کرتے۔ شاید اس لیے کہ وہ بہت سچی ہوتے ہیں۔ وہ بعض بہت ہی غیر اہم باتوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔
”خوب۔۔۔۔۔ میں گھر میں تمہیں ایک اجنبی کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں پاتا ہوں۔ کیا تمہارے نزدیک یہ ایک غیر اہم واقعہ ہے؟“
”اگر وہ میرا شوہر ہوتا اور تم میرے محبوب تو پھر شاید تمہارے نزدیک یہ ایک قدرتی فعل ہوتا۔“
”ظاہر ہے۔ اس وقت میں اس کے ساتھ دھوکہ کر رہا ہوتا لیکن میرا اپنا وقار محفوظ رہتا۔“
”تو پھر مختصراً یہ کہ مجھے اس سے شادی کر لینی چاہیے تاکہ حالات بالکل معمول کے مطابق ہو جائیں۔“

تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ پھر جیسے لیزا کی دورانہ لکشی اس پر اُجاگر ہو گئی۔ سینئر نے اس کی طرف دیکھا۔ لیزا کے لبوں پر وہی شوخ مسکراہٹ رقصاں تھی جس نے سینئر کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔

”یہ مت بھولو کہ اس ریاست کے سینٹ کے رکن کی حیثیت سے میں قدرتی طور پر ایک معزز درجے کا حامل ہوں۔“

”کیا تمہارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہے؟“

”قطعی نہیں۔“ سینئر کے دل میں جیسے ایک بار پھر لیزا کی محبت نے جوش مارا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے پوچھا ”کیا وہ تم سے شادی کرے گا؟“

”وہ مجھے دل و جان سے چاہتا ہے۔ پھر اگر میں اس سے یہ کہوں کہ اس میں مجھے دس لاکھ

رہی تھی۔ شہروں کے موشیوں کی منڈی میں جہاں درجنوں مل گئے ہوتے ہیں اور تمام دن چمڑکاؤ ہوتا رہتا ہے وہاں بھی مٹی گردوغبار کی کی نہیں ہوتی پھر یہ تو ریگستانی منڈی تھی، جہاں مٹی کا راج ہوتا ہے۔ گنے کی گندریوں پر، حلوئی کے طوے اور جلیبیوں پر، خانچہ والے کی دال پکڑوں پر، غنیکہ ہر جگہ مٹی ہی مٹی نظر آتی تھی۔ منکے کا پانی بھی نہر کا تھا لیکن یہاں پینے ہی یہ پانی بھی مٹی ہو گیا تھا۔ نندو کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں پورا پیالہ خالی کر دیا۔ اس نے باقر کو بھی پانی پینے کی دعوت دی۔ باقر جب پہنچا تو اسے شدید پیاس لگ رہی تھی لیکن اب اس نے ڈاچی خرید کر لی تھی تو اسے فرصت کہاں تھی کہ پانی پینے کے لیے رکتا۔ وہ رات ہونے سے قبل اپنے گاؤں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈاچی کی مہار پکڑ لی اور گردوغبار چیرتا ہوا گاؤں کی طرف چل دیا۔

باقر کے دل میں طویل عرصہ سے ایک جوان اور خوبصورت ڈاچی خریدنے کی آرزو تھی۔ وہ ذات کے لحاظ سے لوہار تھا۔ اس کے والد لوہار کا کام کرتے تھے لیکن اس نے اپنا خاندانی پیشہ ترک کر کے مزدوری اور محنت کے ذریعہ گزارا کرنے کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ مزدوری سے کافی کمایا کرتا تھا پھر نامعلوم کیوں وہ محنت سے گریز کرنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی بیوی پر کام کا بوجھ بڑھ گیا۔ کنبہ بڑا نہ تھا۔ ایک اس کی بیوی، دوسری اس کی معصوم چھ سالہ بیٹی رضیہ اور تیسرا وہ خود! تین افراد کے مختصر خاندان کا آسانی سے گزر بسر ہو جاتا تھا پھر وہ کس کے لیے خواہ وہ خود کو ہلکان کرے۔ باقر کا یہ اپنا خیال تھا لیکن قسمت نے اسے زیادہ عرصہ سکون اور چین کا سانس نہیں لینے دیا، اور اسے نیند سے بیدار کر کے اسے اپنی ذمہ داری محسوس کرنے پر مجبور کر

روپے بھی قیمت مانگتا تب بھی وہ اس ڈاچی کو ضرور خرید لیتا۔ قیمت، سودے بازی وغیرہ کا کام اسے بالکل نہیں آتا تھا۔ اس نے جلدی سے آٹھ سو روپے کے نوٹ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیے۔ ”مگن لو۔ اس سے زیادہ میں ایک پیسہ نہیں دوں گا۔“

نندو نے بے دلی سے نوٹ گنتا شروع کر دیے لیکن کتنی کھل ہوتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے باقر کو نالنے کے لیے ۸ سو روپے زیادہ ہی بتا دیئے تھے ورنہ مارکیٹ میں اس کی قیمت ۵ سو سے زائد نہ تھی۔ اس نے دل ہی دل میں مسرت کو دباتے ہوئے باقر پر احسان جتاتے ہوئے کہا ”ڈاچی تو ہزار روپیہ سے کم نہیں لیکن تیری حالت دیکھ کر دو سو روپیہ چھوڑ دیتا ہوں۔“

ایک لمحہ کے لیے نندو جیسے لالچی انسان کا دل بھی بھرا۔ یہ ڈاچی اس کے اپنے یہاں پیدا ہوئی تھی اور اس کے باڑے میں ہی پتی بڑھی تھی اور آج اس کو پال پوس کر جوان کر کے اسے دوسرے کے سپرد کر رہا تھا تو اس کی حالت ایسی ہی ہو گئی جیسے وہ اپنی بیٹی کو سسرال روانہ کر رہا ہے۔

اس نے آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا ”اس ڈاچی کی پرورش خصوصی طور پر کی گئی تھی کہیں اس کی مٹی خراب نہ کرنا۔“ یہ بات اس نے بالکل اس طرح کہی جیسے وہ اپنے داماد سے کہہ رہا ہو ”میری لاڈلی بیڑے لاڈ اور پیار سے پلی ہے۔ دیکھنا اسے کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچے دینا۔“

باقر نے مسرت بھرے لہجے سے کہا ”فکر نہ کریں۔ میں اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔“ نندو نے نوٹ مٹی میں سنبلالے، خشک گلے کو تر کرنے کے لیے منکے سے مٹی کے پیالے میں پانی بھر کر پیا۔ منڈی کے چاروں طرف دھول، مٹی اُڑ

باقر نے آہستہ سے سوال کیا ”یہ ڈاچی کس کے لیے ہے؟“

نندو نے ذرا ترشی سے کہا ”یہاں بیچنے کے لیے ہی لایا ہوں۔“

”تو پھر کتنے کی فروخت کر رہے ہو۔“

چودھری نندو نے ایک نظر باقر جاٹ کے سراپے پر ڈالی اور قہقہہ مار کر بولا ”تجھے چاہیے اپنے مالک کے لیے خرید کر رہا ہے۔“

باقر نے اس مرتبہ ذرا سختی سے کہا ”میں اپنے لیے خرید کر رہا ہوں۔“

نندو نے لا پرواہی سے گردن ہلا کر سوچا کہ اس مزدور کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے کہ ڈاچی خرید سکے۔ اس نے زور سے کہا ”تو کیا خریدے گا آگے بڑھ۔“

باقر کی جیب میں پڑے ہوئے ڈیڑھ ہزار روپیہ کے نوٹ باہر آنے کے لیے بے قرار ہو گئے۔ اس نے ذرا جوش سے کہا ”تمہارا اس سے کیا واسطہ کہ ڈاچی کون خرید کر رہا ہے۔ تم اپنی مرضی کے دام طلب کر سکتے ہو۔ دام بتاؤ؟“

چودھری نندو نے اس کے میلے کیلے کپڑوں اور گھٹنوں پر سے پھٹی ہوئی شلوار اور بادا آدم کے زمانے کے پرانے جوتے دیکھتے ہوئے اسے نالے والے انداز میں کہا ”جا۔ جا! جا کر کوئی ایسی دکان ڈاچی خرید کر لے۔ اس ڈاچی کے دام ۸ سو سے کم نہیں ہوں گے۔“

ایک لمحہ کے لیے باقر کے متھکے ہوئے جسم میں جان آگئی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں چودھری اس ڈاچی کی قیمت اس کی قیمت خریدے سے زائد نہ بتا دے لیکن اب جبکہ خود اس نے اپنی زبان سے ڈاچی کی قیمت ۸ سو بتا دی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ایک ہزار روپیہ کے نوٹ اس کے پاس تھے۔ اگر وہ ہزار

بھری ہوئی داڑھی شری مونچھوں کے اوپر گڑھوں میں لٹکھڑانے والی دونوں آنکھوں میں گھڑی بھر کے لیے چمک عود آئی۔ اس نے قدرے مسکرا کر کہا، ”چودھری! ڈاچی (عمدہ قسم کی اونٹنی) دیکھ رہا تھا۔ کتنی جوان اور خوبصورت ہے۔ دیکھتے ہی دل لپانے لگتا ہے۔“

اپنے موشی کی تعریف سن کر چودھری نندو کے اکڑتے ہوئے جسم میں کچھ پلک آگئی۔ خوش ہو کر کہنے لگا ”کون سی ڈاچی۔“

”وہ اس طرف سے چوتھی۔“ باقر نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بڑ کے گھنے درخت کے سائے میں آٹھ دس اونٹ بندھے ہوئے تھے۔ ان ہی میں وہ جوان ڈاچی اپنی لمبی خوبصورت اور سڈول گردن اٹھائے چوں پر منہ مار رہی تھی۔ چاروں طرف قد آور اونٹ، خوبصورت ڈاچی، کالی موٹی اور بے ڈول بھینسوں گائیوں کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔ گدھے بھی تھے مگر نہ ہونے کے برابر۔ زیادہ تر اونٹ ہی تھے۔ بھلول نگر کے گرد ونواح کے علاقہ میں اونٹوں کی تعداد بکثرت تھی، اونٹ کے بارے میں عام کہاوت ہے کہ یہ ریگستان کا جہاز ہے۔ اس گرم اور ریتلے علاقے میں آمد و رفت اور کھیتی باڑی کے لیے اونٹ ہی کام میں آتا ہے۔ پچھلے وقتوں میں جب گائے دس دس روپیہ میں اور تیل پندرہ پندرہ روپیہ میں مل جاتا تھا۔ اس وقت بھی یہاں اونٹ کی قیمت ۵۰ روپیہ سے کم نہ تھی۔ باقر کچھ اور آگے بڑھ آیا۔ ”چودھری! بچ کہتا ہوں کہ اس جیسی خوبصورت ڈاچی مجھے ساری منڈی میں نظر نہیں آئی۔“

بندوخشی سے بھول گیا ”یہ ایک ہی نہیں سب خوبصورت ہیں۔ میں ان کو موٹھ اور گوار کا چارہ ڈالتا ہوں۔“

گوٹھ ابھی کافی دور تھا۔ اس نے پیچھے پیچھے آنے والی خاموش خاموش ڈاچی کو پیار سے پچکارا اور اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ اس نے سوچا کہیں رضیہ اس کے پیچھے سے پہلے ہی سونہ جائے۔

اسے جلد ہی فاصلہ پر مال گودام نظر آنے لگا۔ یہاں سے باقر کا گوٹھ نزدیک ہی تھا۔ اس کی رفتار آہستہ ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی آرزوؤں کی دیوی اس کے دہن میں رنگ رنگی خوبصورت تصویریں بنانے لگی۔ باقر نے دیکھا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی معصوم رضیہ خوشی سے رقص کرتی دوڑتی اس کے پیروں سے آکر چٹ گئی۔ ڈاچی کو دیکھ کر اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں حیرت اور مسرت سے پھٹ گئی ہیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ ڈاچی پر رضیہ کو اپنے آگے بٹھا کر ڈاچی کو نہر کے کنارے کنارے دوڑا رہا ہے۔ شام کا وقت ہے، مست کن ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ کبھی کبھی کوئی جنگلی پرندہ اپنے بڑے بڑے پر پھیلائے اپنی بلند آواز کے ساتھ نہر پر پرواز کر رہا ہے۔ رضیہ کی خوشی اور مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے جیسے وہ ہوائی جہاز میں پرواز کر رہی تھی۔ پھر اس کی چشم تصور نے دیکھا وہ معصوم رضیہ کے ساتھ حائل مگر کی منڈی میں محوم رہا ہے۔ رضیہ حیرت کے ساتھ ہر طرف پھیلے ہوئے اتانج کے انبار۔ حیرت میں ڈالنے والی چیزیں اور دور تک کھڑی ہوئی بے شمار تیل گاڑیوں کو دیکھ رہی ہے۔ ایک دکان پر لکڑی کے ڈبے میں تصویریں ناچ رہی تھیں، گاڑی تھیں۔ ان ڈبوں میں بند ہو کر یہ لوگ کس طرح گا رہے ہیں، ناچ رہے ہیں، یہ تمام باتیں رضیہ کی عقل سے باہر تھیں۔ باقر اپنے خوابوں کے سنسار میں کھو کر مال گودام کے ساتھ آباد گوٹھ سے گزر رہا تھا کہ اچانک کسی خیال کی وجہ سے وہ رک گیا، گاؤں میں داخل ہو گیا۔ گاؤں زیادہ بڑا نہ

ہوئی کہ ایک روز اس کی بیوہ بہن کہنے لگی۔
”باقر! اب تو بالکل بدل گیا ہے۔ اس سے پیشتر تو کبھی اس قدر محنت نہیں کرتا تھا۔“

باقر نے ہنس کر کہا ”کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمام عمر تک ہو کر گزار دوں۔“
بہن نے کہا ”میں نے تمہا ہو کر بیٹھنے کے لیے تو نہیں کہا لیکن اپنی صحت تباہ کر کے دولت جمع کرنے کا مشورہ بھی نہ دوں گی۔“

اس وقت باقر کے سامنے اپنی مرحومہ بیوی کا تصور آ گیا۔ اس کی آخری خواہش باقر کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اس نے صحن میں کھلتی ہوئی رضیہ پر ایک پیار بھری نظر ڈالی۔ اس کے لبوں پر ایک اُداس اُداس مسکراہٹ آ گئی۔ مسلسل ساہا سال کی مشقت اور محنت کے بعد وہ اپنی طویل آرزو کو پورا کر سکا تھا۔ ڈاچی کی تکمیل اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ نہر کے کنارے کنارے آگے بڑھتا گیا۔

شام کا وقت تھا۔ مغرب میں غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں زمین کو اپنے سونے کا آخری نذرانہ پیش کر رہی تھیں۔ ہوا میں قدرے مستی آ گئی تھی اور کہیں دور کھیتوں پر پرندے قطار اندر قطار شور و غوغا کرتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ باقر کی آنکھوں کے سامنے ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے فلم کی مانند ابھرنے لگے۔ اِکاد کا کسان اپنے اونٹ پر سوار جانب منزل رواں تھے۔ کہیں کہیں کھیتوں سے آنے والے کسانوں کے لڑکے تیل گاڑی پر لدی ہوئی گھاس پر بیٹھے بیلوں کو پچکار رہے یا کوئی لوک گیت گاتے یا تیل گاڑی کے پیچھے آنے والے اونٹ کی تکمیل پکڑے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

باقر جیسے نیند سے چونک اٹھا۔ اس نے مغرب میں غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا اور پھر ویران ہوتے ہوئے ماحول پر نظر ڈالی۔ اس کا

اور مٹی سے بھرے ہوئے چہرے پر جھاکرتی ”ابا میرے لیے کیا لائے ہو۔“

جب وہ گود میں اٹھا کر اسے مٹھائی دیتا اور کبھی اس کی جھولی کو کھلونوں سے بھر دیتا۔ رضیہ ایک دم اس کی گود سے نکل کر کھلونے اور مٹھائی دکھانے کے لیے اپنی سمیلیوں میں بھاگ جاتی تھی۔ یہی گزیا جیسی لڑکی جب آٹھ سال کی ہوئی تو اس نے اشارہ کر کے اپنے باپ سے کہا ”بابا..... ہم کو ڈاچی چاہیے۔ مجھے ڈاچی لا کر دو۔“

جھولی بھالی معصوم لڑکی کو کیا خبر تھی کہ وہ ایک مفلس اور غریب مزدور کی بیٹی ہے جس کے لیے ڈاچی خرید کرنا تو ایک طرف اس کے حاصل کرنے کا خیال کرنا بھی گناہ تھا۔

بچکی مسکراہٹ کے ساتھ باقر نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ ”رانی بیٹی تو خود ڈاچی ہے۔“ لیکن رضیہ ضد کرتی رہی۔ دراصل اس روز منڈی کے موسیقیوں کا مالک اپنی ڈاچی پر اپنے سامنے اپنی بچی کو بٹھا کر گاؤں آیا تھا کہ گاؤں سے کچھ مزدور منڈی لے کر جائے۔ اسی وقت سے رضیہ کے معصوم دل میں ڈاچی پر سوار ہونے کی شدید خواہش نے جنم لیا تھا اور اسی روز کے بعد سے باقر کی رہی سہی لاپرواہی اور کالمی بھی ختم ہو گئی۔

اس نے اگرچہ رضیہ کو ٹال دیا مگر اس نے دل ہی دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہی ہو جائے وہ معصوم رضیہ کے لیے ایک خوبصورت ڈاچی ضرور خریدے گا اور اس روز سے اس علاقہ میں جہاں اس کی آمدنی ۲۰-۲۵ روپیہ بھی نہ تھی اس کی روزانہ آمدنی ۵۰-۶۰ روپیہ ہو گئی۔ اب وہ کمانے کے لیے اور دوشہروں میں بھی جانے لگا جہاں اس کی آمدنی روزانہ سو روپیہ سے کم نہ تھی۔ وہ روزانہ ساتھ ستر روپیہ کی بچت کرنے لگا۔ اسے کمائی سے ایسی دلچسپی

دیا اور اس پر یہ بات آشکار کر دی کہ زندگی صرف سکھ اور آرام کا نام نہیں ہے۔ اس میں دکھ بھی ہیں اور اس دکھ کو دور کرنے کے لیے انسان کو محنت مزدوری بھی کرنا پڑتی ہے۔

پانچ سال بیت گئے جب اس کی جھاکش اور محبوب بیوی اپنے پیچھے ایک گزیا جیسی خوبصورت بچی کو چھوڑ کر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئی تھی۔ مرتے وقت اس نے اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو اپنی ادا میں اور سفید سفید آنکھوں میں جمع کر کے باقر سے کہا تھا ”میری معصوم رضیہ اب تمہارے حوالے ہے۔ اسے کسی بھی طرح کا دکھ نہیں پہنچنے دینا۔“ اس جملہ نے باقر کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔ اپنی مرحومہ بیوی کے چہلم کے بعد وہ اپنی بیوہ بہن کو گوٹھ سے اپنے گھر لے آیا اور اپنی مرحومہ بیوی کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لیے تمام سستی اور لاپرواہی چھوڑ کر جی جان کے ساتھ محنت مزدوری میں لگ گیا۔ اگرچہ رشتہ داروں نے اس پر زور بھی دیا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ شرعی لحاظ سے بھی اس کو اختیار تھا کہ وہ دوسری شادی کر لیتا لیکن یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ خود کو ایک ایسی بیوی کی روح کے سامنے شرمندہ کرتا جس سے وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں کے ساتھ محبت کرتا تھا۔ وہ ایسی محنتی، جھاکش اور وفا شعار بیوی کو کس طرح فراموش کر دیتا جس نے زندگی بھر اُسے سکھ، چین اور سکون آرام سے نوازا تھا۔ وہ دن رات محنت اور مشقت کر کے کام کرنے لگا تا کہ مرحومہ بیوی کی امانت اور اپنی گزیا جیسی معصوم بچی کو اس کی آرزو اور خواہشات کے مطابق طرح طرح کی چیزیں لا کر دے سکے۔ وہ جب بھی منتری سے واپس گھر آتا تھا تو رضیہ دوڑتی ہوئی آتی اور اس کے پیروں سے پٹ جاتی اور اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں اس کے دھول

تھا۔ اس علاقہ میں تمام گاؤں ایسے ہی تھے، بڑے سے بڑا گاؤں زیادہ سے زیادہ ۳۰-۴۰ جھوپڑیوں پر مشتمل تھا۔ اس علاقہ میں ابھی پختہ اینٹوں کا رواج نہ تھا۔ گھر کیا تھے چٹائیوں اور تنکوں کی جھوپڑیاں تھیں۔ یہ بستی بھی ۲۰-۲۵ گھروں کی تھی۔ صرف مال گودام کے مالک کا مکان پکی اینٹوں کا تھا اور اس کی چھت بھی پختہ اینٹوں کی تھی۔ باقر نانک بننے کے گھر پر آکر رک گیا۔ اس نے منڈی میں جانے سے پیشتر نانک کو ڈاچی کی کجاوا بنانے کے لیے کہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر گھر پہنچتے ہی رضیہ نے ڈاچی پر سواری کے لیے ضد کی تو اسے کون انکار کرے گا۔ اس نے دروازے پر دستک دے کر نانک کو آواز دی۔ اندر سے شاید اس کی بیوی نے جواب دیا۔

”گھر پر نہیں ہیں۔ منڈی گئے ہیں۔“
باقر کی خوشی قدرے کم ہو گئی۔ اب وہ کیا کرے۔ نانک اگر منڈی گیا ہے تو اس نے کجاوا تیار کروایا ہوگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید اس نے بنوا کر گھر میں رکھ لیا ہوگا۔ اس نے پھر پوچھا۔
”میں نے کجاوا تیار کرنے کے لیے کہا تھا، کیا تیار ہو گیا ہے؟“

جواب ملا ”ہم کو معلوم نہیں ہے۔“
باقر کی خوشی کا فور ہو گئی۔ کجاوے کے بغیر وہ ڈاچی کو گھر لے جا کر کیا کرے گا۔ نانک مل جاتا تو اس سے کوئی پرانا کجاوا ہی اُدھار لے جاتا۔ یہ سوچ کر وہ مال گودام کے زمیندار کی طرف چل دیا۔ اس کے پاس تو کتنے ہی اونٹ ہیں یقینی طور پر ایک کجاوا ضرور مل جائے گا۔ عارضی طور پر اس سے کام چل جائے گا بعد میں نانک سے نیا کجاوا تیار کرالوں گا۔ وہ مال گودام کے مالک کے گھر پہنچا۔ مال گودام کے مالک نے گودام میں بہت سے مویشی جمع کر رکھے تھے۔ جب سے اس علاقہ میں نہر آئی تھی اس وقت

سے مالک گودام نے بہت سی زمین کو ڈیوں کے مول خرید کر لی تھی۔ آمدنی کا کوئی شمار نہ تھا۔ نہایت عیش سے زندگی گزار رہا تھا اس وقت وہ نہایت اطمینان کے ساتھ بیٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے سر پر سفید صافہ، گلے میں سفید صدری اور سفید دودھ جیسی شلوار پہنے ہوئے تھا۔ اس نے دھول اور مٹی سے اٹے ہوئے باقر کو ڈاچی کی ٹکیل پکڑے اپنی سمت آتے ہوئے دیکھا تو دور ہی سے پوچھا ”ارے باقر کہاں سے چلا آ رہا ہے؟“

باقر نے سر جھکا کر مال گودام کے مالک کو سلام کیا۔
”مالک منڈی سے آ رہا ہوں۔“
”یہ ڈاچی کس کی ہے؟“
”مالک میری ہے۔ ابھی ابھی منڈی سے خرید کر لا رہا ہوں۔“

”کتنے میں خریدی؟“
باقر نے سوچا کہ وہ اس کی قیمت ہزار روپیہ بتائے۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی خوبصورت ڈاچی تو ایک ہزار روپیہ میں بھی سستی ہے لیکن دل نے کہا نہیں جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔
”حضور مانگے تو ایک ہزار روپیہ تھے مگر میں نے آٹھ سو روپیہ میں خرید کر لی۔“

مال گودام کے مالک نے ایک گہری نظر ڈاچی پر ڈالی۔ وہ خود کافی دنوں سے اسی سوچ میں تھا کہ سیر کے لیے ایک خوبصورت ڈاچی خرید لے۔ اس کے پاس ایک خوبصورت ڈاچی تھی مگر گزشتہ سال بیماری کے بعد اس کی چال میں یہ مستی اور یہ چمک نہ تھی جو اس ڈاچی میں تھی۔ یہ ڈاچی اس کی نظروں میں سا گئی۔ کتنا سڈول اور کتنا بھرا ہوا جسم ہے۔ کسی سفید اور کسی دل بھانے والی ڈاچی ہے۔ بھورا بھورا رنگ، لمبی گردن اور بڑی بڑی آنکھیں۔

”مجھے ایک ڈاچی کی پہلے ہی سے ضرورت تھی،

برطانیہ کے نامور فنانہ طراز فلسفی بریٹنڈرسل کے نوادر خانے سے ایک پری جمال، خوش خصال، گل فام، نازک اندام، سرکش حسینہ کی داستان وہ ایک پادری کی بیٹی تھی اور اس نے شادی کے لیے ایک شخص منتخب کر لیا تھا

جھونپڑیوں پر مشتمل تھا، اور ہاں، اس میں پرانے وقتوں کی بنی ہوئی ایک حویلی بھی تھی۔ اس زمانے میں، اب اس واسطے کو کوئی پچاس برس ہو چکے ہیں، باہر کی دنیا سے اس گاؤں کا واحد رابطہ ایک بس تھی، جو ہفتے میں تین بار کوکومب پاروا تک جاتی تھی جو کہ قدرے بڑا گاؤں تھا کیونکہ اس میں ایک ریلوے سٹیشن بھی تھا۔ کہا جاتا تھا کہ خدا کے فضل سے لمبی عمر پانے والے حضرات اس سٹیشن سے گاڑی پکڑ کر لیور پول اسٹریٹ پہنچنے کی امید کر سکتے ہیں۔

پنی لوپ کو لکھان آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھی اور اپنے چھوٹے سے کمرے میں بید کی غیر آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”آہ، میں اکتا گئی ہوں، اکتا گئی ہوں، اکتا گئی ہوں۔“ اس نے گہری سانس لے کر بلند آواز میں کہا۔

ماننا چاہیے کہ اسے اکتانا ہی چاہیے تھا۔ اس کا باپ اسٹولک کے ایک دور دراز حلقے میکنا کوکومب کا پادری تھا۔ یہ گاؤں ایک گرجا، پادری کے گھر، ڈاک خانے اور ایک شراب خانے کے علاوہ دس



ابے نورو۔“

نوکر باڑے میں بیٹھا بھینسوں کے لیے دان تیار کر رہا تھا۔ مالک کی آواز سنتے ہی دوڑا دوڑا آیا۔ مالک نے اسے دیکھتے ہی کہا ”یہ ڈاچی لے جا کر باندھ دے، آٹھ سو روپیہ میں لی ہے، کیسی ہے؟“

نورو نے حیرت زدہ باقر کے ہاتھ سے لی۔ سر سے پیر تک ڈاچی پر ایک نظر ڈالی اور کہا ”بے شک جانور تو شاندار ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ڈاچی کو باڑے کی طرف لے کر چلا گیا۔

تب مال گودام کے مالک نے گاٹھ سے ۵۰۰ روپے کے نوٹ نکال کر باقر کے ہاتھ میں تھما دیئے اور کہا ”یہ پیسے تو رکھ لے، باقی تین سو روپیہ بھی ایک دو ماہ میں پہنچا دوں گا۔ ہو سکا تو شاید اس سے پہلے ہی انتظام کر دوں۔“ یہ کہہ کر وہ خود بھی نورو کے پیچھے باڑے کی طرف چلا گیا اور جیج کر کہا،

”اوئے نورو۔ بھینسوں کو چھوڑ، اب ڈاچی کے لیے گوار کا چارہ تیار کر۔ بھوکی نظر آتی ہے۔“ اور قریب جا کر ڈاچی کی گردن پر ہاتھ پھرنے لگا۔ چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ ویرانے میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ آسمان پر تارے جھانک رہے تھے۔ بول اور بڑ کے طویل درخت سیاہ کالے دیو کی مانند کھڑے تھے۔ باقر ۵۰۰ روپیہ کے نوٹ اپنے ہاتھ میں تھامے اپنے گھر سے کچھ دور ایک درخت کی آڑ میں بیٹھا تھا۔ وہ اپنے گھر کے صحن میں آگے ہوئے درخت کی شاخوں سے ٹٹماتے ہوئے تاروں کی روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی رضیہ کو نیند نہیں آئی ہوگی اور وہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ چاہتا تھا کہ تاروں کی یہ روشنی اوجھل ہو جائے۔ رضیہ سو جائے تو وہ خاموشی کے ساتھ چپ چاپ اپنے گھر میں داخل ہو جائے۔

غزل

تہا بیٹھی سوچ رہی ہوں
یادوں کے درکھول چکی ہوں
مجھ سے بچپن بچھڑ گیا ہے
میں بھی اس سے بچھڑ گئی ہوں
خود کو سوچا تو یہ جانا
خود سے برسوں بعد ملی ہوں
رستے ایک ہزار ہیں مجھ میں
تو سمجھا ہے بندگی ہوں
اس کے ہاتھوں سے جو ٹوٹا
میں اس ہار کی ایک لڑی ہوں
جو وہ خود بھی دیکھ نہ پائے
ان آنکھوں کی ہی میں ہی ہوں
جس کو شاعر کہہ نہ پائیں
ایسی ایک غزل میں بھی ہوں
میرا خواب سہانا وہ ہے
جس کی آگ میں جلنے لگی ہوں
روز بدل جاتی ہوں کنول میں
لوگ کہیں پارے سے بنی ہوں
(یاسمین کنول، پسرور)

چل میرے سے آٹھ سو روپیہ لے، دس روپیہ تیری محنت کے۔“

باقر نے پھسکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”حضور ابھی تو میری آرزو بھی پوری نہیں ہوئی ہے۔“

مال گودام کا مالک آٹھ کر گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا کہ کیا خوبصورت جانور ہے لیکن اس نے ظاہری طور پر کہا۔

”ٹھیک ہے، سودا ہو گیا۔ پانچ روپیہ زیادہ لے لیتا۔“ پھر اس نے نوکر کو آواز دی۔ ”نورو،

کاٹنا عذاب ہو جائے گا۔ آپ کی نوازش ہوگی، اگر آپ اپنی لوپ کو کار میں میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں۔“

پادری کچھ ہچکچایا مگر چند اور چینی چڑی باتوں سے اجازت لے لی گئی۔ آخر وہ دن آ پہنچا، اپنی لوپ کی خوش سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔

”تمہارا باپ.....“ مسز مین ٹیٹھ نے کہا ”ایک بوڑھی بلا ہے، مگر تم دیکھتی جاؤ، میں تمہیں اس اذیت سے نجات دلا کر رہوں گی۔ لپوچ بچتے ہی تمہیں سر سے لے کر پیر تک بہترین لباس پہناؤں گی، ڈھنگ سے تمہارے بال بنواؤں گی۔ تم خود حیران رہ جاؤ گی۔“

ایسا ہی ہوا۔ اپنی لوپ نے اپنی تراش خراش سے مسز مین ٹیٹھ کو مطمئن پایا تو آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ”کیا یہ واقعی میں ہوں؟“ نوآموز پندار کی چمک اسے خیرہ کیے دے رہی تھی۔ نت نئے جذبے تھے کہ امنڈتے چلے آ رہے تھے۔ نئے خواب پا کر اس نے فیصلہ کیا کہ ماضی کی بے روح اور پر مشقت زندگی سے ہر قیمت پر چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ مگر کیسے؟ یہ ایک بڑا سوالیہ نشان تھا۔

ابھی وہ انہی خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ مسز مین ٹیٹھ اسے لے کر بال بنوانے کے لیے آرائش خانے کی طرف چل دی۔ اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے اپنی لوپ کی نظر اخبار پر پڑی۔ ”مسز مین ٹیٹھ!“ وہ بولی ”آپ میرے لیے اتنا کچھ کر رہی ہیں کہ اب کچھ اور کہتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے۔ خوب صورت نظر آنے کا کیا فائدہ، اگر مجھے کوئی دیکھنے والا ہی نہیں، کوکومب میکنا میں تو سال سال بھر کوئی نوجوان نظر نہیں آتا۔ کیا آپ مجھے اخبار میں اشتہار کے لیے اپنی حویلی کا پتا استعمال کرنے کی

امریکہ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا شوہر مشرقی انگلینڈ کی دلدلوں سے تنگ آ کر سیلون چلا گیا۔ مسز مین ٹیٹھ اپنے بچوں کی تعلیم اور حویلی کو کرائے پر چڑھانے کے لیے سیلون سے واپس آئی تھی۔ یہ زندہ دل، خوش لباس اور دنیا دار سی خاتون پادری کو کیسے پسند آتی، مگر حویلی والے گرجا گھر کو سب سے زیادہ چندہ دیتے تھے چنانچہ اس نے تذکرہ اولیا سے اس مفہوم کا ایک جملہ ڈھونڈ نکالا کہ مالدار لوگوں کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔ یوں اپنی لوپ کو اس شاندار خاتون سے میل جول کی اجازت مل گئی۔

اپنی لوپ کمرے میں بیٹھی اپنی بوریٹ پر آہیں بھر رہی تھی کہ گھر کی کنڈی بج اٹھی۔ دروازے پر مسز مین ٹیٹھ کھڑی تھی۔ ہمدردی کے دو بول سن کر اپنی لوپ نے حویلی کی مالکن کے سامنے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔ مسز مین ٹیٹھ بہت متاثر ہوئی۔ لڑکی کو گھاگ نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ ان تمام امکانات کو پاگئی جو اپنی لوپ چھوڑ، پورے حلقے میں کبھی کسی کے ذہن میں نہیں آئے تھے۔

”میری پیاری! کیا تمہیں احساس ہے کہ تھوڑی سی کوشش سے تم ایک تو بہ شکن حسینہ بن سکتی ہو۔“

”چھوڑیے مسز مین ٹیٹھ! آپ تو مذاق کرنے لگیں۔“

”ارے نہیں، مذاق نہیں، اگر ہم کسی طرح تمہارے والد پر قابو پالیں تو میں یہ ثابت کر دوں گی۔“

تھوڑی سی گفتگو میں سارا منصوبہ تیار ہو گیا۔ اسی اثناء میں مسٹر کوکلبان یعنی پادری صاحب آن پہنچے۔ انہیں دیکھتے ہی مسز مین ٹیٹھ بولی ”مسٹر کوکلبان! کیا آپ کچھ دن کے لیے اپنی بیٹی کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے سکتے ہیں؟ مجھے لپوچ میں ڈھیر سارے کام نمٹانے ہیں، اگر میں اکیلی گئی تو وقت

ہے۔ ماں کی موت کے کچھ عرصے بعد میکنا کوکومب میں سفری سرکس آیا۔ اس نے باپ سے سرکس دیکھنے کی اجازت چاہی، فوراً ہی جواب آیا، ”وہ جو برائی سے مسرت حاصل کرتے ہیں، عذاب شدید کے مستحق ٹھہریں گے، اور برائی سے دامن بچانے والوں کے لیے اجر عظیم ہے۔“ ایک مرتبہ خبر آؤ گئی کہ اپنی لوپ نے راستہ پوچھنے والے ایک سائیکل سوار سے بات کی تھی۔ اس کے باپ کو شدید صدمہ ہوا۔ ”جو لڑکی دلیر ہو جائے وہ اپنے باپ اور شوہر دونوں کو رسوا کرتی ہے، اور وہ دونوں اس پر لعنت بھیجیں گے۔“ اپنی لوپ نے احتجاج کیا کہ اس کی گفتگو نہایت بے ضرر تھی۔ جواب ملا کہ اگر وہ اپنے طور طریقے ٹھیک نہیں کرے گی تو گاؤں میں اس کے تنہا ٹھکنے پر پابندی لگا دی جائے گی، اور ساتھ ہی تذکرہ اولیا سے حوالہ ”اگر لڑکی حیا کا دامن چھوڑ بیٹھے تو اس پر سختی کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی عصمت پر داغ لگا بیٹھے۔“

موسیقی کی شوقین اپنی لوپ گھر میں ایک پیانو رکھنا چاہتی تھی، مگر پادری صاحب نے تذکرہ اولیا کے حوالے سے اسے ہول و لعب قرار دیا ”موسیقی اور شراب دل بھاتے ہیں، مگر علم کی محبت ان سے بڑھیا چیز ہے۔“ وہ ہر وقت یہ ذکر کرتا رہتا کہ بیٹی کی فکر اسے کھائے جا رہی ہے۔ وہ کہتا ”بیٹی کی فکر باپ کی نیندیں اڑا دیتی ہے، مگر کسی کو خبر نہیں ہوتی..... عورت پر برائی اس طرح آتی ہے جیسے بند کپڑوں میں کیڑا۔“

ماں کی موت کے بعد، پانچ برس تک یہ اذیت سہتے رہنے سے اس کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ آخر جب وہ بیس برس کی ہوئی تو اس زندان میں ایک چھوٹا سا روزن کھلا۔ گاؤں کی حویلی برسوں سے خالی پڑی تھی۔ اب حویلی کی مالکہ مسز مین ٹیٹھ آ کر اس میں آباد ہو گئی۔ مسز مین ٹیٹھ

اپنی لوپ کا باپ کوئی پانچ برس پہلے رٹوا ہوا چکا تھا۔ اس قسم کی جنس آج کل کم ہی دیکھنے میں آتی ہے، چھوٹے سے گرجا کے کٹر پادری کو ہر قسم کی تفریح سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی بیوی ایک مثالی عورت ہے، اطاعت گزار، صابر اور حلقے والوں کی ان تھک مدد کرنے والی۔ اپنی لوپ سے بھی اسے یہی توقع تھی کہ وہ آنکھیں بند کر کے اپنی بہتی ماں کے نقش قدم پر چلتی رہے گی۔ نجات کی کوئی صورت نہ پا کر وہ بے چاری اپنی پوری کوشش کرتی تھی۔ ہر ہتھیار پر گرجا گھر کو سہانی، ماؤں کی عبادت کا اہتمام کرتی، بوڑھی عورتوں کی عیادت کو جاتی، گرجا گھر کی دیکھ بھال کرنے والے کو اپنا کام نہ کرنے پر جھڑپلاتی، مسرت کی ایک رمت بھی اس کی زندگی میں داخل نہ ہو پاتی۔ پادری صاحب عورتوں کا بناؤ سنگھار ناپسند فرماتے تھے، چنانچہ وہ اولی جرابیں اور سادہ سا کوٹ پہنہ رہتی۔ یہ کوٹ کبھی نیا ہوگا مگر اب خستہ ہو رہا تھا۔ وہ بال خوب کس کے باندھتی۔ زیور وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا، کیونکہ اس کے باپ کی رائے میں یہ چیزیں سیدھی دوزخ کے دروازے کی طرف لے جاتی تھیں۔ صبح کے وقت دو گھنٹے کے لیے ایک عورت گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی، مگر کھانا پکانا اور گھر کا دوسرا کام اسے خود کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ حلقے میں وہ سارے کام بھی اسے ہی کرنے پڑتے جو عام طور پر پادری کی بیوی کرتی ہے۔

اس نے کئی بار آزادی حاصل کرنے کی نجیف سی کوشش کی مگر سب لاجواب۔ اس کا باپ کسی نہ کسی مذہبی کتاب کا حوالہ دے کر ثابت کرتا کہ اس کی خواہشات ناپاک ہیں۔ وہ خاص طور پر تذکرہ اولیا کا بڑا مداح تھا۔ گو وہ اسی سانس میں یہ تصریح بھی کرتا کہ اس کتاب کا ایمان اور عقیدے سے کوئی تعلق نہیں البتہ تزکیہ نفس کے لیے یہ ایک مفید تصنیف

اجازت دے سکتی ہیں تاکہ وہاں مناسب امیدواروں سے ملاقات کی جاسکے۔“

مسز مین ٹیٹھ کو اب اس کھیل میں لطف آ رہا تھا، وہ رضامند ہو گئی، چنانچہ دونوں نے مل کر یہ اشتہار تیار کیا:

نوجوان خاتون، بے حد حسین، بے داغ عصمت، دیہاتی علاقے میں پرورش، شادی کے خواہش مند نوجوان رابطہ کریں۔ امیدوار اپنی ایک تصویر ساتھ بھیجیں۔ موزوں امیدوار کو جواب میں خاتون کی تصویر ارسال کی جائے گی۔ نوٹ: پادری حضرات رابطے کی زحمت نہ کریں۔ رابطہ: مس پٹی، مینور ہاؤس کوٹنگومبیکنا۔

اشتہار روانہ کر کے آرائش خانے کی باری آئی، پھر مکمل سچ دج سے تصویر اُتروائی گئی۔ یوں غزہ وادہ کا یہ عارضی خواب ختم ہو گیا۔ شاندار کپڑے اُتار دیئے گئے۔ شانوں پر بھرے بال پھر سے کس کر باندھ دیئے گئے۔ مسز مین ٹیٹھ یہ کپڑے اس وعدے کے ساتھ حویلی گئی کہ چینی لوپ امیدواروں سے ملاقات کے دوران انہیں پہن سکے گی۔

گھر پہنچ کر چینی لوپ نے چہرے پر اکتاہٹ طاری کر لی اور اپنے باپ کو بتایا کہ وکیلوں اور جائیداد کی خرید و فروخت کرنے والوں کے ہاں دھکے کھا کھا کر وہ بالکل اکتاہٹ گئی تھی۔

”چینی لوپ! تم مسز مین ٹیٹھ کی مدد کر رہی تھیں، اور نیک لوگ کسی کی مدد کرتے ہوئے اکتایا نہیں کرتے۔“ پادری نے تنبیہ کی، جسے چینی لوپ نے مناسب مسکینی سے تسلیم کیا اور پورے صبر سے اشتہار کے جواب میں آنے والے خطوط کا انتظار کرنے لگی۔

چینی لوپ کے اشتہار کے جواب میں طرح طرح کے خطوط آئے: کچھ مخلصانہ، کچھ مزاحیہ، کچھ

ٹیٹھ کا جانے والا تھا اور حویلی میں اتفاق سے ان سے ملاقات ہو گئی تھی۔ قدرتی طور پر اس کا باپ بن تنخواہ کے کام کرنے والی ملازمہ ہاتھ سے جانی دیکھ کر پریشان ہوا مگر مسز مین ٹیٹھ نے پوری طرح چینی لوپ کا ساتھ دیا۔ اس نے قلب کی مثالی پارسائی کی زوردار تعریفیں کیں اور مستقبل میں پادری کے طور پر اس کی ترقی کے خوش آئند امکانات پر روشنی ڈالی۔ آخر بوڑھا پادری ہچکچاتے ہوئے نیکی کے اس مجسمے سے ملاقات پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے اپنی تسلی ہونے کی صورت میں ان کی معافی پر بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ بیچارہ چینی لوپ کی حالت قابل دید تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ قلب کوئی غلطی کر بیٹھے گا جس سے سارا پول کھل جائے گا۔ جب ہر کام منصوبے کے عین مطابق ختم ہو گیا تو اس کی خوشی اور حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ نوجوان نے نہ صرف اس حلقے کا ذکر کیا جہاں وہ نائب پادری تھا بلکہ اپنے پادری کا نام بھی بتایا۔ اس نے خاندانی روایت کو زندہ رکھنے کے لیے اس شعبے کا انتخاب کیا کیونکہ خاندان میں موجودہ پادری کی عمر نوے برس سے بھی زیادہ تھی۔ اس نے اس مقدس پیشے کی اہمیت اور اس کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کے عزم کا بھی اظہار کیا۔ چینی لوپ کو اس جہاں آنے لگیں مگر وہ یہ دیکھ کر خوش تھی کہ اس کے باپ کی پسندیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب قلب نے تذکرہ اولیا میں سے حوالے دیئے تو بڑے میاں گویا ریوڑ عظمیٰ ہی ہو گئے۔ اس ملاقات کے خوش اسلوبی سے ختم ہونے کا نتیجہ تھا کہ چند ہفتوں میں ان کی شادی ہو گئی۔ ماہِ غسل کے لیے پیرس کا انتخاب کیا گیا، کیونکہ چینی لوپ دیہی علاقوں سے تھک آ چکی تھی۔ اس کی رائے میں قدرتی مناظر کی بجائے شہروں کی گہما گہما زیادہ مسرت انگیز تھی۔ ماہِ غسل ایک طویل اور خوشگوار خواب کی طرح

حویلی کی شان و شوکت اور کھانے کی میز پر مسز مین ٹیٹھ کی موجودگی نے چینی لوپ کی سماجی حیثیت اور احترام کا ایک خوشگوار تاثر چھوڑا۔ کھانے کے بعد ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے لیے دونوں کو اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ قلب کا خیال تھا کہ جہاں تک چینی لوپ کے حسن کا تعلق ہے، اشتہار میں ہرگز مبالغے سے کام نہیں لیا گیا تھا مگر اسے حیرت تھی کہ چینی لوپ کو شوہر کی تلاش کے لیے ایسا عجیب طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ ایسی خوبصورت لڑکی کے لیے شوہر کی تلاش تو کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر چینی لوپ نے اپنے گھریلو حالات کی وضاحت کی۔ اس طرح یہ بات بھی کھل گئی کہ اسے پادری حضرات سے کیوں گریز تھا۔ جوں جوں بات آگے بڑھی، اسے قلب کا نیم مزاحیہ مگر ہمدردانہ لہجہ پسند آنے لگا اور وہ قائل ہو گئی کہ اس کے ساتھ زندگی موجودہ عذاب کے بالکل برعکس ہوگی۔

دو گھنٹے کی رو بہ رو ملاقات میں وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی اور جہاں تک وہ دیکھ سکتی تھی، قلب کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ اب اس نے قلب کے سامنے اپنی مشکل بیان کی ”میری عمر تیس برس ہے اور میں اپنے والد کی رضامندی کے بغیر شادی نہیں کر سکتی۔ میرے والد کبھی ایسا داماد قبول نہیں کریں گے جو پادری نہ ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ان سے ملاقات کے لیے تم ایک پادری کا روپ دھار سکو؟“

اس سوال پر قلب کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی جسے وہ کوئی معنی نہ پہناسکی، تاہم قلب نے اسے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ پادری کو بیوقوف بنانے کے منصوبے میں اسے اپنے ساتھ پا کر چینی لوپ کو بے حد خوش ہوئی۔ اسے لگا جیسے وہ اور بھی قریب آ گئے ہوں۔ اس نے اپنے باپ سے قلب کا ذکر اس طرح کیا کہ وہ مسز مین

میں لکھنے والا بہت امیر بتایا گیا تھا، یا یہ کہ وہ اتنا عقل مند تھا کہ جلد ہی امیر ہو جائے گا۔ کچھ خطوں سے ازدواجی بندھنوں کے بغیر ہی گل چہرے اڑانے کی آس ٹپکتی تھی۔ کچھ نے اپنی خوش طبعی پر زور دیا تھا تو کچھ کو اقرار تھا کہ وہ دوسروں پر ٹانگ رکھنے کے عادی ہیں۔ چینی لوپ کو جب بھی موقع ملا، حویلی جا کر اپنی ڈاک اٹھالائی۔ ایک خط ایسا تھا، جو اس کی توجہ کا مرکز بن گیا:

آپ کے اشتہار نے مجھے مخمضے میں ڈال دیا ہے۔ بہت کم خواتین بے حد حسین ہونے کا دعویٰ کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں اور ان میں بھی ایسی خواتین تو بہت ہی کم ہوں گی جو ایسا سانس میں بے داغ عصمت پر بھی فخر کر سکیں، پھر جب اس پہلو پر نظر جاتی ہے کہ آپ کو پادری حضرات سے اجتناب ہے تو خیال ہوتا ہے کہ آپ کی پاک بازی اس سے زیادہ نہیں ہوگی جتنی کہ ایک نوجوان خاتون کو زیب دیتی ہے۔ مجھے بے حد تجسس ہو رہا ہے، اگر آپ اس تجسس کو دور کرنے کا موقع عنایت کریں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔

توجہ کا طالب، قلب ارٹلنگٹن پس نوشت: اپنی تصویر ارسال کر رہا ہوں۔

اس خط نے چینی لوپ کو مخمضے میں ڈال دیا؛ لکھنے والا اپنے بارے میں بالکل خاموش تھا، جس سے اپنی ذات پر اس کا اعتماد جھٹکتا تھا۔ تصویر سے خوش دلی اور ذہانت ظاہر ہوتی تھی؛ جس مزاح کی جھلک تو تھی مگر لفٹے پن سے خالی۔ چینی لوپ نے صرف اس خط کا جواب دیا، اپنی تصویر کے ساتھ۔ اس نے حویلی میں ملاقات کے لیے ایک دن بھی تجویز کر دیا۔ قلب نے اپنی رضامندی کی اطلاع دے دی۔ آخر وہ دن بھی آچنچا۔

اب بھی تمہارا مداح، پادری فلپ پس نوشت: گارڈن پارٹی کے بارے میں مت بھولنا۔

اس گارڈن پارٹی کا ذکر فلپ نے ماہِ عمل کے دوران بھی کیا تھا۔ سرسدریو اور لیڈی کیون انہیں اپنے شاندار گھر میں دعوت دے رہے تھے۔ اس دعوت کا اہم مقصد یہ بھی تھا کہ دلہن کو قصبے والوں سے متعارف کروادیا جائے۔ کچھ دیر تک وہ شش و پنج میں رہی کہ دعوت میں جائے یا نہ جائے۔ فلپ کی یاد دہانی کے بعد دل تو اس کا بھی چاہتا تھا کہ دعوت میں جانے سے انکار کر دے مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ یہ پارٹی اس کے انتقامی منصوبے کا بہترین آغاز ہو سکتی ہے۔ اس نے بڑی احتیاط سے لباس کا انتخاب کیا۔ جوش انتقام نے اس کے حسن میں وہ چنگاریاں بھردی تھیں کہ اس کی تاب لانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ منصوبے کی کامیابی کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ قصبے والوں سے اس ناچاقی کو پوشیدہ رکھا جائے جو اس کے اور فلپ کے درمیان تھی چنانچہ دونوں عین وقت پر دعوت میں پہنچے۔ اسے دیکھ کر محفل میں موجود مرد اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے مگر اس نے ایک دلربا تجاہل سے تعارف کے خواہشمند بڑے بڑے لوگوں کو نظر انداز کر کے ادھیڑ عمر پادری مسٹر ریورڈی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پینی لوپ جان گئی کہ پادری کو مقامی آثار قدیمہ سے عشق تھا۔ اس نے بڑے جوش سے پینی لوپ کو بتایا کہ قصبے میں لانگ بیرو کے مقام پر باقبل تاریخ کے بڑے تادر آثار پائے جاتے ہیں مگر کسی کو اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ مل کے انہیں کھود نکالے۔ پینی لوپ نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولی ”آف مسٹر ریورڈی! کتنے افسوس کی

اب تک آپ کو احساس ہو گیا ہو گا کہ آپ کے شرمناک سلوک کے مد نظر میں سوائے اشد ضرورت کے آپ سے بات کرنا پسند نہیں کروں گی۔ میں کسی کو اس ظلم کے بارے میں نہیں بتاؤں گی جو میرے ساتھ ہوا ہے کہ یہ تو اپنا ہی تماشا بنانے والی بات ہوئی مگر میں دنیا پر یہ بات واضح کر دوں گی کہ مجھے آپ سے کوئی محبت نہیں ہے اور یہ کہ آپ مجھ پر فریفتہ ہوئے تھے اور آپ کی جگہ کوئی بھی مرد ہوتا تو وہ یہی کرتا۔ میرے طور طریقوں پر انگلیاں اٹھیں گی مگر دنیا یہ بھی تو جان لے گی کہ آپ نے اپنی شریک حیات کے انتخاب میں کس عقل مندی کا ثبوت دیا ہے اور اگر ایسا کرتے ہوئے تقدس مآب پادریوں کی عبادت پر بھی کچھ چھینٹے پڑ جائیں تو میری خوشی دوبالا ہو جائے گی۔ زندگی میں میرا ایک ہی مقصد ہے کہ میں آپ کو اتنا ذلیل کروں جتنا مجھے کیا گیا ہے۔ آج کے بعد تمہاری برائے نام بیوی، پینی لوپ۔

اس نے یہ خط کھانے کے برتنوں کے ساتھ رکھ دیا اور کھانے کا طباق دروازے سے باہر رکھ دیا۔ اگلی صبح جب ناشتہ آیا تو اس کے ساتھ ایک رقعہ بھی دھرا تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ اسے پرزہ پرزہ کر کے کھڑکی سے باہر اُچھال دے مگر وہ اس توقع کی مزاحمت نہ کر سکی کہ وہ اپنے کیے پر کف افسوس مل رہا ہو گا اور اس نے گڑگڑا کر معذرت خواہی کی ہوگی۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور پڑھنا شروع کیا:

شباباش جان من! تمہارا خط ملامت نگاری کا خوب صورت نمونہ ہے، اگر تم نے میری رائے پوچھی ہوتی تو شاید میں اس سے بہتر نہ بنا سکتا۔ باقی رہی انتقام والی بات تو جان من دیکھا جائے گا۔ ہو سکتا ہے یہ سب تمہاری خواہش کے مطابق نہ ہو۔

نہ آیا تو میں نے ہر ممکنہ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب تم سے یہ بات چپانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ میں اس قصبے کا نائب پادری ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ تمہیں دھوکہ دینے میں میں نے گھٹیا پن سے کام لیا ہے مگر میں سوائے اپنے پیار کے کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا؛ تمہیں حاصل کرنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ یہ سنتے ہی وہ اُچھل کر بستر سے نیچے اتر آئی اور چلا کر بولی ”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی، کبھی معاف نہیں کروں گی، تمہیں اس پر پچھتانا پڑے گا، تم نے ایک مجبور لڑکی سے ایسے گھٹیا سلوک کا مظاہرہ کیا۔ میں تمہارا اور دوسرے پادریوں کا ایسا ہی تماشا بناؤں گی جیسا تم نے میرا بنایا ہے۔“

وہ لباس پہن چکا تھا۔ پینی لوپ نے اسے دروازے سے باہر دھکیل کر چٹنی چڑھا دی اور سارا دن کمرے میں بند رہی۔ فلپ نے شام کے کھانے تک اپنی واپسی کا کوئی اشارہ نہیں دیا؛ آخر کھانا لے کر دروازے تک آیا اور یہ کہتے ہوئے دستک دی ”مجھے سزا دینے کے لیے تمہیں زندہ رہنا چاہیے اور زندہ رہنے کے لیے کھانا بہت ضروری ہے۔ تمہیں مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی؛ میں کھانا چھوڑے جا رہا ہوں۔“

پہلے تو اس نے اپنا پندار قائم رکھنے کی کوشش کی مگر وہ صبح سے بھوکے تھے، اس نے ناشتہ کیا تھا نہ دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ آخر بھوک اس پر غالب آ گئی اور اس نے کھانے کا طباق صاف کر دیا۔ تاہم اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ کھانے سے تازہ دم ہو کر باقی شام اس نے فلپ کے نام ایک خط لکھنے میں گزاری جس میں مستقبل کا خاکہ دیا گیا تھا۔ اس نے کئی بار لکھا اور کاٹا، بالآخر وہ خط کے مسودے سے مطمئن ہو گئی۔

جناب!

گزرا۔ اس کا شوہر نہایت زندہ دل شخص تھا۔ بے رنگ پرہیزگاری کے برسوں نے پینی لوپ میں بچکانہ حرص پیدا کر دی تھی مگر فلپ کسی چیز پر اعتراض نہ کرتا۔ صرف ایک چیز کبھی پینی لوپ کو پریشان کر دیتی۔ فلپ اپنے بارے میں بہت کم بات کرتا۔ صرف اتنا بتاتا تھا کہ معاشی وجوہ سے وہ سو مسرت کے گاؤں پولٹن میں قیام پر مجبور تھا۔ جس طرح اس نے گاؤں کی حویلی اور اس کے کینوں کا ذکر کیا اس سے پینی لوپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فلپ ان لوگوں کا گماشتہ ہو گا تاہم ماہِ محفل کا ایک لکھ اتنا خوشگوار تھا کہ پینی لوپ کو فلپ کی کم گوئی پر غور کرنے کا بہت کم موقع ملا۔

فلپ نے بتایا کہ اسے ہفتے والے دن ہر صورت میں پولٹن واپس پہنچنا ہے۔ رات گئے وہ فلپ کی قیام گاہ ”رائی ہاؤس“ پہنچ گئے۔ ہر طرف گہری تاریکی تھی۔ وہ اس قدر تھک چکی تھی کہ پلنگ پر گر کر سونا چاہتی تھی۔ فلپ اسے اوپر والی منزل میں لے گیا اور نیچے پر سر رکھتے ہی اسے نیند آ گئی۔ اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو گر جا گھر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور فلپ پلنگ کے پاس کھڑا پادریوں والا چوندہ پہن رہا تھا۔

”تم یہ کپڑے کس لیے پہن رہے ہو؟“ پینی لوپ نے چلا کر پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ ایک چھوٹے سے اعتراف کا وقت آ گیا ہے میری جان! جب میں نے تمہارا اشتہار دیکھا تو مجھے صرف تجس ہوا تھا اور میں نے صرف مذاق میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی مگر جیسے ہی میں نے تمہیں دیکھا مجھے تم سے محبت ہو گئی۔ کوئکمب میکانا کی حویلی میں گزرنے والے ہر لمحے نے اس محبت کو ہمیز دی۔ میں نے تمہیں پانے کا ارادہ کر لیا اور جب ایمان داری سے یہ کام بننا نظر

بات ہے۔“ پادری اتنا متاثر ہوا کہ اس نے نائب پادری کو ایسی مہذب شریک حیات چننے پر مبارک باد دی۔ اس نے چینی لوپ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اگلے دن وہ پادری کی گاڑی میں پولٹن سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر کچھ دلچسپ آثار قدیمہ دیکھنے چلے۔ چینی لوپ کچھ مصنوعی ہچکچاہٹ کے بعد مان گئی، چنانچہ سارے قصبے نے انہیں گاڑی میں گھومتے ہوئے دیکھا۔ پادری صاحب بڑے اشتہاک سے گفتگو فرما رہے تھے، اور وہ یہ ظاہر کرتی رہی کہ وہ ان کی شخصیت میں بری طرح کھوپچکی ہے۔ یوں تو انہیں سب نے دیکھ لیا مگر ایک بڑی اماں، مسز کوئلے کا انہیں دیکھنا غضب ڈھا گیا۔ مسز کوئلے کا کل وقتی مشغلہ لگائی بجھائی کرنا تھا۔ مسز کوئلے کی ایک بیٹی تھی جس کے لیے انہوں نے ایک مدت سے قلب پر آنکھ رکھی ہوئی تھی۔ اب اسے اطمینان ہوا کہ اس کی ہیرے جیسی بیٹی کو شکرا کر قلب گرا بھی تو کوڑے کے ڈھیر پر۔ پادری اور چینی لوپ کو دیکھ کر مسز کوئلے نے تک چہا کر ”ہونہہ“ کی۔ مسز کوئلے کے جاننے والے اس یک لفظی آواز کا مطلب سمجھتے تھے۔

اگلی صبح جب قلب اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے گھر سے باہر تھا، پادری ریورڈی کو سومرسٹ کے آثار قدیمہ پر ایک بھاری مخطوط اٹھائے رائی ہاؤس کی طرف جاتے دیکھا گیا۔ سن گن لینے والوں کو معلوم ہوا کہ معاملہ صرف کتاب پہنچانے کا نہیں تھا بلکہ وہ تادیروں میں ٹھہرا رہا۔ ادھر ادھر سے مسز کوئلے کو یہ خبر مل گئی کہ نیا شادی شدہ جوڑا الگ الگ کمروں میں شب بٹا رہا ہے۔

بے چارے پادری کو ابھی تک مسز کوئلے کی کارگزاری کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ ہر جگہ نائب پادری کی بیوی کی خوبصورتی، ذہانت اور پارسائی کے کن گاتا

پھر، اس کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ چینی لوپ اور خود اس پر عائد ہونے والے الزامات پر گویا مہر تصدیق ثبت کرتا رہا۔ آخر کار مسز کوئلے کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے علاقے کے ڈین، مسٹر گلاس ہاؤس کو خط لکھا کہ پادری کی عزت کی خاطر، نائب پادری کو کوئی اور حلقہ تفویض فرمایا جائے۔ مسٹر گلاس ہاؤس مسز کوئلے سے واقف تھا، چنانچہ اس نے معاملہ سنجیدگی سے لینے کی بجائے یہ زیادہ مناسب خیال کیا کہ پادری سے بات کر لی جائے چنانچہ ایک روز وہ پادری سے ملنے آ پہنچا۔ پادری نے اسے یقین دلایا کہ دنیا میں کوئی چیز اس کے اور مسز قلب کے تعلقات سے بڑھ کر معصوم نہیں تھی مگر ہوا یہ کہ چینی لوپ کی معصومیت کا تذکرہ وہ کچھ ایسی گرم جوشی سے کر بیٹھا جسے ڈین نامناسب سمجھتا تھا۔ مسٹر گلاس ہاؤس نے فیصلہ کیا کہ خاتون سے بہ نفس نفیس ملاقات کر لی جائے۔

جب وہ رائی ہاؤس پہنچا تو شام کی چائے کا وقت ہو رہا تھا۔ چینی لوپ نے جو، اب پادری اور اس کے آثار قدیمہ سے آگاہ چکی تھی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا تاہم مسٹر گلاس ہاؤس نے جب بڑی احتیاط سے ان افواہوں کا ذکر چھیڑا جو مسز کوئلے کے ذریعے اس تک پہنچی تھیں تو چینی لوپ نے کچھ اس انداز سے ان کی تردید کی کہ مسٹر گلاس ہاؤس کو پادری کی بے احتیاطی کا یقین ہو گیا۔ مسٹر گلاس ہاؤس نے چینی لوپ کو بتایا کہ اسے آثار قدیمہ جیسی مردہ چیزوں کی بجائے دھڑکتی ہوئی زندگی کی نبض پر ہاتھ رکھنا زیادہ مرغوب تھا۔

”ہائے مسٹر گلاس ہاؤس! آپ نے کتنی صحیح بات کی۔ میں آپ سے عمل اتفاق کرتی ہوں۔ بھلا بتائیے تو آپ کو زندگی کے کن مظاہر سے دلچسپی ہے؟“

بین الاقوامی کھاوتیں!

☆ آزادی کی تکلیف، غلامی کے آرام سے بہتر ہے۔ (عربی کہاوت)

☆ بغیر دیکھے کوئی چیز منہ میں نہ ڈالو اور نہ ہی بغیر پڑھے کبھی دستخط کرو۔ (چینی کہاوت)

☆ احسانات سے دہی ہوئی زندگی انسان کے شایان شان نہیں۔ (چینی کہاوت)

☆ ہمت والے خدا کی بخشی ہوئی طاقتوں سے کام لیتے ہیں۔ (جرمن کہاوت)

☆ کامل شخص کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ (اطالوی کہاوت)

☆ گناہ کے آغاز میں اتنی لذت نہیں جتنی اس کے اختتام میں تلخی ہے۔ (ملائیائی کہاوت)

☆ سب سے بڑی ہوشیاری یہ ہے کہ کوئی چالاکی نہ کی جائے۔ (فرانسیسی کہاوت)

مرتب: ایس۔ امتیاز احمد (کراچی)

”مجھے تو صبح فور کے شبی جنگلات میں پائے جانے والے نادر پرندوں سے دلچسپی ہے۔ رام چڑیا تو وہاں عام نظر آتی ہے اور ڈھونڈنے والے زرد راج ہنس بھی دیکھ لیتے ہیں، ڈین نے جواب دیا۔

پینی لوپ خوشی سے منٹھیاں بھینچنے لگی۔ ”نارووک کے جنگلوں کے نواح میں ساری عمر گزارنے کے باوجود میں بھی زرد راج ہنس نہیں دیکھ پائی۔ بس قسمت میں نہیں تھا حالانکہ میں کئی جنگلوں کی سیاحت کو نکل چکی ہوں۔“

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دیہاتی ڈین اپنی آمد کا مقصد بھول گیا۔ اپنے مقدس پیشے کے فرائض نظر انداز کرتے ہوئے اس نے پینی لوپ کو جنگل میں اپنے پسندیدہ علاقے کی سیاحت کی دعوت

دے ڈالی۔

”مگر مسٹر ڈین! مسز کوئیگے کیا کہے گی؟“

ڈین نے کسی دنیا دار شخص کا روپ دھارنے کی بھرپور کوشش کی۔ ”اس پاک باز بڑھیا کو کوئی پوچھتا ہے؟“

چائے کا دوسرا کپ ختم ہونے سے پہلے پینی لوپ اس کے پر زور اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔ طے پایا کہ جس روز موسم اچھا ہوا وہ جنگل کے لیے نکل جائیں گے، اگرچہ سیر کے لیے ڈین نے خاصا ویران علاقہ منتخب کیا تھا مگر مسز کوئیگے کے جاسوس بھی پوری طرح مستعد تھے۔ اہل کلیسا کو پینی لوپ کے جادو کے آگے پوری طرح بے بس پا کر مسز کوئیگے نے مسز کیونن کی مدد چاہی۔ اس نے لیڈی کو یقین دلایا کہ اس کی اطلاعات کے مطابق جنگل میں ڈین کے مشاہدات صرف پرندوں تک محدود نہیں تھے۔

”میں اور کچھ نہیں کہوں گی، آپ خود سمجھ دار ہیں محترم خاتون! کیا آپ اس حرافہ سے ہماری جان نہیں چھڑا سکتیں جو ہمارے مقدس پیشواؤں کی عاقبت کھوئی کر رہی ہے۔“

لیڈی کیونن نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس معاملے پر غور کرے گی اور مناسب قدم اٹھائے گی۔ وہ مسز کوئیگے سے اچھی طرح واقف تھی چنانچہ اس نے بہتر سمجھا کہ پینی لوپ سے مل کر براہ راست اس قصبے کے بارے میں دریافت کیا جائے۔

تھوڑی سی محنت سے اس نے پینی لوپ سے سب کچھ اگلا لیا تاہم صورتحال کے حزن پہلو پر غور کرنے کی بجائے وہ خوش دلی سے ہنسنے لگی۔ ”میری بچی! تم جو کچھ کر رہی ہو وہ تو نہایت آسان ہے۔ آخر یہ سڑیل بڑھے تمہارے حسن کے سامنے کیا خاک مزاحمت کریں گے۔ تم سے ملنے سے پہلے

کا میاب ہو جائے گی مگر یہ دیکھ کر اسے خاصی خفت ہوئی کہ کہانی کے المناک حصوں کو سنتے ہوئے وہ مسلسل مسکراتا رہا۔ جب اس نے بپ کی طرف اس خاص انداز میں نگاہیں اٹھا کر دیکھا جس کی کوئی پادری یا ڈین تاب نہیں لاسکا تھا تو بپ نے جواب میں آنکھ مار دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پینی لوپ نے اپنا ملمع اُتار پھینکا اور جھپٹل کرنے کی بجائے سیدھے سادے انداز میں باتیں کرنے لگی۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ شدید غصے کے باوجود اسے ابھی تک فلب سے محبت تھی اور صرف اس کی اتنا اس اعتراف میں حائل تھی۔

”میری پیاری!“ بپ نے نرمی مگر کسی قدر غیر سنجیدگی سے کہا ”میں نہیں سمجھتا کہ تم جس راستے پر چل رہی ہو وہ تمہیں سکون مہیا کر سکے گا۔ دنیا ایسے امتحانوں سے بھری پڑی ہے جو تم پر دل و جاں سے فریفتہ ہو جائیں گے مگر تم خود ایسے امتحانوں سے محبت نہیں کر سکتیں اور کوئی شخص جو عقل مند ہو یہ سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا کہ تم ابھی تک فلب سے محبت کرتی ہو۔ بے شک اس نے تمہارے ساتھ ناقابل معافی دھوکہ کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس زیادتی کو نظر انداز کر دو، پھر بھی اگر تمہیں خوش رہنا ہے تو بیچارے پادریوں کو نشانہ ستم بنانے کی بجائے کوئی بہتر کام کرو۔ میں یہ فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے مگر تم جو بھی کرو اسے محض انتقام کی بجائے زیادہ اطمینان بخش اور مثبت ہونا چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پینی لوپ کا ہاتھ تھپتھپایا اور بولا ”میری پیاری، اس پر غور کرو اور پھر مناسب وقت پر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔“

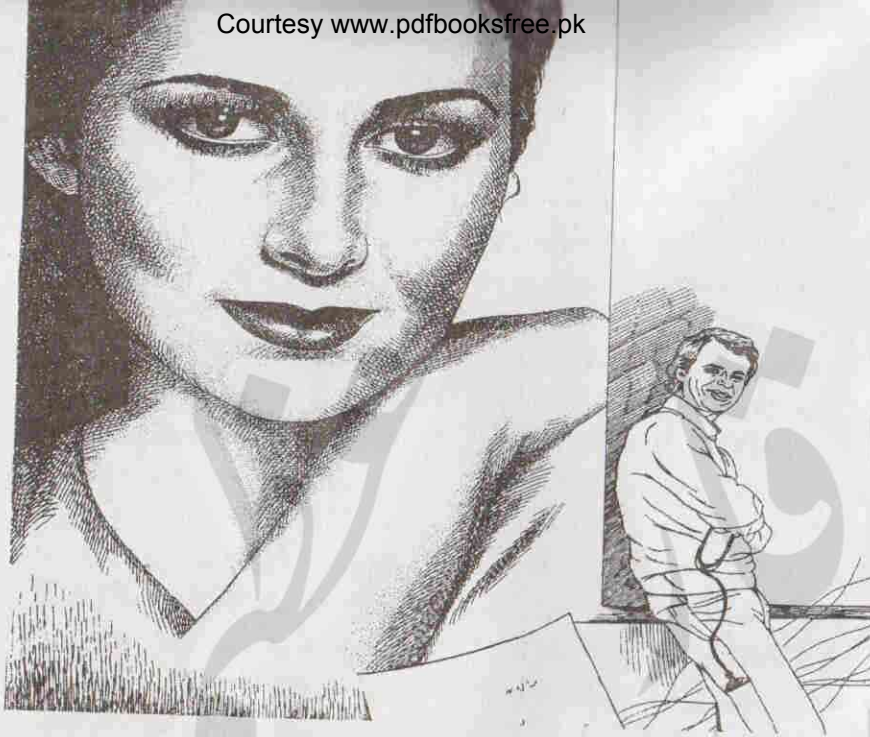
گھر واپس جاتے ہوئے اس کے غور کی ہوائنکل چلی تھی۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ انتقام کا جواز خواہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، مکمل طور پر مطمئن نہیں

زندگی بھر بے چاروں نے کسی خوبصورت عورت کی شکل تو دیکھی نہیں ہوگی۔“

”ہاں، مگر سوائے آپ کے۔“ پینی لوپ نے مداحیت کی مگر لیڈی کیونن نے سن ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی ”نہیں، میری پیاری! انتقام لینا ہے تو کسی ایسے شخص سے بچو لاؤ جو تمہاری فکر کا ہو۔ گلاسٹن بری کا بپ، جس کے پادریوں کو تم درغلاتی رہی ہو، صبح معنوں میں تمہارے برابر کا جوڑ ہے۔ میں تمہاری ملاقات کروا دوں گی اور خود بالکل غیر جانبدار رہوں گی۔ میں بپ کا احترام کرتی ہوں مگر تمہاری مہم جوئی بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔“

گلاسٹن بری کا بپ خاصا عالم فاضل شخص تھا اور اسی امتیاز کی بدولت اس نے ایک خاص قسم کے اٹھنے پرنے کے باوجود اپنے بیٹے میں خاصی ترقی کی تھی۔ کوئی خاص بات تو شاید کبھی سامنے نہیں آئی مگر لوگ کہتے ہیں کہ بپ خوبصورت عورتوں کی سمجھا میں خاصا خوش رہتا ہے اور اکثر ایسے موقعوں پر اس کی گفتگو شائستگی کی حدیں پار کر جاتی ہے۔ لیڈی کیونن بپ سے خاصی جان بچان رکھتی تھی۔ اس نے بپ کو ساری کہانی سنا دی اور بولی ”لڑکی دل کی بری نہیں، صرف غصے میں ہے اور اس کا غصہ بے جا بھی نہیں۔ میں اسے سمجھانے میں ناکام رہی ہوں، شاید اس لیے بھی کہ میں اس کی داستان سن کر ایسی محفوظ ہوئی کہ اس کی سرزنش کو دل ہی نہیں چاہا مگر محترم بپ! مجھے یقین ہے کہ جہاں میں ناکام رہی ہوں، آپ ضرور کامیاب ہوں گے، اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپ میرے ہی گھر میں اس سے مل لیں اور پھر جو ہو، سو ہو۔“

چنانچہ پینی لوپ کو فڈ پیل میں مدعو کر لیا گیا۔ حالیہ تجربات سے اس کا اعتماد بڑھ گیا تھا اور اسے یقین تھا کہ بپ کو اپنی انگلیوں پر نچانے میں



زرناب

عاصمہ تنہا چودھری

زرناب کی شادی کا سن کر تو خرم کے ہوش اڑ گئے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی یہ سب ہو سکتا ہے۔ اب پچھتاوے کا مزید بوجھ اس کے سینے پر تھا اور اسے لگتا تھا کہ اس کے نیچے دب کر اس کا دم گھٹ جائے گا مگر اس نے زرناب کی محبت کو قریب سے دیکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے بے حد محبت کرتی تھی۔

ایک دوشیزہ کی کہانی جس کی زندگی ایک سوالیہ نشان تھی

وش کا نام زرناب تھا۔

زرناب دوسری ظاہری خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک ایسی زندہ دل لڑکی تھی جو بہت جلد لوگوں میں گھل مل جاتی تھی۔ کلاس کی زیادہ تر لڑکیاں اس کی دوست تھیں اور اس کی دلچسپ باتوں کا خوب لطف

لڑکیوں کا ایک گروپ کالج کے دروازے سے باہر آ رہا تھا۔ ان میں ایک لڑکی سب سے منفرد، شوخ و چنچل اور زندگی سے بھرپور نظر آ رہی تھی جس کے ملائم، ریشمی لمبے بال، بھوری آنکھیں، سرودھ، گھٹکتی آواز اور ہاتھوں میں کتابوں کا پلندا تھا۔ اس پری

کے لیے ہی سہی، اپنے پرانے گھر چل آؤ۔“ عیسائی محبت کے ساتھ، تمہارا باپ جوصل دل لیے وہ لیورپول اسٹریٹ گئی۔ گاڑی میں خالی جگہ ڈھونڈتے ہوئے اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، اس کا خاوند پادریوں کی عبا کی بجائے نہایت بڑھیا لباس پہنے درجہ اول کے ڈبے میں سوار ہو رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر وہ چلائی ”فلپ!“

اسی وقت فلپ بھی پکار اٹھا ”پینی لوپ، میری جان! تم تو اور بھی خوبصورت ہو گئی ہو۔“ ”مگر تمہارے وہ کپڑے کیا ہوئے جو ہمارے درمیان دیوار بن گئے تھے؟“

”میں نے انہیں دیمک کے سپرد کر دیا ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک اچھا سائنسدان بن سکتا ہوں تو میں نے گرجا کو خیر باد کہنے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ اب میری آمدنی ابھی خاصی ہو گئی ہے۔ میں کیمبرج کے سائنسی آلات بنانے والے ادارے میں ایک نئی ایجاد درج کروانے جا رہا ہوں مگر تم کیا کر رہی ہو؟ تم بھی تو خاصی خوشحال نظر آ رہی ہو۔“ ”ہاں..... میں بھی غریب نہیں رہی۔“ اور اس نے اپنی کامیابی کی کہانی کہہ ڈالی۔ ”میں تو ہمیشہ کہتا تھا کہ تم ہرگز بیوقوف نہیں ہو۔“

”اور میں نہ کہتی تھی کہ تم بڑے شیطان ہو۔ خیر، میں اب برا نہیں مانوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پلیٹ فارم پر ہی ایک دوسرے کے بازوؤں میں سا گئے۔ ”جناب! بیگم صلیب کو لے کر گاڑی میں سوار ہو جائیے۔“ گاڑی نے پکار کر کہا۔ گاڑی رینگنے لگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے گاڑی میں سوار ہو گئے۔

کرتا۔ اسے اگر اپنی زندگی کا رُخ بدلنا تھا تو اس کے لیے مشکل اور عملی فیصلے کرنے تھے۔ وہ کسی قیمت پر ایک دیہاتی نائب پادری کی اطاعت گزار بیوی بننے پر آمادہ نہیں تھی مگر باپ کے پاس واپس جانا بھی تو سہانہ روح تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے کسی نہ کسی طرح اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ آخر اس نے قلم اٹھایا اور مسز مین ٹیٹھ کو ایک طویل خط میں شادی کے بعد کے سب واقعات لکھ ڈالے، آخر میں اس نے لکھا:

”آپ نے مجھ پر اتنے احسان کیے ہیں کہ کسی مزید مہربانی کے لیے کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ شاید اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں آپ میری مدد کر سکیں۔ کیا آپ اس سلسلے میں لندن آ کر مجھ سے مل سکتی ہیں؟“

اس ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسز مین ٹیٹھ نے اپنے درزی سے بات کی اور پینی لوپ کو اس کے شوروم میں ماڈل گرل کے طور پر ملازمت مل گئی۔ لندن پہنچ کر اس نے فلپ سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کر لیا۔ پولٹن کے رہنے والے بھی اسے بھول گئے۔ صرف مسز کوٹنگ کو کبھی کبھار اس کا خیال آتا یا شاید فلپ کو، اگرچہ اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ پینی لوپ کا خسن اس کے مالک کے لیے کاروباری اثاثہ ثابت ہوا۔ جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ اس میں لباس سازی کی قدرتی صلاحیت تھی۔ اس نے تیزی سے ترقی کی اور تین ہی برس کے عرصے میں خاصی کمائی کرنے لگی۔ مالک اسے اپنے کاروبار میں شریک کرنے ہی والا تھا کہ ایک دن اچانک اسے اپنے باپ کا غم ناک خط ملا، وہ شدید بیمار تھا اور شاید بستر مرگ پر تھا۔ اس خط میں لکھا تھا:

”تم نے مجھے اور اپنے معزز خاوند کو بے حد دکھ دیا ہے۔ میں مرنے سے پہلے رنجش ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر تم تھوڑی سی دیر

اس کا تعلق ایک غریب طبقے سے تھا۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا جو کہ پرائیویٹ فرم میں معقول سی تنخواہ لیتا تھا۔ زرناب کی دو بہنیں بھی تھیں جو کہ نوں اور دسویں جماعت کی طالبات تھیں۔ اس کی والدہ کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا اور باپ بھی سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ تھا اور اسے مناسب سی پیشہ مل جاتی۔ سکا رلشپ ہولڈر ہونے کی وجہ سے زرناب کی تعلیم کا بوجھ بھی اس کے گھر والوں کو نہیں اٹھانا پڑتا تھا اور گھر کی گزربہر مناسب انداز میں چل رہی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی سفید پوشی کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ سمیعہ، اقصیٰ اور بتول امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ہر وقت زرناب کو نیچا دکھانے کی ناکام کوشش کرتی رہتیں۔ کبھی اپنی امارت کا دکھاوا کر کے اسے حقیر ثابت کرنے کی کوشش کرتیں مگر کبھی بھی ان کو اپنے مکروہ ہتھکنڈوں میں کامیابی نہ ہوتی تھی بلکہ اکثر ان کو خود ہی شرمندہ ہونا پڑتا۔ اپنے ہی بچھائے جال میں پھنس کر ان کے پاس سوائے دانت پیسنے کے کوئی چارہ نہ رہتا۔ دوسری طرف زرناب نے بھی ان کی باتوں کو سنجیدگی سے نہ لیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے ساتھ تھی اور جب مدد خدا شامل ہو تو گھبرانا کس بات کا!

سمیعہ، بتول اور اقصیٰ اکثر کالج کے علاوہ بھی ملتی رہتی تھیں۔ کلب میں بھی روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے آپس میں خاندانی روابط بھی تھے۔

اسی طرح ایک روز کلب میں بیٹھی تینوں سہیلیاں زرناب کے خلاف زہرا گل رہی تھیں۔ ان کے دلوں میں اب نہ صرف حسد کی آگ مزید بھڑک اٹھی تھی بلکہ اب وہ اپنی شرمندگی کا بدلہ بھی لینا چاہتی تھیں جس کا سامنا انہیں زرناب کے وجود سے وقتاً فوقتاً کرنا پڑا جبکہ اس شرمندگی کا موجب وہ خود ہی

اٹھاتیں۔ کالج میں جس گروپ سے قہقہوں کی آوازیں آتیں، گزرنے والوں کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ ہوتا کہ یہ محفل زرناب نے ہی سجائی ہوگی۔ زرناب جہاں تعلیم میں ایک بے حد ذہن اور قابل لڑکی تھی وہیں کھیل کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کروا چکی تھی۔ کالج کی طرف سے بحیثیت کپتان والی بال میچ کی چیمپیئن ٹرافی بھی جیت چکی تھی۔ جہاں کالج کی بہت ساری لڑکیاں اس کی دوست تھیں وہیں کچھ لڑکیاں زرناب سے حسد بھی کرتی تھیں کیونکہ زرناب نہ صرف لڑکیوں میں ہر دلعزیز تھی بلکہ اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے اپنے اساتذہ میں بھی بے حد مقبول تھی۔ خاص طور پر اردو کی استاد سے زرناب کو بہت لگاؤ تھا۔ اسے شعر و شاعری کا بھی شغف تھا اور اس کی استاد مسز نفیس جو کہ اپنے نام کی طرح نفیس خاتون تھیں، بات بات پر شعر کہتیں اور زرناب کو موقع کی مناسبت سے ان کے چنے تھے اشعار کہنا بہت پسند تھا۔

زرناب بی اے کی طالبہ تھی اور نفسیات اور اردو اس کے بنیادی مضامین تھے۔ ویسے وہ نفسیات کا استعمال عملی زندگی میں بھی خوب کرنے کی کوشش کرتی، جیسے لوگوں کو جانچنے کی کوشش اور ان کی مختلف حرکات سے ان کے کردار کا جائزہ لینا وغیرہ۔ الغرض وہ نہ صرف نفسیات کو بطور مضنون پڑھ رہی تھی بلکہ ابھی سے وہ ایک ”ماہر نفسیات“ بننے کی بھی کوشش کر رہی تھی۔

زرناب کی کلاس میں سمیعہ، اقصیٰ اور بتول ایسی لڑکیاں تھیں جو اس سے شدید حسد کرتیں۔ بظاہر وہ اس کے ساتھ ہنسی، مسکراتیں مگر اندر ہی اندر ان کا زرناب سے حسد، نفرت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ زرناب کو کسی حد تک ان کی نفرت کا اندازہ تھا مگر چونکہ وہ فطرتاً ایک اچھی، نیک طبع لڑکی تھی اس لیے اس نے کبھی اس معاملے کو اہمیت نہ دی تھی۔

ہوئیں مگر روپے پیسے کے گھنڈے ان کی آنکھوں پر ایک ایسی سیاہ پٹی باندھ دی تھی جس میں سے انہیں سب سیاہ ہی نظر آتا تھا۔ وہ کچھ ایسا کرنا چاہتی تھیں جس کی وجہ سے زرناب کی زندگی میں طوفان برپا ہو جائے اور ایسی ہچکل بج جائے کہ وہ چاہ کر بھی اپنی زندگی کی ناؤ کو سنہال نہ پائے۔

ابھی وہ اپنے دوستوں سے جو گفتگو تھیں کہ ایک لڑکا جو کہ اونچے قد اور گوری رنگت کا خوبصورت جوان تھا اور صورت سے ہی ریکس زادہ لگتا تھا ان کے قریب آیا۔ وہ کافی دیر سے دوسری میز پر بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ انہوں نے غور سے دیکھا اور سوچنے لگیں کہ چہرہ جانا پہچانا سا تھا۔ وہ اکثر اسے اس کلب میں آتا جاتا دیکھ چکی تھیں مگر کبھی براہ راست تعارف نہیں ہوا تھا۔

اس کا نام خرم تھا۔ خرموں سے کہلاتا اس کی عادت تھی۔ امیر ماں باپ کی بگڑی ہوئی اولاد۔ باپ نے بے حد دولت کمائی اور کئی فیکٹریاں کھڑی کیں مگر اب اسکے پاس اپنے بیٹے کو دینے کے لیے وقت کہاں بچا تھا۔ وہ اپنے کاروبار میں اس طرح کھو گیا تھا جیسے اس کا کاروبار ہی اس کا اوڑھنا اور پھونکا ہو۔

اپنی اولاد کے حصے کا پیار بھی وہ اپنے کاروبار کو ہی دیتا۔ اور خرم کی ماں، اس نے تو کبھی ماں بن کر خرم کو پالا ہی نہیں تھا۔ اس نے اسے جنم ضرور دیا مگر خرم نے اپنی ماں کی گود کی بجائے آیا کی گود میں آنکھ کھولی۔ یوں تو خرم کے گھر میں کسی چیز کی بھی کمی نہ تھی۔ اگر کی تھی تو صرف اور صرف پیاری، محبت کی۔ اس محبت کی جو ایک خاندان کو اپنی بیوی اور بچوں سے ہوتی ہے۔ اس محبت کی جو ماں باپ کو اپنے بیٹے سے ہوتی ہے۔ اس محل نما گھر میں سب اپنی اپنی زندگیاں گزار رہے تھے۔ صرف اور صرف مادہ پرستی کی زندگی۔

لہذا خرم بھی ایک بے حس، خود غرض اور مادہ پرست لڑکا بن چکا تھا۔ اس کی زندگی میں اب جذبات کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے پاس باپ کی کمائی ہوئی اتنی دولت تھی کہ جس کا اندازہ خود اس کے باپ کو بھی نہ تھا۔ خرم جیسے چاہتا اس پیسے کو برباد کرتا، چاہے تو آگ لگا دیتا، اسے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔

خرم زیادہ وقت گھر سے باہر اپنے دوستوں میں گزارتا۔ خطرناک شرطیں لگا کر جیتنے کی اسے عادت سی پڑ گئی تھی۔ جیسے ایک نشہ کرنے والے کو نشے کی لت ہوتی ہے اسی طرح خرم کو شرط لگانے کی لت لگ چکی تھی۔ بعض اوقات تو وہ شرط جیتنے کی غرض سے اپنی جان کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہ کرتا۔ وہ ایک بے مقصد زندگی جی رہا تھا اور جانتا تھا کہ اس سے پیار کرنے والا کون ہے جسے اس کی فکر ہو لہذا وہ ایسی عجیب و غریب حرکات کرتا رہتا۔

خرم اب سمیعہ، اقصیٰ اور بتول کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے ان کی باتیں سن کر کہا کہ وہ ان کی مدد کر سکتا ہے، تو وہ تینوں چونک اٹھیں اور کہنے لگیں، وہ کیسے.....؟

خرم نے کہا کہ یہ زرناب نام کی لڑکی تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسے تو وہ ایسا مزہ چکھائے گا کہ وہ زندگی بھر نہیں بھولے گی۔

سمیعہ نے حیرت سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرے گا وہ تو زرناب کو جانتا بھی نہیں تو پھر ایسا کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

خرم نے مسکرا کر جواب دیا کہ ہر روز اسے کرنے کے لیے کچھ نیا چاہیے ہوتا ہے۔ نئے نئے چیلنجز قبول کرنے میں اسے بہت مزہ آتا ہے اور زرناب کی شکل میں آج بھی اس کے سامنے ایک نیا چیلنج تھا اور وہ اسے بخوشی پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا

تھا۔

ان تینوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کوئی بھی ہو۔ انہیں تو صرف اور صرف زرناب کی زندگی برباد کرنے سے مطلب تھا۔ لہذا وہ جلد آمادہ ہو گئیں مگر کہنے لگیں کہ تم آخر ایسا کیا کرو گے اس کے ساتھ.....؟ زرناب کوئی عام لڑکی نہیں جو بڑی آسانی سے تمہارے پھیلانے ہوئے جال میں پھنس جائے گی۔ خرم نے انہیں یقین دلایا کہ ایک دن وہ انہیں اس کی بے عزتی اور بربادی کا دن ضرور دکھائے گا۔ وہ کیا کرے گا؟ کیسے کرے گا؟..... یہ سب وہ اس پر چھوڑ کر مطمئن ہو جائیں۔ خرم نے ان سے ان کے کالج کا پتہ اور اوقات کار وغیرہ پوچھا اور یہ بھی کہ وہ اسے کیسے پہچانے گا۔ بتول نے کہا کل تم کالج کی چھٹی کے وقت وہاں موجود رہنا ہم اشارے سے تمہیں بتا دیں گے۔

تمام راستے خرم زرناب کو تنگ کرنے کے طریقے سوچتا رہا کہ کیسے وہ اس کی زندگی کو برباد کر سکتا ہے۔

اگلے دن زرناب کالج سے ہستی مسکراتی لڑکیوں کے ساتھ باہر آ رہی تھی۔ انہی لڑکیوں میں سمیعہ، اقصیٰ اور بتول بھی تھیں۔ سڑک پار کالے رنگ کی بڑی سی کار میں خرم ان کا منتظر تھا۔ جیسے ایک شکاری اپنے شکار کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہو۔

اقصیٰ نے زرناب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خرم کو اپنی گھناؤنی سازش رچانے کا موقع دیا۔ خرم نے جب زرناب کو دیکھا تو جانا کہ وہ تو واقعی ایک غیر معمولی پرکشش لڑکی تھی۔

وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ سامنے اس کی بربادی کا پروانہ لے کر کوئی اسکا منتظر تھا۔ وہ باتوں میں مگن خرم کے قریب سے گزر گئی اور دین شاپ پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ خرم اپنی کار میں بیٹھ کر اس پر مکمل

نظر رکھے ہوئے تھا۔ جب وہ وین میں بیٹھ گئی تو وہ بھی کار میں اس کا پیچھا کرنے لگا۔ ایک جگہ وین رکی اور وہ پیدل اتر کر چلنے لگی۔ اسے اندازہ بھی نہ ہوا کہ کوئی اسکا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ ایک گلی میں مڑی اور ایک مکان میں داخل ہو گئی۔ خرم اسے دور کھڑے کار میں سے اندر جاتے دیکھ رہا تھا۔

اس کا پیچھا کرنا خرم کا روز کا معمول بن چکا تھا۔ ایک دو دن بعد ہی زرناب کو اندازہ ہو گیا کہ کالی کار اس کا روز پیچھا کرتی ہے۔ وہ ڈر گئی اور سہم بھی گئی۔ آخر کوئی اس کا پیچھا کیوں کرے گا.....؟

اپنی تعلیم چھوٹ جانے کے ڈر سے اس نے اپنے والد اور بھائی کو کچھ نہ بتایا۔ روزانہ وہ کار محلے کے اندر آنے سے پہلے ہی دور کھڑی ہو جاتی۔ اب وہ کالج میں کچھ چپ چپ سی رہنے لگی۔ ہر وقت اسی کالی کار کے متعلق سوچتی رہتی۔ اب نہ تو اسے اس کی وجہ سمجھ میں آتی اور نہ ہی اس کا حل۔ اس نے بدنامی کے ڈر سے کالج میں بھی کسی لڑکی سے اس بات کا ذکر نہ کیا۔ کبھی بھی لڑکیاں اس کے چہرے کی چھپی ہوئی ادا کی کو بھانپ جاتیں مگر وہ اپنی ماں کو یاد کرنے کا بہانہ بنا کر ٹال دیتی۔

اسی طرح دن گزرتے گئے اور ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن وہ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک کار اس کے سامنے آ کر رُک گئی۔ اس کا تو دل دھڑکنے ہی بھول گیا۔ اس کے جسم پر لرزش طاری تھی۔ ہاتھ پیر کا پٹنے لگے۔ کار کا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک خوبصورت نوجوان باہر نکلا۔ شکل سے ہی کسی امیر گھرانے کا معلوم ہوتا تھا۔ کار کے شیشے بھی کالے تھے۔ اسی لیے زرناب کو کبھی اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ کار میں ایک لڑکا موجود ہوتا تھا۔ اس لڑکے نے آہستہ آہستہ زرناب کی طرف آنا شروع کیا۔ اس کے دل میں تھا

چپ چاپ منہ نیچے کئے اپنے راستے پر چلے گئی۔ اب وہ دل ہی دل میں منتظر تھی کہ یہ کار اس کے پیچھے آئے۔ کار پیچھے تو آئی مگر قریب سے تیزی سے گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ اس کا دل بجھتا اس نے کار میں سے کسی کو باہر کی طرف کاغذ کا ایک ٹکڑا پھینکتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس نے تیزی سے وہ ٹکڑا اٹھا کر اپنی کتاب میں چسپایا اور گھر کی طرف چلے گئی۔ اب وہ کمرے میں بیٹھی کاغذ پر لکھی تحریر کو پڑھنے لگی: ”معافی چاہتا ہوں۔ خط کا آغاز تو آپ کے نام سے کرنا چاہتا تھا مگر میں تو اتنا بھی خوش قسمت نہیں کہ اپنی محبت کا نام ہی جان سکوں۔ میں نے بہت کوشش کی اپنے آپ کو آپ سے دور رکھنے کی مگر ایسا نہ کر سکا۔ جب آپ نے مجھے اپنی عزت کا واسطہ دیا تو میں نے آپ کا پیچھا کرنا مناسب نہیں سمجھا مگر اس دل کا کیا کروں جو آپ سے بے پناہ محبت کرنے لگا ہے۔ یہ سخت مجھے چین سے جیسے نہیں دیتا۔ بس ہر وقت آپ کا پرکشش چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ میں ہرگز آپ کی بدنامی نہیں چاہتا۔ اگر آپ کو میری بات پر ذرا سا بھی یقین ہے تو صرف ایک بار مجھ سے مل لیں۔ میں دل کھول کر آپ سے اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد آپ کا جو بھی فیصلہ ہو مجھے منظور ہوگا۔ صرف ایک بار مجھ پر رحم کھائیے۔ آپ کے ہی کالج کے قریب تھوڑا سا آگے کی طرف ایک چائے کی دکان ہے، صبح جب آپ کالج آئیں تو برائے مہربانی پہلے آپ اس دکان پر آ جائیے گا۔ صبح کے وقت اس دکان پر کسی کے بھی آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوگا۔“

آپ کا منتظر، خرم۔۔۔

وہ جیسے جیسے خط پڑھ رہی تھی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا

جاتا دیکھ کر اس کے دل میں کوئی شیطانی خیال آ گیا ہوگا۔ اس نے ابھی بھی اپنے والد اور بھائی کو اس لڑکے کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ بات بہت بڑھ جائے گی۔

بڑی مشکل سے اس نے اپنے ذہن سے اس لڑکے کے خیال کو جھٹکا اور سو گئی۔ اصل بات تو یہ تھی کہ پہلی نظر میں اسے بھی خرم بہت اچھا لگا تھا۔ اگلے دن وہ کالج سے واپس آ رہی تھی مگر اب وہاں کوئی کالے رنگ کی کار نہیں کھڑی تھی۔ وہ گھر تو آ گئی مگر بہت بے چین اور بے قرار تھی۔ اندر ہی اندر اسے اس کار کا انتظار رہنے لگا تھا۔ اب اسے طرح طرح کے خیالات تنگ کرنے لگے۔

اس نے سوچا کہ ”خرم سچ ہی کہہ رہا تھا۔ تبھی تو جب میں نے اپنی عزت منی میں مل جانے کی بات کی تو وہ نہیں آیا۔ میرے لیے اور میرے گھر والوں کی عزت کے لیے۔“ اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اگر اس کی نیت میں کھوٹ ہوتا تو وہ کبھی بھی اسے نقصان پہنچا سکتا تھا مگر اس نے تو ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ بہت ہی شرافت سے فاصلے پر کھڑے ہو کر اپنی محبت کا اظہار کیا اور اب وہ اپنے آپ کو کونسنے لگی۔

”میں نے..... میں نے کیا کیا، آؤ دیکھنا نہ تاؤ جو منہ میں آیا بول کر چلی آئی۔ تم سے کم اس سے وقت تو مانگ سکتی تھی۔ خاموشی سے سب کچھ سن لیتی تو میرا کیا بیڑا جاتا۔ اب کیا کروں.....؟ اگر وہ نہ آیا تو.....“

اسی کشمکش میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ زرباب کا دل بھی بجھتا چلا گیا۔ اب وہ بالکل ناامید ہو چکی تھی کہ اچانک اسے وہی کالے رنگ کی کار دکھائی دی۔ اس کا دل خوشی سے چل اٹھا۔ اس کا دل چاہا کہ خود اس کے پاس چلی جائے مگر ایسا کرنے سے اس کی عزت پر حرف آتا تھا لہذا وہ

کی لڑکی نہیں کہ امیر لڑکوں کو اپنے پیچھے لگا لوں۔ برائے مہربانی آپ میرا پیچھا نہ کیا کریں۔ آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا مگر میری اور میرے گھر والوں کی عزت منی میں مل جائے گی۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔

جب وہ گھر پہنچی تو اس کا سانس اس قدر پھولا ہوا تھا کہ اس کا سانس لینا محال تھا۔ سانس کے ساتھ سانس نہیں مل رہا تھا۔ اس کی بہنیں اور والد اس کی یہ حالت دیکھ کر سخت گھبرا گئے اور اسے پانی پینے کے لیے دیا۔ اس نے گلاس منہ کو لگایا اور ایک ہی سانس میں پینے کی کوشش میں اسے غوطہ بھی آ گیا۔ والد نے التعمینان سے بیٹھ کر پانی پینے کے لیے کہا۔

کچھ دیر بعد جب اس کے حواس قائم ہوئے تو والد کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ایک پاگل ہاتھ میں پتھر لیے اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر گھر تک پہنچی۔ والد کے چہرے پر سکون کی لہر دوڑ گئی اور کہنے لگے تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔

مگر وہ انہیں یہ کیسے بتاتی کہ اس کی تو واقعی جان نکل گئی تھی خرم کی باتیں سن کر۔ اب وہ کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ بظاہر تو وہ سو رہی تھی مگر آنکھیں بند کر کے مسلسل خرم کے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ مسلسل خود سے ہمسکا تھی۔

”ایک امیر لڑکا میرا پیچھا کیوں کرے گا.....؟ کیا وہ مجھ سے واقعی اتنی ہی محبت کرتا ہے کہ ایک ماہ سے میرا پیچھا کر رہا ہے.....؟ اس کے پاس اتنا وقت تھا مجھ پر صرف کرنے کے لیے؟“ مگر ساتھ ہی اسے دنیا میں ہونے والے دھوکوں کا خیال بھی آتا کہ ہو نہ ہو وہ بھی ایک فراڈ ہی ہوگا جو میرا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ روز مجھے اکیلے آتا

کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے مگر اس کی ٹانگیں اور پیر اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ تو جیسے ساکت ہی ہو گئے تھے۔ قریب آ کر لڑکے نے نہایت ہی سلیکھ ہوئے انداز میں اپنا تعارف کرایا۔

”میرا نام خرم ہے اور میں ہی روز آپ کا پیچھا کرتا تھا مگر میرا مقصد ہرگز آپ کو پریشان کرنا نہیں۔ ایک دن اتفاق سے آپ کے کالج کے سامنے میری کار کا ٹائر پنچر ہو گیا تھا اور میں وہاں کھڑا ٹائر بدل رہا تھا کہ اچانک میری نظر آپ پر پڑی۔ آپ میرے دل کو اس قدر اچھی لگیں کہ جلدی سے ٹائر بدل کر میں آپ کا پیچھا کرنے لگا اور یہاں تک پہنچا۔ اس دن جب میں گھر واپس گیا تو یقین کیجئے میں صرف آپ کے خیالوں میں ہی کھویا رہا۔ میں روز آپ کا پیچھا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر نہ جانے کون سی کشش مجھے آپ کی طرف کھینچتی اور میرے قدم بغیر سوچے سمجھے آپ کے کالج کی طرف بڑھنے لگتے اور آپ کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آپ پہنچتا۔ روز سوچتا آپ سے اپنے دل کی بات کہوں مگر روز ہی کل بات کروں گا یہ سوچ کر چلا جاتا۔ آج بڑی مشکل سے اپنے اندر ہمت اکٹھی کر کے آپ کے سامنے آنے کی جرات کی ہے۔“

خرم تو بہت تیزی سے اس سے اپنے دل کا حال بیان کر رہا تھا مگر وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اسے تو خرم کی ایک بھی بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے تو یہ ڈر تھا کہ اگر کسی نے لڑکے کو اس کے پاس کھڑا دیکھ لیا تو خواجہ اس کی اور اس کے گھر والوں کی رسوائی ہوگی۔

بڑی مشکل سے زرباب کے منہ سے کچھ الفاظ نکلے اور اس نے تیزی سے کہا:

”میں تو آپ کو جانتی تک نہیں۔ پھر آپ کیوں میرے پیچھے اپنا وقت برباد کرتے ہیں۔ میں اس قسم

کہ وہ بھی کبھی کسی لڑکے کا خط یوں چھپا کر پڑھے گی۔ خیر یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، قسمت کا کھیل تھا۔ اب پھر سے وہ ایک شدید ذہنی کشاکش کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ منہ میں بیڑا نہ لگی، اسے وہاں جانا چاہیے یا نہیں۔ اگر وہ وہاں گئی تو اس کے ساتھ کچھ برائہ ہو لیکن اگر کچھ برا ہوتا تھا تو اب تک ہو چکا ہوتا اور وہ دن دیہاڑے مجھے اس طرح دکان پر بلا رہا ہے کون سا اپنے ساتھ کہیں اور جانے کا کہہ رہا ہے۔ اب اس نے خرم سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ خود بھی اس سے مل کر سب باتیں صاف کر لیتا چاہتی تھی۔ قسمت نے اسے جس دوراے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا، اب وہ اس سے باہر نکلتا چاہتی تھی۔

اگلے دن جب وہ کالج جانے کے لیے گھر سے نکلی تو کچھ قدم تو آگے کی طرف بڑھ رہے تھے اور کچھ پیچھے گھر کی طرف جاتے۔ وہ ابھی بھی تذبذب کا شکار تھی۔ بلاآ خر وہ کالج پہنچ گئی۔ کالج سے آگے بڑھی تو کمر پر ایک چائے والے کی دکان تھی جو آج سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی یا شاید کبھی توجہ نہیں دی تھی۔

دکان کے باہر کالے رنگ کی خرم کی کار کھڑی تھی۔ وہ بہت حوصلے کے ساتھ دکان کے اندر داخل ہوئی۔ خرم اس کا منتظر تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بے یقینی کے آثار تھے۔ اس نے اسے بیٹھنے کو کہا اور چائے والے سے چائے لانے کا بھی کہا۔ اب خرم نے اپنے دل کا حال بیان کرنا شروع کیا۔

”مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا کہ آپ میرے سامنے ہیں۔ اچھا اب تو اپنا نام بتادیں۔“ جب اس نے زرناب کا نام سنا تو حیرت سے کہنے لگا۔ بہت ہٹ کر ہے، بہت منفرد بھی بالکل آپ کی طرح۔ سب سے پہلے تو زرناب نے اسے آپ آپ کہہ کر

مخاطب کرنے سے منع کیا۔ جب اس نے اپنی محبت کا اظہار کر دیا جو کہ وہ پہلے بھی کر چکا تھا تو زرناب نے اپنے دل کے خدشات اس کے سامنے رکھ دیئے اور کہنے لگی:

”وہ کیسے یقین کرے کہ اتنے امیر لڑکے کو ایک غریب سی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے، اسے محبت کرنا نہیں امیروں کی دل لگی کہتے ہیں۔“

اس کی یہ بات سننے کے ساتھ ہی وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا مگر پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا کہ یہ دل لگی تو جب ہوتی ہے جب محبت کو بچ راستے میں چھوڑ دیا جائے مگر میں تو تم سے شادی کروں گا۔ اگر تم اجازت دو گی اور میری محبت کو قبول کر لو گی تو میں بہت جلد اپنے گھر والوں کو رشتے کی بات کرنے کے لیے تمہارے گھر پہنچ دوں گا۔

یہ سن کر تو زرناب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ اب اس کے بعد تو مزید بات کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی جیسے ایک گہری سوچ میں ڈوب گئی ہو اور نہایت محبت بھری نظروں سے خرم کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”پھر تم کب پہنچ رہے ہو اپنے گھر والوں کو میرے گھر۔“

اس بات کا صاف مطلب تھا کہ وہ بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ ویسے بھی خرم نے تو اس کی نگاہوں میں چھپی محبت کو اسی دن دیکھ لیا تھا جب پہلی دفعہ وہ اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ تو یہ سب کچھ صرف اس لیے کر رہا تھا کہ وہ اس کے منہ سے سنا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی اپنی محبت کا اظہار کرے مگر اب تو اسے اس سے شادی کے لیے بھی رضامندی مل چکی تھی۔

زرناب شرما کر اٹھی اور خوشی خوشی کالج چلی گئی۔ تمام راستے وہ اسی کے خیالوں میں کھوئی رہی۔ ایک ایسی رنگین خوابوں کی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی جہاں

اسے اپنی منزل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اسے اپنی قسمت پر ناز ہونے لگا اور اترانے بھی لگی کہ یونہی راہ چلتے اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ مل گیا مگر وہ ہرگز یہ نہیں جانتی تھی کہ جسے وہ اپنے خوابوں کا شہزادہ سمجھ رہی تھی وہی اس کے خوابوں کو چکنا چور کرے گا اور جس سے وہ اپنی محبت کا اظہار کر کے آئی ہے وہی اس کی محبت کی دھجیاں اڑا دے گا۔

دوسری طرف خرم کلب میں سمیعہ، اقصیٰ اور بتول کو بتا رہا تھا کہ کیسے اس نے معصوم زرناب کو اپنے چنگل میں پھنسایا، انہیں تو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اپنے بنائے ہوئے منصوبے میں کامیاب ہو چکی تھیں مگر جب انہوں نے سنا کہ خرم تو واقعی زرناب سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے تو وہ حیران ہو گئیں، وہ نہیں جانتی تھیں کہ خرم اس سے مذاق ہی مذاق میں بات کو شادی تک لے جائے گا لیکن ساتھ ہی اس کی یہ بات سن کر اطمینان ہو گیا کہ ان کے ساتھ ساتھ ساری دنیا بھی زرناب کا تماشا دیکھے گی۔ وہ اس کی زندگی میں ایسا طوفان لائے گا جس سے وہ ساری زندگی باہر نہیں نکل سکے گی۔ اب تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ کافی وقت لگا تمہیں اسے قابو کرنے میں۔ خرم کہنے لگا وقت تو لگا مگر پھنس تو گئی۔ میں نے اس کے گرد ایسا جال پھیلایا تھا کہ اس سے بچ کر جانا اس کے اختیار میں نہ تھا، اسے تو پھنسا ہی تھا۔ یہ کہہ کر وہ سب تہقہہ لگا کر زور زور سے ہنسنے لگے۔

ادھر زرناب اس بات سے بالکل بے خبر تھی۔ وہ جو کالج میں لوگوں کی جال، ڈھال، رنگ، ڈھنگ سے ان کی شخصیت کو پڑھتی تھی آج اپنے ہی جیون ساتھی کو پہچانے میں نرس چوک گئی۔

اب تقریباً روزانہ ہی ان دونوں کی ملاقات اسی چائے والی دکان پر ہونے لگی اور وہ ایک دوسرے کو

مزید جاننے لگے اور اب بات رشتے تک پہنچی۔ خرم نے اپنے ماں باپ کو زرناب کے گھر بھیجا۔ اس کے والد اور بھائی نے اتنے امیر گھرانے سے رشتہ آنے پر فوراً ہاں کر دی۔ وہ تو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے لگے کہ بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا رشتہ خود جل کر ان کے گھر آیا تھا۔ وہ اس غبار میں یہ بھی بھول گئے کہ انہیں ان کی جانچ پڑتال تو کرنی چاہیے۔ گلی میں گلی کاروں کی قطار نے محلے داروں کو بھی حیران کر دیا، جن میں زرناب اور اس کے گھر والوں کے لیے بہت سارے تحائف تھے۔ اس دن سے پہلے اس محلے میں تو اس طرح دھوم دھام سے کسی کی بارات بھی نہیں آئی تھی۔ سب لوگ زرناب کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ شادی کی تاریخ بھی ہو گئی چونکہ زرناب کے بی اے کے امتحانات بالکل سر پر تھے اس لیے شادی کی تاریخ امتحانات کے فوراً بعد کی رکھی گئی۔ امتحانات کے دوران زرناب اور خرم تقریباً روز ہی مل لیتے مگر اب چونکہ امتحانات ختم ہو چکے تھے اور وقت بھی اتنی تیزی سے گزر گیا کہ شادی میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا اس لیے ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی ختم ہوا۔

اب انہیں ایک ہفتے تک ایک دوسرے کا انتظار کرنا تھا۔ ان کی فون پر بات چیت زیادہ ہونے لگی۔ زرناب کے گھر والوں نے تھوڑے سے وقت میں شادی کی معقول سی تیاریاں کیں جو وہ با آسانی کر سکتے تھے کیونکہ لڑکے والوں نے جہیز لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اس لیے شادی کے بوجھ کا ایک بہت بڑا حصہ تو ان کے کندھوں سے ویسے ہی اتر چکا تھا۔ آخر وہ ارماتوں بھرا دن آئی گیا جس کا بے صبری سے انتظار تھا۔ جس دن خرم نے زرناب کے گھر بارات لے کر آئی تھی۔ والد اور بھائی نے گھر کو بہت اچھی طرح سجایا۔ پورا گھر لال پیلی

روشنیوں سے جگمگ کر رہا تھا۔ دیگوں میں اچھا پکوان پک رہا تھا جس کی خوشبو نے پورے محلے کو لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔

زرناب کے گھر میں تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سب رشتہ دار اکٹھے ہو چکے تھے۔ کراچی سے اس کے چچا بھی آئے ہوئے تھے لہذا بارات کے استقبال کا انتظام باہر گلی میں کیا گیا اور دلہے کے بیٹھنے کے لیے سٹیج باہر گلی میں بنوایا گیا۔

بارات کے آنے کا وقت رات آٹھ بجے کا تھا۔ آج صبح سے ان دونوں کی بات نہیں ہوئی تھی۔ شادی کی مصروفیت ہی اس قدر زیادہ ہوتی ہے۔ زرناب کو بھی دہن بننے کے لیے وقت درکار تھا اور خرم کو بھی تو دلہا بننے کے لیے پارلر جانا تھا۔

زرناب دہن بن کر اور بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔ سرخ رنگ کا جوڑا اس پر بہت بیچ رہا تھا۔ کچھ اپنی محبت کو پالینے کا رنگ اس کے چہرے سے صاف چھلک رہا تھا۔

بارات کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ سب لڑکیوں نے بارات کے استقبال کے لیے اپنی اپنی تھالیاں سجالیں۔ رات کے دس بج چکے تھے مگر بارات ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کسی نے ابھی اس بات کی فکر نہ کی کیونکہ شہر میں تو باراتوں کا لیٹ ہونا معمول کی بات ہے مگر جب 12 بج گئے اور بارات کی کچھ خبر خبر ہی نہ ہوئی تو پریشانی سب کے چہرے پر نظر آنے لگی۔ اگر بارات کسی بھی وجہ سے اتنی لیٹ ہو جائے تو لڑکی والوں کو کچھ نہ کچھ اطلاع تو دی جاتی ہے۔ اب زرناب کے والد اور بھائی تشویش میں پڑ گئے کہ بارات اب تک کیوں نہیں پہنچی یا خرم کے گھر والوں نے ابھی تک کوئی رابطہ کیوں نہیں کیا۔ لوگوں نے بھی طرح طرح کی باتیں کرنا شروع کر دیں کہ یہ تو پہلی دفعہ ہوا ہے

کہ دلہن تیار ہو اور دلہا لینے ہی نہ آئے۔

زرناب کے والد نے ان تمام نمبروں پر رابطے کی کوشش کی جو خرم نے انہیں دیئے تھے۔ وہاں کھنٹی تو جاتی مگر کوئی اٹھاتا نہ تھا اور اٹھاتا بھی کیسے، یہ تو خرم کی رچائی ہوئی سازش کا حصہ تھا، اب زرناب نے بھی اس موہاں نمبر پر رابطے کی کوشش کی جس پر وہ اکثر باتیں کیا کرتے تھے لیکن وہ مسلسل بند جا رہا تھا۔ وقت کی رفتار تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔

پہلے ایک اور اب 2 بج چکے تھے۔ اب تو بارات آنے کی کوئی امید ہی نہ تھی۔ زرناب کے والد اور بھائی تو اسنے امیر گھرانے سے رشتہ آنے کی وجہ سے اس قدر دیوانے ہو گئے تھے کہ انہوں نے بھی ان کے گھر کے متعلق پوچھا ہی نہیں اور شادی میں بھی صرف ایک ماہ کا عرصہ ڈالا تھا جو کہ شادی کی تیاری کے لیے بھی کافی نہ تھا۔

اب کیا تھا سوائے ذلت اور بدنامی کے۔ بہت سارے لوگ تو انتظار کر کے جا چکے تھے اور کچھ لوگوں کو منت سماجت کر کے زرناب کے گھر والوں نے روک رکھا تھا۔

زرناب کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ قسمت نے اس کے ساتھ یہ کیسا مذاق کیا ہے۔ یہ قسمت اسے کس موڑ پر لے آئی تھی۔ طرح طرح کے مثبت اور منفی خیالات اس کے ذہن کو گھیرے ہوئے تھے۔ کبھی وہ سوچتی کہ خرم اور اس کے گھر والوں کے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو لیکن اگر کوئی حادثہ ہوتا تو پھر بھی وہ لوگ کسی نہ کسی طرح رابطے کی کوشش ضرور کرتے کیونکہ وہ بھی تو وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہیں، پھر کبھی اس کے دل میں خرم کی محبت کو لے کر شک بھی آتا پھر وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کرنے لگی۔

”اگر خرم نے مجھ سے شادی نہیں کرنی تھی تو پھر وہ سب کیا تھا۔ میں نے تو اس سے شادی کے

کے ساتھ کر دیا گیا اور اس کی رخصتی بھی ہو گئی۔ وہ چپ چاپ یہ سہہ گئی کیونکہ خرم نے اس کے سامنے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔

ادھر خرم اس بات سے بے خبر تھا کہ زرناب کی ڈولی اٹھ چکی ہے۔ وہ کلب میں انہی لڑکیوں کے ساتھ اپنی شرط جیتنے کی خوشی میں مست تھا۔ وہ تو واقعی ہی زرناب کی زندگی میں طوفان لانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

حزہ زرناب کو لے کر کراچی میں اپنی رہائش گاہ پر آ گیا۔ اس کے گھر والوں نے دل کھول کر کرنی ٹوبلی دہن کا استقبال کیا۔ آخر وہ اس کے چچا کا بھی تو گھر تھا۔ سب اس کے اپنے ہی تھے اور انہیں بھی اس کے ساتھ ہونے والے دھوکے کا رنج تھا مگر کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ حزہ کو تو اس کے صبر کا پھل مل رہا تھا۔

زرناب کو اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس کا جیون ساتھی اب کوئی بھی ہو۔

اگرچہ زرناب کو پالینے کی خوشی سے حزہ کا دل پھولے نہیں سا رہا تھا۔ وہیں اس کے چہرے پر جمائی ہوئی مایوسی اور اس کے ساتھ ہونے والے اجموے کا بھی رنج تھا۔ وہ اسے اس قدر اذیت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اب وہ اور زرناب کمرے میں اکیلے موجود تھے۔ حزہ نے اس کے ساتھ اٹھارہ افسوس بھی کیا اور اپنے اس اچانک فیصلے کی وضاحت بھی کی۔ وہ کہنے لگا کہ میں اپنے تایا کی عزت کو یوں پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سچی تو میں نے تمہارا ہاتھ تھامنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر زرناب تو خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایسی بے حس و حرکت مجسمہ بنی جیسے وہ دل کے ساتھ ساتھ جان بھی چھوڑ آئی ہو۔

حزہ کے دل میں آیا کہ وہ اسے اپنی محبت کا کیسے یقین دلائے کہ اس کا دل بھی بچپن سے اس کی

لیے نہیں کہا تھا۔ وہی آیا تھا میرے پیچھے۔ آخر اس نے کس دشمنی کا بدلہ لیا ہے مجھ سے۔ میں نے اس کا کیا پاؤں اڑا تھا۔ لیکن نہیں! ہم تو ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے پھر وہ اس طرح کا دھوکہ مجھے کیسے دے سکتا ہے۔“

زرناب ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھی۔ ادھر اس کے چچا کا بیٹا حزمہ جو کہ اس سے بچپن سے ہی محبت کرتا تھا مگر اپنی محبت کا اظہار کبھی نہ کر سکا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی محبت کا اظہار کرتا خرم زرناب کی زندگی میں آ چکا تھا۔ وہ بے حد امیر لڑکا تھا اور زرناب بھی اس سے دل و جان سے محبت کرتی تھی اسی لیے حزہ خاموش ہو گیا۔ اب صحیح موقع تھا اپنی محبت کے اقرار کا اور اپنی محبت کو ذلت و رسوائی سے بچانے کا بھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے اپنے تایا سے زرناب کا ہاتھ تھامنے کی بات کی۔

اس وقت تو انہیں حزہ کی پیشکش مجرہ کی طرح نظر آنے لگی جیسے اللہ نے حزہ کی شکل میں فرشتہ بھیج دیا تھا ان کی عزت و آبرو کو بچانے کے لیے۔ انہوں نے فوراً حزہ کی پیشکش قبول کر لی اور اندر کمرے میں جا کر زرناب کو اپنا فیصلہ سنایا کہ اس کا نکاح آج ہی اسی وقت حزہ کے ساتھ ہوگا۔ وہ تو ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں سے باہر ہی نہ نکلی تھی۔ لوگوں کی باتیں سن کر وہ یہ سوچنے پر مجبور تھی کہ خرم نے اسے دھوکہ دیا ہے مگر اس کا دل ابھی تک خرم کو گنہگار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اس کا ایک ماہ تک پچھا کرنا، اس کا بے قراری سے انتظار کرنا کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ سب ایک دکھاوا تھا.....؟ جھوٹ تھا.....؟ صرف اور صرف دھوکہ تھا.....؟ آخر کیوں ”یہ سب کیوں ہوا؟“

اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس دوہری ذہنی کیفیت میں اس کا نکاح حزہ

ادھر خرم کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی زرناب سے وابستگی کا اندازہ ہونے لگا۔ پہلے تو کچھ دن اس نے محسوس بھی نہ کیا مگر جوں جوں وقت گزرنے لگا اسے اپنی زندگی میں زرناب کی کمی محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھاتا کہ یہ سب اس کا وہم ہے۔ وہ کیسے کسی لڑکی سے محبت کر سکتا ہے۔ اس کی زندگی میں کسی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ تو صرف شرط جیتنے کا جنون تھا جو اسے زرناب کے قریب لے گیا مگر اس چھ ماہ کے عرصے میں اسے یقین ہو گیا کہ وہ سچ میں زرناب سے محبت کرنے لگا تھا پھر اسے اپنے رویے کا خیال بھی آتا کہ جو سلوک اس نے زرناب کے ساتھ کیا تھا وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ پھر خرم سوچنے لگتا کہ وہ اس کے پاس جائے گا۔ گزرتا کرتا کہ اپنے گناہ کی معافی مانگے گا۔ اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے گا۔ ہاتھ جوڑ کر اس کے گھر والوں سے اس کا رشتہ مانگے گا اور سب لوگوں کے سامنے اسے بیاہ کر اپنے گھر لے آئے گا۔ اس طرح اس کی بھی عزت محفوظ ہو جائے گی اور مجھے بھی منزل مل جائے گی۔

ایک دن خرم نے زرناب کے گھر کا رخ کیا۔ وہ اس کے گھر پہنچا تو گھر پر تالا تھا۔ ساتھ والے گھر سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ زرناب کی شادی اس کے چچا کے گھر ہو گئی تھی جو کراچی میں رہتے ہیں۔ اس کی بہنیں اپنے والد کے ہمراہ کراچی اسی کے پاس گئی ہیں۔

زرناب کی شادی کا سن کر تو خرم کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی یہ سب ہو سکتا ہے۔ اب پہچھتاوے کا مزید بوجھ اس کے سینے پر تھا اور اسے لگتا تھا کہ اس کے نیچے دب کر اس کا دم گھٹ جائے گا مگر اس نے زرناب کی محبت

محبت سے سرشار تھا مگر یہ مناسب وقت نہیں تھا اظہار محبت کے لیے۔ ابھی ابھی تو اس کے دل پر ایک ایسا گھاؤ لگا تھا کہ شاید اس کا تو اعتماد ہی اٹھ گیا تھا۔ اپنے آپ سے بھی اور محبت سے بھی۔ لہذا حزمہ نے اس کا دھیان بنانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں لیں مگر کاردار نہ ہوا۔ کچھ حاصل نہ ہوا۔

حزمہ نے زرناب کو سمجھوتہ کرنے کا بھرپور موقع دیا۔ وہ اسے اسکی خوشی سے پانا چاہتا تھا۔ ایک ماہ کا عرصہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا۔ اتنی شوخ و چنچل اور باتیں کرنے والی لڑکی کو تو چپ بن لگ گئی تھی۔ وہ ہر وقت خرم کے بارے میں سوچتی رہتی۔ آخر اس دن کیا ہوا ہوگا..... کیوں نہیں آیا خرم اسے لینے کے لیے اور اگر اس نے اسے دھوکا دیا تھا تو وہ ایک بار خرم سے مل کر اپنا جرم چاہتی تھی جس کی خرم نے اسے اتنی بڑی سزا دی تھی۔

حزمہ ایک بہت ہی اچھا انسان تھا مگر زرناب کے اعتماد کو اس قدر نہیں پہنچ چکی تھی کہ وہ حزمہ کے حصے کا پیار بھی اسے نہیں دے سکی۔ یہ بات اسے اندر ہی اندر چھپتی تو ضرور مگر وہ بے بسی بھی۔ خرم نے جس محبت کا رنگ اس کے دل پہ چڑھایا تھا وہ اتنا آسان نہ تھا۔ اس کے دل کے کسی حصے میں خرم کا خیال رہتا اور اس کی آنکھوں میں ہر وقت اس کا انتظار ہوتا۔ وقت دیرے دیرے گزرنے لگا اور چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ کسی حد تک زرناب حزمہ کو اپنے شوہر کی شکل میں قبول کر چکی تھی۔ وہ اپنے باپ کی بچی مکی عزت کے لیے اس کے گھر میں آباد تھی مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں خرم کا انتظار اور بھی بڑھنے لگا کیونکہ خرم کا نہ آنا اس کے لیے ایک معمہ بن چکا تھا اور وہ اس سے مل کر صرف اور صرف اپنی خطا پوچھنا چاہتی تھی جس کی اسے اس نے اتنی بڑی سزا دی تھی۔

اور کہنے لگا وہ اس کا منتظر رہے گا اور اسے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گی۔

زرناب اب پھر کسی بھی قسم کا فیصلہ کرنے کی حالت میں نہ تھی مگر ایک بات تو طے تھی کہ وہ خرم کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی تاکہ وہ اس سے مل کر پوچھ سکے کہ اس نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا پتہ چلے کہ وہ اس سے ملنے کے لیے ہوٹل جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اسے یہ بھی تشویش تھی کہ خرم اس کے گھر تک کیسے پہنچا تھا مگر یہ بھی اس سے مل کر ہی جانا جا سکتا تھا۔

زرناب گھر سے ڈاکٹر کے پاس جانے کا بہانہ کر کے ٹیکسی میں اسی ہوٹل تک جا پہنچی جس کا پتہ خرم نے بتایا تھا۔ اب زرناب کمرہ نمبر 201 میں خرم کے سامنے کھڑی تھی اور بے صبری سے خرم کے جوابوں کی منتظر تھی۔

خرم نے زرناب کو سب سچ سچ بتانا شروع کیا۔ اس دن سمیعہ، بتول اور اقصیٰ کے ساتھ لگی شرط سے لے کر آخری بارات والے دن تک۔ اس نے بتایا کہ وہ چائے والی دکان بھی نکلتی تھی اور اس کے ماں باپ کرائے کے خریدے ہوئے تھے۔ اس کے تو اصل ماں باپ کو پتہ بھی نہیں ہوگا کہ اس وقت ان کا بیٹا کہاں ہے۔

سمیعہ، بتول اور اقصیٰ کے نام سن کر زرناب ہل کر رہ گئی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسے زنج کرنے کے لیے وہ اس قدر گر جائیں گی۔

اب زرناب کھٹکتی باندھے خرم کو دیکھنے لگی۔ خرم اس کے قدموں میں گرا ہوا تھا اور اس سے اپنے گناہ کی معافی مانگ رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اقرار کر رہا تھا کہ وہ آج بھی زرناب سے بہت محبت کرتا ہے۔ محبت کا نام سنتے ہی زرناب نے خرم کو کھڑا کیا اور اس کے منہ پر زوردار طمانچہ مارا اور کہنے لگی ”جانتے

کو قریب سے دیکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے بے حد محبت کرتی تھی۔ یہ شادی یقیناً اس کی مرضی کے خلاف ہوئی ہوگی۔ اب وہ بھی زرناب سے مل کر سب کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اس نے انہی گھر والوں سے زرناب کے چچا کے گھر کا پتہ پوچھا اور کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ گو کہ ہوائی جہاز کے ذریعے وہ ڈیڑھ گھنٹے میں لاہور سے کراچی پہنچ گیا تھا مگر یہ ڈیڑھ گھنٹہ کا وقت اس کے لیے صدیوں سے کم نہ تھا۔ وہ بے قرار تھا۔ اس لمحے کے لیے جب وہ زرناب سے ملے اور اسے دل کا حال بتائے اور اپنے کئے کی معافی بھی مانگے۔

کراچی پہنچ کر اس نے ہوٹل میں رہنے کا بندوبست کیا کیونکہ وہاں اس کا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ اس نے جلدی سے سامان رکھا اور زرناب کے گھر کی طرف نکل پڑا کیونکہ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ وہ زرناب سے مل کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ تمام راستے وہ طرح طرح کی سوچوں میں ڈوبا رہا مگر جب اسے زرناب کی شادی کا خیال آتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا مگر اس کی محبت کا یقین اپنے دل میں لے کر وہ آیا تھا۔

دروازے پہ کھنٹی بجی۔ زرناب نے دروازہ کھولا تو وہ خرم کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا انتظار ختم ہو چکا ہے اور وہ تمام سوالات جو زرناب کے دل میں چھپے تھے وہ خرم کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر اجاگر ہو گئے۔

زرناب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی خرم نے کہنا شروع کیا۔ ”میں یہاں تمہارے ان تمام سوالات کا جواب دینے ہی آیا ہوں۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ اس دن کیا ہوا تھا مگر اس کے لیے ہمیں کسی اور الگ تھلگ اور پرسکون جگہ پر ملنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر خرم نے اسے اپنے ہوٹل کا نام اور پتہ بتایا اور کمرہ نمبر بھی بتایا

اور حمزہ کے جڑ جانے کے اس قسمت کے فیصلے کو خرم کے لیے سزا ماننے لگی اور کہنے لگی یہ وہ سزا ہے جو پل پل تمہیں تمہارے دھوکے کی یاد دلاتی رہے گی۔ خرم اسے دہائیاں دینے لگا، اللہ کے واسطے ڈالنے لگا۔ دراصل اس کے دل میں منزل پر پہنچ کر خود ہی اپنے ہاتھوں اپنی محبت کا گلا گھونٹنے کا بیج تھا جو اسے اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھائے جا رہا تھا اور وہ ایک سوکھے پتے کی طرح زرناب کے قدموں پہ پڑا تھا مگر اب زرناب کیا کر سکتی تھی۔ وہ حمزہ کو اپنی محبت اور خود غرضی کے لیے کیسے چھوڑ دیتی جس نے اس دن اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھر والوں کی زندگی اور عزت کو محفوظ رکھا تھا۔ وہ تو اس کا احسان ساری زندگی بھی اس کی باندی بن کر نہیں اُتار سکتی تھی۔

اب خرم کے پاس ایک آخری ہتھکنڈا تھا جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کا۔ اس نے کہا کہ اگر وہ اسے نہ ملی تو وہ اپنی جان دے دیگا مگر زرناب اس وقت خرم کی کسی بھی طرح کی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھی اور وہ اسے یہ کہہ کر کمرے سے باہر آ گئی کہ آئندہ وہ اس کا پیچھا نہ کرے۔ ایک بار تو وہ اس کا پیچھا کر کے اس کے قریب آ گیا تھا مگر اس بار وہ اس کا جتنا پیچھا کرے گا اس سے اتنا ہی دور ہوتا جائے گا۔ بہتر ہے کہ تم ایک دل فسون یاد بن کر رہی رہ جاؤ۔

زرناب تو یہ بات بول کر اپنے گھر واپس چلی گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ خرم اس وقت کس ذہنی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ اس قدر جنونی اور جذباتی ہو چکا تھا کہ وہ زرناب کی خاطر اپنی جان لینے کے لیے واقعی تیار تھا۔ اپنے پیروں پر خود ہی کھلاڑی مارنے کے خیال نے اسے مزید جنونی کر دیا تھا۔ اس نے بہت ساری نشا آور گولیاں کھالیں اور زمین پر گر گیا۔ ادھر زرناب اس بات سے بالکل انجان تھی کہ

بھی ہو محبت کا مطلب؟ تمہاری اسی محبت نے میری زندگی بربادی کے دہانے پر لا کر کھڑی کر دی تھی۔ وہ تو بھلا ہو حمزہ کا اگر وہ اس دن میرا ہاتھ نہ تھامتا تو شاید آج تم یہ سب باتیں میری قبر پر کھڑے ہو کر کر رہے ہوتے۔ اچھا ہی ہوتا کہ تم واپس نہ آتے اور تمہاری اس گھناؤنی حرکت سے پردہ نہ اٹھتا مگر خرم تھا کہ اس کی آنکھوں سے لگا تار آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ اپنے کئے پر بے حد پشیمان تھا۔ پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا، مارو مجھے اور مارو میں مار کے ہی قابل ہوں مگر مجھے معاف کر دو۔ تمہارے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تم حمزہ کو چھوڑ دو میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں گا اور ہم کہیں دور چلے جائیں گے۔

زرناب خرم سے ایک قدم پیچھے ہٹی اور کہنے لگی کہ اگر تم آج بے وفا نہ بھی ثابت ہوتے اور اس دن اپنے نہ آنے کی کوئی ٹھوس وجہ بھی بتاتے تو بھی میں ایسا نہ کرتی۔ میں ایک مشرقی لڑکی ہوں، میری حمزہ سے شادی ہوئی ہے کوئی مذاق نہیں جو چھوڑ دوں اس فرشتہ سیرت انسان کو تمہارے جیسے دھوکے باز انسان کے لیے۔ جو پہلے نہ میرا بن سکا اب کیسے بنے گا۔ اب تمہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ میں حمزہ کی ہو چکی ہوں اور چاہ کر بھی تمہارے پاس واپس نہیں آ سکتی۔

”چاہ کر بھی“ خرم نے ایک دم مشتعل ہو کر کہا یعنی تم آج بھی مجھ سے پیار کرتی ہو۔ صرف اس معاشرے کے ہاتھوں مجبور ہو تو آؤ اس معاشرے سے ہم کہیں دور چلے جاتے ہیں۔“ مگر زرناب اس کی بات سے لگا تار انکار کرتی رہی۔ بے شک وہ اس سے محبت بھی کرتی تھی مگر اب خرم اس کے دل میں خاموش محبت بن کر رہ گیا تھا۔ گو کہ اس کے دھوکے کو زرناب بھلائے نہ بھول سکتی تھی مگر وہ اپنے

وہاں سے چلا گیا۔

ابھی زرناب سکتے میں ہی تھی کہ آپریشن تھیر کی لال بتی بجھی اور ڈاکٹر نے باہر آ کر کہا کہ وہ زیادہ دیر ہو جانے کی وجہ سے خرم کو نہیں بچا سکے۔ زرناب پر تو مصیبتوں اور دکھوں کا کھر ٹوٹ پڑا تھا۔ ایک طرف تو حمزہ اسے سمجھے بغیر طلاق دے کر جا رہا تھا اور دوسری طرف خرم ایک بار پھر اسے بارات والے دن کی طرح بے یقینی کی کیفیت میں دورا ہے پر چھوڑے جا رہا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر خرم کو پکارنا چاہتی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی مگر اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شدید ذہنی صدمے کی وجہ سے اس کی آواز کھو چکی تھی۔ وہ اپنے بالوں کو نوچنے لگی اور پاگلوں کی طرح دیواروں سے سر ٹکرانے لگی۔ وہ ایسی بے بسی اور ایک ایسے کرب میں غرق ہو چکی تھی جہاں اس کی جھولی بالکل خالی تھی، نہ تو وہ حمزہ کو اپنے دل کا حال سناسکی اور نہ ہی خرم کو اپنا بنا سکی۔

زرناب کی زندگی میں کئی طوفان آئے اور آ کر گزر گئے مگر اس بار کی کبک زرناب کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کے ہوش و حواس بھی لے گئی اور زرناب پر پاگل خانے کی مہر لگ گئی۔

کئی زندگیاں اس ایک شرط کی نذر ہو گئیں۔ جہاں خرم جیسا جی دار لڑکا اپنی زندگی سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ وہیں زرناب جیسی شوخ و چنچل اور ہنستی مسکراتی زندگی سے باتیں کرتی لڑکی پاگل ہو گئی اور اس کی زندگی ایک سولید نشان بن کر رہ گئی۔ ”یہ سب کیوں ہوا.....؟“

دل ٹوٹنے کا سبب بنتا گیا مسلسل ایک کے بعد ایک زخم لگتا گیا مسلسل نہ وقت برا تھا، نہ شکوہ زمانے سے قسمت نے ہمیں دھوکہ دیا مسلسل

خرم نے اپنے ساتھ کیا کیا۔ وہ خود کون سی پرسکون تھی۔ اس کے سینے پر بھی بوجھ تھا جو کسی کے ساتھ ہلکا کرنا تو دور اس کا ذکر کرنا بھی غلط تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر دیر اندر آیا تو خرم کو زمین پر گرا دیکھ کر اس نے اپنے سینٹر سٹاف ممبرز کو بلایا۔ خرم کی سانسیں ابھی چل رہی تھیں۔ وہ اسے بیہوشی کی حالت میں ہسپتال لے گئے۔ اس کے گھر والوں کو اطلاع دینے کی غرض سے اس کے کمرے کی تلاشی لینے پر انہیں حمزہ کے گھر کا پتہ ملا۔ پتے کے اوپر زرناب کا نام واضح لکھا تھا لہذا وہ زرناب کے گھر گئے اور اسے خرم کی صورتحال کے متعلق بتایا۔ زرناب کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ جانتی تھی کہ کراچی میں اس وقت اسکے علاوہ خرم کا کوئی اور جاننے والا نہ تھا اور ایک انسان کا دوسرے انسان سے انسانیت کا رشتہ بھی تو ہوتا ہے اور ویسے بھی زرناب لاکھ چھپانی وہ اب بھی خرم سے محبت تو کرتی ہی تھی۔ حمزہ اسی کے پیچھے کھڑا تھا مگر حمزہ کو کچھ بتائے بغیر ہی وہ ٹیکسی کی طرف لپکی اور ہسپتال پہنچ گئی جہاں خرم کا آپریشن چل رہا تھا۔ زرناب کے پیچھے پیچھے حمزہ بھی پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ زرناب حمزہ کو کچھ بتاتی حمزہ نے کہا۔

”میں جانتا ہوں اندر جو لڑکا زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے وہ خرم ہی ہے اور اس نے تمہاری جدائی کے غم میں خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے اور تم بھی اندر ہی اندر ہمیشہ خرم کا ہی انتظار کرتی تھی۔ اب میں تم دونوں کی محبت کے درمیان نہیں آؤں گا۔ میں آج سے تمہیں آزاد کرتا ہوں۔ اپنے اور تمہارے بیچ بندھے اس رشتے سے آزاد کرتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ زرناب اس سے اپنی اور خرم کی ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتاتی کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی ہے، حمزہ اسے طلاق دے کر

طور پر فخر محسوس کریں گے۔ ایک پیدائشی فنکار کو بھلا کیا عذر ہو سکتا ہے چنانچہ میں نے افسانے کے وسیع خلا کو پر کرنے کا عزم کر لیا اور دل میں یہ طے کیا کہ کام تھوڑا اور رولا بہت (شور زیادہ) یعنی پی آر پر زور رکھا جائے۔ ابتدا میں مقامی سطح پر ایک ادبی قبضہ گروپ کی داغ بیل ڈال دی جائے اور جب اس کی وسعت پذیری دیگر شہروں کو اپنی پلیٹ میں لینے لگے تو گھر بیٹھے نوواردگان ادب کی ادنیٰ کاوشوں پر اپنی قیمتی آراء بصورت ٹائٹل، فلیپ، پیش لفظ، دیباچہ وغیرہ بعوض نقد نذرانہ عطا کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ میں نے مستقبل قریب میں اس ادبی خدمت کو بہ احسن و خوبی چلانے کی غرض سے اپنی قیمتی آراء کے مختلف نمونے بھی ترتیب دینے شروع کر دیئے اور فیصلہ کیا کہ بعد ازاں ان پروفارمز (Proformas) کی فوٹو سٹیٹ کرا لوں گا تاکہ طلب گاران آراء کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

ویسے تو اپنا ہر افسانہ ہی ایسے لگا جیسے وہ ادب عالیہ کا حصہ بننے کے لیے تخلیق ہوا ہو لیکن جلد ہی دو تین کہانیاں کچھ اس انداز سے شائع ہو گئیں کہ افسانہ نگار کی بڑی من موافق سی تصویر مع ڈاک کا مکمل پتہ بھی اس خلوص نیت کے ساتھ ہمراہ چھپوا دیا کہ اگر کسی پرستار کو پرستش کی شدید خواہش بے چین کرنے لگے تو اس کے صبر کا امتحان نہ لیا جائے اور وہ سہولت کے ساتھ اپنے محبوب افسانہ نگار یا آئیڈیل شخصیت تک رسائی حاصل کر سکے۔ تصویر میں نے کچھ اس انداز میں اُتروائی کہ پوز بڑا قاتل قسم کا بنا۔ فوٹو گرافر سے کہا کہ وہ آنکھوں کو فوکس کرے۔ میں نے فوٹو اُترواتے ہوئے دنیا جہاں کی اُدا سی سمیٹ کر آنکھوں میں جمع کر لی تاکہ صنف نازک دیکھے تو وہ جذبہ ترم سے مغلوب ہو کر دوستی

کرنا کسی بھی صورت قابل تحسین فعل نہیں۔ چنانچہ بڑی یکسوئی سے اشعار موزوں کرنا شروع کر دیئے۔ جلد ہی میں نے ایک بات بڑی شدت سے محسوس کر لی کہ میرے شہر کے زیادہ تر شعراء ادب کو جس قدر اپنی نگارشات کا دودھ، لسی اور کھن کھلا کر پال پوس کے جوان کر سکتے تھے، کر چکے۔ اب وہ شخص پانی میں مدھانی چلا رہے ہیں بلکہ بقول ہمارے ایک مقامی محقق اور نقاد کے متذکرہ حضرات کافن آتش بازی کے چوہے یا شرکی کی مانند شرشر کر کے ان کی اپنی ہی ٹانگوں میں گھس کر بجھ چکا تھا۔ اب وہ جلی ہوئی آتش بازی میں نئے الفاظ کے فلیٹے لگا کر پھر سے چلانے کی لا حاصل جدوجہد میں مصروف تھے لیکن میں چونکہ ادبی دنیا میں کم سے کم وقت کے اندر ایک انقلاب برپا کرنے کا ارادہ کر چکا تھا اور شعری و شاعری کے میدان میں بہت سے قبضہ گروپ بہت پہلے سے برسرِ عمل تھے بلکہ ملک شعراء کے معاملے میں شروع سے ہی خود کفیل ہو چکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دور دراز بستیوں میں جہاں خط پڑھنے کے لیے بھی بمشکل ہی کوئی شخص موجود تھا وہاں بھی اپنے وقت کا کوئی نہ کوئی عظیم شاعر موجود پایا گیا۔ سو میں نے سوچا کہ اس طبقے کے بیشتر افراد پہلے ہی احساس محرومی کا شکار ہیں، لہذا اپنے مقابلے میں انہیں ان کی کم مانگی کا احساس دلا کر مزید پریشان نہ کروں۔ افسانہ نگاری کا میدان مارنے کی ایک اور بھی معروضی وجہ تھی کہ اپنی شعری نگارشات کے ساتھ جب بھی کسی مدیر کو شرف ملاقات بخشا تو بیشتر لرز کر رہ گئے اور معذرت خواہانہ اعزاز میں گویا ہوئے کہ وہ شاعری کی بھرمار کے باعث پہلے ہی اپنے منصب سے دست کش ہونے پر مجبور ہوئے بیٹھے ہیں لہذا معیاری نثر عنایت کی جائے تو وہ اپنے جرائد کی زینت بڑھانے میں بجا